

مشامیر اسلام

آنر

عباد اللہ اختر

ادارہ ثقافت اسلامیہ، گلبرگ روڈ، لاہور

مشائخ اسلام

DATA ENTERED

✓
۲۹۷۶۹۹۲

۱۳۱ م

۲-ک 27973

طبع اول ۱۹۵۸ء

مدرسہ دارالسیکرٹری نے ادارہ ثقافت اسلامیہ کے لئے
دین محمدی پریس سرکار روڈ ^{لاہور} میں چھپوا کر شائع کی۔

فہرست مضامین

صفحہ

عنوان

۱۱

حرف اول

۱۵

مسخ کی آمد ثانی

۶۳

سلمان قاری

۶۹

سید محمد جوہر پوری رحمت اللہ علیہ

۱۲۱

ہمال

۱۳۳

سلطان محمود غزنوی

۱۳۶

صوالحمود

۱۳۸

خراج عقیدت

۳۵۵

۳۶۰

چند تاریخی حقائق

صفحہ

۱۵۳

۱۵۵

۱۵۹

۱۶۰

۱۶۰

۱۶۵

۱۷۳

۱۷۳

۱۸۵

۱۹۷

۲۰۳

۲۱۷

۲۲۷

۲۳۵

۲۳۷

۲۵۳

۲۵۵

۲۶۳

عنوان

راجگان خاندان بجاٹہ

ابو قاسم سلطان محمود غزنوی

نورستان

فتح نورد و قیرات

تسخیر دے و ہمدان و اصفہان

مسلمہ چھوت

ابوالفتح واؤد نصر قرمطی

سومنا تھ

فردوسی طوسی

الودیعان محمد بن احمد البیرونی

ابوالنجم ایاز بن ایماق

بوعلی سیناخواجہ شمس الدین محمد حافظ شیرازی

حاک مصلی

سوانح حیات حافظ

شاہ ابوالسحاق

دین محمد

صفحہ	عنوان
۲۶۹	شاہ شجاع
۲۸۰	سلطان زین العابدین
۲۸۳	شاہ کجا
۲۸۶	شاہ منصور
۲۹۲	غیاث الدین سلطان بنگال
۲۹۶	سلطان قطب الدین تہمن بن توران شاہ بہرمرز
۲۹۸	امیر تیمور گودمانی
۳۰۳	خواجہ حافظ اودہ بمصر و وزراء
۳۰۴	خواجہ عماد الدین محمود
۳۰۵	حاجی خواجہ قوم الدین حسن
۳۰۸	ابو نصر خواجہ فتح اللہ برہان الدین ابوالمعالی
۳۰۹	قوام الدین محمد
۳۱۲	خواجہ جلال الدین توران شاہ
۳۱۸	بمصر شعراء
۳۲۰	سعدی
۳۳۴	سلطان ساؤجی
۳۳۶	عماد فقیر کرمانی
۳۴۲	مولانا شیخ ابواسحاق شیرازی
۳۴۵	علی دناکانی
۳۵۱	شیخ امین الدین محمد
۳۵۲	سید کمال الدین ابو الوفا
۳۵۳	شیخ زین الدین ہادی
۳۵۵	خواجہ حافظ کاظم و فضل
۳۶۰	لسان الغیب

خواجہ حافظ کا مذہب

امام محمد غزالی

مدس نظامیہ

نظامیہ اصفہان

نظامیہ نیشاپور

نظامیہ بغداد

مدسین نظامیہ بغداد

بمعصر حکماء و مشائخ صوفیہ

بمعصر شعراء فارسی

بمعصر سلاطین و وزراء و امراء

بمعصر خلفاء عباسیہ

بمعصر خلفاء و ساطیہ

بمعصر سلاطین غزنویہ

سلاطین خانیہ ماورالنہر

بمعصر سلوٹی کرمانی

عہد امام محمد غزالی

فلسفہ

امام صاحب کے مخالف حکماء و علماء

امام صاحب کے شاگردان و شہید

المنقذ من الضلال

مولفانست غزالی

۳۶۳

۳۶۲

۳۸۰

۳۶۳

۳۸۶

۳۸۶

۳۸۹

۳۹۰

۳۹۳

۳۹۴

۳۹۵

۳۹۶

۳۹۷

۳۹۸

۳۹۹

۴۰۰

۴۰۱

۴۰۲

۴۰۳

۴۰۴

۴۰۵

سید محمد امجد علی جوپوری

(مہدیویت اور مہربان مہدیویت و مجال دیاجوج و باجوج کی جامع تاریخ)

حرف مطلب

کارلائل انگلستان کا مشہور مفکر اور ادیب تھا۔ اس نے ایک کتاب
 'HERO AND HERO WER SHIP' لکھی اس میں ہیرو بحیثیت بنی کا انتخاب اس نے آنحضرت کا کیا۔ اور آنحضرت
 کے دعویٰ رسالت کی تصدیق بھی کی۔ وہ کہتا ہے کہ آنحضرت سے پیشتر
 جتنے ہیرو گندے ہیں لوگوں نے دیوتا اور افتاد سمجھ کر ان کی پوجا کی لیکن آنحضرت
 کی پہلی شخصیت ہے، جس نے واشگاف لفظوں میں کہا کہ 'انما انا بشر مثکم'
 کہ میں تمہارے ہی جیسا ایک بشر ہوں اور بس۔ یہ پہلی شخصیت ہے
 جس نے اپنے آپ کو بحیثیت بشر پیش کیا۔ اب آئندہ کسی ہیرو کو کوئی
 الوہیت کا درجہ نہیں دے گا۔ بلکہ یہ امر بھی مشتبہ ہے کہ جن کو الوہیت
 کا درجہ دیا گیا کیاتی الواقع اس کے معاصرین اس کو خدا یا خدا زادہ سمجھتے تھے
 یا بہت عرصہ بعد صرف عقیدہ تمسوں نے اس کو الوہیت کا درجہ دیا۔
 کارلائل نے بات تو موجدوں کی کہی ہے کہ تو حید بلا مشابہہ شرک اسی
 صورت میں متصور ہو سکتی ہے کہ اللہ کے سوا ہر ایک شے کو مخلوق

اللہ کے بندے یقین کیا جائے اور جس شخصیت نے "انما انا بشر مثکم" کا اعلان کیا اس کے متبعین اہل اسلام میں سے لاکھوں ہر ایک زمانہ میں اپنے اپنے ائمہ دین کو یا تو الوہیت کا درجہ دیتے رہے یا ان کو بھی تک ہی و قدیم یقین کرتے ہیں یا کم از کم اس کے نام سے وابستہ ہیں کارلائل کو اس کا علم نہ تھا۔ اور اگر کوئی اسے بتاتا کہ مسلمانوں میں بے شمار فرقے ہیں اور ہم ایک فطرۃ اپنے ائمہ دین کے نام سے وابستہ ہے تو شاید وہ اس کی امداد دہل کر تا لیکن اگر کوئی یہ بتاتا کہ وہ آنحضرت کے بعد ائمہ دین کو الوہیت کا درجہ بھی دیتے ہیں تو کبھی یقین نہ کرتا اور یہی کہتا کہ یہ متعصب مسیحی پادریوں کی اختراع ہے اس نے مسیحی پادریوں کی یادہ گلی کا جواب بھی دیا ہے وہ آنحضرت کی نسبت اختراع کرتے ہیں۔

مسیحی مسیح کو خدا اور خدا زادہ کہیں، اصنام پرست اپنے رشتیوں اور فیول کو دیوتا کہیں اور ان کی پوجا کریں لیکن آنحضرت پر ایمان لانے والے بھی اگر یہی دوشس اختیار کریں تو

گر مسلمانی ہمیں است کہ حافظ داود ملے گرا از پس امروز بود فریادی
امرواقعہ میں ہے کہ عالم السانی کی اکثریت ابھی تک "لقد خلفنا الانبیاء
فی احسن تقویہ" اور لقد کر منابینا اکرہ و عملہم

فی البر والجر وازتنہم سے بکشناس نہیں ہوئی ابھی تک اسے اس حقیقت کا علم نہیں کہ اس ارشاد الہی کا کیا مفہوم
کہ وہ ابھی تک اپنے اعلیٰ

مرتبہ سے واقف نہیں ہولے کائنات میں فطرۃ حاصل ہے۔

انسان کہ فلک ہاست مہر افگندہ او ہدیرت اولم است دائمہ او
 دار و خا صیتے کہ در خارج زد ہن ہر چیز کہ افسردہ شد بندہ او
 امر واقعہ یہ ہے اور تاریخی واقعات اور ہمارا اپنا مشاہدہ اس کی تائید میں
 ہے کہ "انما انا بشر مثلکم" کو لوگ کچھ وقعت نہیں دیتے، مسیح کی نسبت
 کہتے کہ دیکھو یہ ہے رسول شرابی اور بھی لوگ آنحضرت پر پھلتی جھانکے کہ "یہ کیسا
 رسول ہے کہ کیا تاپتا اور بازاروں میں جو نیاں چٹھاتا پھرتا ہے، مناسب تو
 یہ تھا کہ اس کے ساتھ کوئی فرشتہ ہوتا جو ہمیں ڈاتا دھمکاتا لپت ذہنیت
 "انما انا بشر مثلکم" پر ایمان نہیں لائی۔ لیکن اگر کوئی مدعی الوہیت ہو تو اس کے
 گرد پروانہ دار جمع ہو جاتی ہے اگر لوہو کس مسیح کو بحیثیت یلٹا پیش نہ کرتا
 تو مدعی اور یونانی کبھی ایمان نہ لاتے، اور آج بھی کسی ایسی شخصیت کا اتباع نہ
 کریں گے جو "انما بشر مثلکم" کی حیثیت سے سامنے آئے اگر وہ یہ کہے کہ
 مجھے خدا انت دلی ہے کہہ کر مخاطب کرتا ہے تو بلا چوں و چرا تسلیم کر لیں گے۔
 مدعیان الوہیت نے انسانی ذہنی کمزوری کا فائدہ اٹھایا اور بعض نے
 ذہنی حکومت اور اکثر نے دینی حکومت کا سکہ لوگوں کے دلوں پر جما دیا۔ انبیاء
 اور رسل تو لوگوں کو اللہ والے بنانے کے لیے مبعوث ہوئے انہوں نے
 بندگانِ خدا کو اپنا بندہ بنا کر چھوٹا۔ اور زیادہ تر حیرت اس بات پر
 ہے کہ مرکہ خاک میں مل گئے مگر ابھی تک ان کے ناموں کے پوجاری ہیں۔
 حقیقت یہ ہے کہ عبودیت اور عبدیت "نہ صرف الان بلکہ کائنات
 کی ہر ایک شے کی فطرت میں ودیعت ہے اور یہ اجتماع کا تقاضہ ہے
 کہ انسان اپنے حاجت روا کی بندگی کرے۔ اگر خالق کائنات رب العالمین کی
 بندگی نہ کرے گا تو ہر حال شجر و حجر کی پوجا کرے گا۔ اور اسی کمزوری

کا ۱۶۱۵ ہر ایک فرعون اٹھاتا رہا اور دعویٰ "انا ربکم الاعلیٰ" منواتا رہا۔

بیدل حصول رزق آمادہ بسر

سنگ چاکر سنگ ندرت و خربندہ تر

از مختصرات کارگاہ امکان

ایں سنگ شعور غیبت ہر ضلع بشر

جب تک علم انسانی ایک اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں لائے گا کسی نہ کسی رنگ

میں مخلوق کی پوجا ہی کرتا ہے گا۔ یہ دینی حکومت ہو یا دنیوی پست ذہنیت

اس کے سامنے بھکتی رہے گی، اللہ تعالیٰ کے بندے وہ ہیں ملاخوف

حکیم و لایم بخرون

مقبل اہم مسلمان

مسیح کی آمد ثانی

یہ محمد المہدی کے حالات اکثر تذکروں میں مفصل بیان کئے گئے ہیں۔ فرشتہ نے امد عبدالقادر بدایونی نے اپنی تاریخ منتخب التواریخ میں امد "مذکرہ علماء ہند" میں سید کے حالات ممکن تفصیل کے ساتھ قلم بند کئے ہیں۔ لیکن پیشتر اس کے کہ ہم ان حالات اور واقعات کو بیان کریں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ کرام کی واقفیت کے لیے تاریخ تہودیت بھی بیان کریں اور علم النفس کی طرف بھی توجہ دلائیں کہ کسی شخصیت سے عقیدت کیا کچھ کرشمہ دکھاتی ہے۔

قبل خانم یا پیمبر یا خلیا کعبہ است اصطلاح شوق بسیار است ومن دیوانہام
قیصر جولس نیز لود شاہ فرانس شارلمین کے مرنے کے بعد ایک مدت تک
لؤلؤ کو ان کی آمد ثانی کا انتظار رہا۔ امد مؤخر الذکر کی نسبت اب بھی مسیحی نعايات
سے پایا جاتا ہے کہ وہ زندہ ہے لہذا مسیح کی آمد ثانی کے وقت ظاہر ہوگا
مسیح کے ساتھ بل کر غیر مسیحی اقوام بالخصوص یہود کو قتل کرے گا۔ یہ تو عقیدت
کا کرشمہ ہے۔ لیکن انسان بھی عجب مخلوق مائع ہوا ہے۔ قیصر جولس کو اپنے

لامتد سے قتل کیا جب مر گیا تو اس کی پتھر کی موتی کی پوجا کی۔ کسی نے اسے
 آسمانی ستارہ میں جلوہ گر ہوتے دیکھا۔ وہ پٹیہ کے میدان جنگ میں وہ
 قاتلوں سے حسب وعدہ ملا۔ امد عوام تو اسے ہمیشہ زندہ ہی سمجھتے رہے۔
 کتنے اہل قلم علماء و حکماء شعراء گندے ہیں۔ جن کے افکار عالیہ صفوہ
 قوطاس پر اچکے ہیں۔ زندگی جس عسرت سے بسر کی ان کی اپنی تحریروں میں اس
 کا شکوہ و شکایت موجود ہے۔

فلک بروم سفد و بد نام مراد قابل دانش و فضل ہمیں گناہت بس
 جب موت نے ان کی دنیوی مصائب کا خاتمہ کر دیا تو ان کی قبریں نیارت گاہ
 عام بن گئی۔ ان کی برسی منائی جاتی ہے امد تذکروں میں ان کے علم و فضل بلکہ کرامات
 بیان کی جاتی ہیں۔

مسخ سے جو کچھ آپ کی اپنی قوم یہود نے سلوک کیا ماجیل میں مفصل
 مذکور ہے۔ آپ نے بہت چاہا کہ یہود شلم کو اس کی اہل تالی شان و عظمت میں
 دیکھیں، یہود شلم جو نبیوں کو قتل کرتے تھے امد رسولوں کو شکار کرتے تھے۔ کتنی بار
 چاہا کہ جس طرح مرغا اپنے بچوں کو پھل کے نیچے جمع کرتی ہے اسی طرح فرزندوں یہود شلم
 کی سرپرستی کریں۔ مگر اس نے نہ چاہا امد مقدس متی (۲۲) قوم نے آپ پر کفر و بغاوت
 کا الزام جاند کیا امد بعض عدالت میں پیش کیا۔ کوڑے لگائے۔ کسی نے دہرہ
 و چپہ سے امد کسی نے منہ پر تھوکنے سے دلیل کیا۔ امد آخر دار پر کچھ پایا
 جو اسی جو ہر وقت سایہ کی طرح ساتھ رہے آخر وقت پر فخر ہو گئے۔
 امد ایک نے تو بد ملا لعنت کی۔

یہی مسخ ہے جس کی نسبت مسیح دینا کا پختہ عقیدہ ہے بلکہ ملدا ایمان
 ہے۔ مسخ خدا کا اکوٹا بیٹا ہے اور زندہ ہے امد خدا کے دینے

یا تھپڑ بیٹھا ہے اور کسی وقت دوبارہ دنیا میں تشریف لائے گا۔ اس آمد ثانی
کا انتظار مسیحی دنیا کو ہمیشہ سے رہا ہے۔

آنحضرت فوت ہو گئے تو جو والہانہ عشق اصحاب رسول کریم کو آنحضرت
سے محظوظ اس کا بھی یہی تقاضہ تھا کہ حضرت عمر شمشیر بکف مسجد نبوی
میں یہ کہہ رہے تھے آنحضرت فوت نہیں ہوئے، اللہ سے ملنے
گئے ہیں اور ضرور واپس آئیں گے۔ جو شخص یہ کہے گا کہ آنحضرت فوت ہو
گئے، خدا کی قسم میں اس کا سر قلم کر دوں گا۔ ایک جو شش کے عالم میں آپ
قسم کیا کہ یہی فقرے دہرا رہے تھے کہ صدیق اکبر نہ آگئے اور آپ
کو مخاطب کر کے کہا کہ "ای قسم کمانے والے ذرا دم لے" اس کے بعد
منبر پر چڑھ کر تقریر کی کہ اے لوگو جان لو کہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات
ہی کی القیوم ہے، اور ہر ایک نفس کو موت کا ذائقہ شناس ہونا
ہے۔ پھر قرآن کی آیت پڑھی کہ محمدؐ تو ایک معزز رسول ہے اور
اس سے پیشتر کسی رسول گند چکے ہیں۔ اگلیہ مر جائے جو یقینی امر ہے
یا مارا جائے جو ممکن ہے، تو کیا تم اسلام دین اللہ سے الٹے پاؤں
پھر جاؤ گے اور جو بھی رو گرداں ہوا وہ دین اللہ کا تو کچھ بگاڑ نہیں سکتا
اور اللہ نیک گزار بندوں کو جلدی ہی مناسب اجر عطا فرمائے گا۔
جو محمدؐ کی بشری شخصیت کے پوجاری ہیں سمجھ لیں کہ آپ فوت ہو گئے
اللہ ہی کی القیوم ہے،

حضرت عمرؓ کا اپنا بیان ہے کہ صدیق اکبر کی تقریر کا یہ اثر ہوا
کہ میرے سوا سب بجا ہوئے گویا آنکھوں کے سامنے پردہ آگیا تھا جو اٹھ
گیا۔ اس طرح صدیق اکبرؓ نے مسلمانوں کو فتنہ آمد ثانی سے بچا لیا۔

سوال یہ ہے کہ مسیحی عقیدہ کی تائید مسلمان عموماً کیوں کرتے ہیں اور یقین کرتے ہیں کہ آپ ضرور زندہ ہیں اور دوبارہ تشریف لائیں گے۔ نہ صرف مسیح بلکہ ان کے ساتھ ایک اور شخصیت کا بھی ظہور ہو گا۔ جو اہم مہدی ہے اور دونوں عیسے اور مہدی مل کر کفار بالخصوص یہود کا قلع قمع کریں گے۔ مختصر جواب یہ ہے کہ ان کا مذکور احادیث میں ہے جو آنحضرت سے منسوب ہیں۔

بعض علماء اسلام نے ان احادیث کو ضعیف بلحاظ روایت اور موضوع بلحاظ روایت قرار دے کر مسیح و مہدی کی آمد ثانی کا انکار کر دیا۔ یہ دلیل کہنا ہے کہ

یا ذامن مسیح و مہدی ایں جا از تجربہ مزاج اعیان ہوتا

لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اکثریت کا عقیدہ دوبارہ آمد ثانی بدستور ہے۔ ہمیں اس سے بحث نہیں کہ یہ عقیدہ صحیح ہے یا غلط مورخ ایسی الجھن میں نہ خود الجھتے ہیں اور نہ کسی کو الجھاتے ہیں، وہ حالات اور واقعات معرا بیان کرتے ہیں۔ نتیجہ قارئین خود جو کچھ پسند ہو نکال سکتے ہیں۔

مسیحی دنیا کو تو مسیح کی آمد ثانی کا انتظار ہے۔ اور رہے گا، اکثر اقوام کے دیوتاؤں کی بھی یہی کیفیت ہے یعنی عموماً قوموں کو اپنے بزرگان دین کی آمد ثانی کا انتظار رہا ہے اور غالباً اب بھی ہے۔ اور اس میں تو کلام نہیں کہ مسلمان بھی مسیح و مہدی کے منتظر ہیں۔ اور یہ بھی تاریخی واقعہ ہے کہ کئی مسیح اور مہدی آئے ایک جم غفیر ان پر ایمان لایا جب یہ مر گئے یا مارے گئے تو یہ عقیدت کا کہ شہہ ہی سمجھنا چاہیے

کہ ان کے ایمان میں تزلزل واقع نہ ہوا۔ یہ کہہ کر بے قرار دلوں کو تسلی دی کہ مرے نہیں زندہ ہیں اور کسی مناسب وقت پر دوبارہ تشریف لائیں گے۔ معتقدیں ہوں یا منکرین۔ انتظار کی گھڑیاں سب بے صبری سے سے شمار کرتے ہیں۔ اگر ایک مدعی مہدویت مر گیا تو کیا ہوا، دوسرا اس کی جگہ کچھ عرصہ کے بعد کھڑا ہو جاتا اور لوگ اس کے گرد بھی پرواز دار جمع ہو جاتے اور من من دھن سب کچھ قرآن کر دیتے، اس طرح کچھ عرصہ ہٹ بونگ مچی رہتی۔ لیکن اس کے خاتمہ پر کچھ عرصہ سکون کے بعد لوگ بھول جاتے کہ جس مہدی کا انتظار تھا وہ آکر گذر گیا۔ منکرین تو یہ کہتے کہ وہ مہدی کا ذب تھا۔ اصلی مہدی آنے والا ہے۔ یہ بھی آتا اور گذر جاتا۔ اس کے منکرین بھی یہ کہتے کہ کا ذب تھا۔ بہر حال انتظار میں کچھ ایسی لذت ہے کہ یہ ہمیشہ باقی رہا اور آج تک ہے اور شاید بہت عرصہ اور بھی رہے، دعویٰ مہدویت اب بھی کشادہ ہے اور کشادہ ہی رہے گا۔ ہر کہ خواہد گو بیاد ہر کہ خواند گو بروہ ذیر بحث یہ امر نہیں کہ گذشتہ مدعیان مہدویت سچے تھے یا جھوٹے۔ واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں ہر ایک ایک نئے فرقہ کا بانی ہوا۔ ادران میں سے اب بھی اکثر دنیا و اسلام کے کسی نہ کسی حصہ میں موجود ہیں! یہ ایک مستقل موضوع ہے ان مدعیان مہدویت کا مفصل تذکرہ اس مختصر مقالہ میں نہیں ہو سکتا۔ ہم نے صرف ایک شخصیت کا انتخاب اس لیے کیا ہے کہ اس کے کارنامہ میں کچھ خصوصیات ہیں جو دوسرے مدعیان مہدویت میں نظر نہیں آتی۔ ان خصوصیات کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے پہلے مسرود مدعیان کے حالات کا بھی علم ہونا چاہیے

یہ ہم بالاختصار بیان کرتے ہیں،

پہلی صدی ہجری کے نصف آخری ایام میں "مہدی" کا تصور ایسا صاف صاف اور میزبان تھا جو دوسری صدی ہجری میں نمایاں ہوتا گیا۔ غالباً پہلی صدی ہجری میں "مہدی" کی اصطلاح بھی وضع نہ ہوئی تھی، چند پیش گوئیاں احادیث میں شائع ہو رہی تھیں جو جن کا مذکورہ "باب فتن" میں ہے جو مولفین صحاح ستہ نے باندھا، بخاری میں کوئی حدیث دوبارہ ظہور مہدی نہیں۔ لیکن باب فتن کے تحت چند پیش گوئیاں مذکور ہیں کہ خلافت راشدہ کے بعد فتنہ کا دروازہ کھل جائے گا اور یہ اور وہ واقعہ ظہور میں آئے گا۔

اس وقت اموی حکومت تمام دنیا اسلام پر مسلط تھی۔ اور حریت قبیلہ بنو ہاشم مسلسل جدوجہد کے ساتھ اس کا تختہ حکومت الٹنے میں لگا ہوا تھا۔ یہ خفیہ سازشیں تھیں اور ان کا جال ملک کے طول و عرض حجاز اور عراق اور ایران میں بنو ہاشم کے داعیوں نے بچھا رکھا تھا۔ امیر معاویہ کے بعد یزید اور یزید کے بعد اس کا بیٹا معاویہ ثانی تخت خلافت پر بیٹھا مگر تین ماہ کے بعد دست بردار ہو گیا اعیان سلطنت کو جمع کر کے کہا کہ مجھے حکومت سے مفرد ہی سمجھو، میں چاہتا تھا کہ سنت عمر پر عمل کروں مگر آج ایسے چھ آدمی بھی نظر نہیں آتے، اس لیے میں اب تمہیں ارباب شوریٰ مقرر کرتا ہوں جس کو چاہو خلیفہ منتخب کر لو۔ معاویہ کو گوشہ نشین ہو گیا اور ادھر ارباب شوریٰ اس ادھیڑ میں لگے کہ کس کے ہاتھ میں عنان خلافت دیں۔ ادھر عبداللہ بن زبیر نے ارض حجاز میں اور آپ کے بھائی مصعب نے

بصرہ میں، خراسان میں عبداللہ بن حازم نے مختار ثقفی نے کوفہ میں علم بغاوت بلند کر دیا۔ نافع بن ارقم امیر خوارج نے بھی سر اٹھایا۔ نظام حکومت کا شیرازہ بکھر کر رہ گیا۔ اور ملک کے طویل و عرص میں عام یا نظمی شائع ہو گئی۔ خلافتِ راشدہ نے قیصر و کسریٰ کی حکومت میں کچھ مدت باقی نہ چھوڑی تھی کسی کی مملکت پر تو مسلمان قابض ہو چکے تھے اور قیصر کو بھی اپنی خانہ جنگی سے فرصت نہ تھی اگر یہ دو حکومتیں کچھ طاقتور ہوتیں تو دنیا و اسلام کی خانہ جنگی سے فائدہ خاطر خواہ اٹھا سکتی تھیں اور غالباً عرب کی تباہی کے ساتھ اسلام بھی ختم ہو جاتا۔

اہل شام اور مصر نے مردان بن حکم کو خلیفہ منتخب کیا جو مردان اول کے نام سے مشہور ہے چند سال تک ہنگامہ کارزار مختلف مقامات پر گرم رہا نیک نیت معاویہ ثانی کی ایک سیاسی غلطی کا خمیازہ نسیم دنیا و اسلام کو بھگتنا پڑا۔ اور ہزاروں مسلمانوں کا خون پالی کی طرح بہ گیا۔ آخر بنو امیہ ہی کے حق میں برہانِ تا طح یعنی تلوار نے فیصلہ کر دیا۔

یہ ہیں واقعات، ہر ایک فریق کے داعیوں نے۔ چند پیش گوئیاں شائع کیں جو آنحضرت سے منسوب کی جاتی، مختار ثقفی چاہتا تھا کہ اس بد نظمی کے زمانہ میں اپنی خود مختار حکومت کوفہ کو مستقر بنا کر قائم کرے۔ لیکن وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ قریش کے سامنے اس کی حال نہ گلے گی۔ اس لیے اسے بنو ہاشم میں ایسے شخص کی تلاش تھی جس کا اثر و رسوخ اس کا آلہ کار بن سکے۔ امام زین العابدین اس وقت مدینہ میں تھے ان کے پاس گیا اور کہا کہ حالات اتنے سازگار ہیں کہ اگر آپ خروج کریں تو تمام عرب آپ کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو جائے گا۔ امام صاحب نے

صاف انکار کر دیا بلکہ اہل مدینہ کو مسجد نبوی میں جمع کر کے فیصلہ دیا کہ یہ
مختار انتہائی فتنہ پرداز شخص ہے اس لیے اس کے شر سے بچو۔ یہاں
سے مایوس ہو کر مختار عبداللہ بن زبیرؓ سے ملا اور یہی دعوت خلافت
دی۔ عبداللہ بن زبیرؓ عرصہ سے اس کا ارادہ کر چکے تھے۔ مختار کی
پیشکش قبول کر لی۔ مختار نے یقین دلایا کہ کو فیوں کی مدد سے میں شام
پر حملہ کروں گا۔ کوفہ میں آیا اور لوگوں کو بڑھایا۔ اور ساتھ ہی خزانہ کا منہ
کھول دیا۔ عبداللہ بن زبیرؓ کے بھائی مصعب نے بھائی کو قتل بھی کیا
مختار کی نیت بخیر نہیں وہ آپ کے نام پر لوگوں کو گرویدہ بنا رہا ہے
جب عبداللہ بن زبیرؓ نے جواب طلب کیا تو مختار نے دیکھا کہ ابن زبیرؓ
کے لیے ڈھب کا آدمی نہیں اس لیے محمد بن علیؓ بن ابی طالب المعروف
ابن الحنفیہ کی طرف رجوع کیا۔ اور لوگوں میں یہ مشہور کیا کہ اس میں کچھ
کلام نہیں کہ خلافت کا حق بنو فاطمہ کا تھا مگر وہ خود ہی دست بردار
ہو گئے اور علی بن حسینؓ اس کا اہل بھی نہیں اس لیے اولاد علیؓ میں
سے محمد ابن الحنفیہ کو امام وقت اور خلیفہ برحق سمجھا اس لیے بھی کہ
آنحضرتؐ نے حضرت علیؓ کو ایک فرزند کی بشارت دی کہ اس کا نام میرا
نام اور اس کی کنیت ابوالقاسم مری کنیت ہوگی۔ میری امت میں
سے کسی اور کے لیے جائز نہیں میری کنیت اختیار کرے۔ اسی ایک
کے لیے یہ خاص اجازت ہے۔ چنانچہ جب محمد بن الحنفیہ خولہ بن جعفر
کے بطن سے پیدا ہوا تو کنیت ابوالقاسم سے مشہور ہوا۔ یہ بہت
بڑا عالم دین تھا اور زہد و تقویٰ میں کسی سے کم نہ تھا۔ "شديد القوة"
ایسا تھا کہ اس کے بارہ میں بہت عجیب و غریب حکایات مشہور

۹
۷
۶
۳

ہیں۔ (دقیات الاعیان از ابن خلکان)
 یہ تو معلوم نہیں کہ محمد بن الحنفیہ نے خود کبھی دعویٰ خلافت کیا یا
 کسی لڑائی میں شریک ہوا۔ مگر مختار ثقفی کو پہلے عبد اللہ بن زبیرؓ اور
 آپ کے بھائی سے سابقہ پڑا۔ مختار لڑائی میں مارا گیا۔ محمد بن الحنفیہ
 کی وفات یا حیات کے بارہ میں اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ مدینہ
 میں فوت ہوا اور جنت البقیع میں دفن ہوا۔ بعض کہتے ہیں کہ طائف
 کی طرف گیا ابن زبیرؓ سے لڑا اور وہیں فوت ہوا۔ بعض کہتے ہیں کہ
 "اید" میں رحلت کی مگر ایک فرقہ کا عقیدہ یہ ہے کہ آپ فوت
 نہیں ہوئے۔ "جبل رضوی" میں غائب ہو گئے۔ اور کسی وقت خراج
 فرمائیں گے۔ یہ فرقہ مختار یہ یا کیانیہ کے نام سے مشہور ہے۔ ابن خلکان
 کہتا ہے کیانی مختار ہی کا لقب ہے۔ اس فرقہ کے شعرا سید حمیدی اور کثیر
 نے محمد بن الحنفیہ کے مناقب میں بہت اشعار لکھے ہیں جن کو سعودی مروج
 الذہب اور ابن خلکان دقیات میں نقل کرتا ہے کثیر کہتا ہے کہ

الان الائمة من قریش
 ولا الحق اربعة سوا
 علی والثلاثة من بنیہ
 لهم الاسباط ليس لهم خفاء
 فسبط سبط ايمان وبت
 وسبط غيبة كربلاء
 وسبط لا تراہ العين حتی
 يعود الخیل يتبعها الواء

سن رکھو اہم تو قریش ہی سے ہیں
 مگر دوست داناں حتی چار اخصاص ہیں
 ایک تو علی اور اس کے بیٹوں میں سون
 اس میں کوئی چھپی بات نہیں ہے
 ان میں سے ایک صاحب ایمان اور
 نیکو کا ہے اور دوسرا کربلا میں مدفون ہے
 وہ ہمیشہ فوت نہ ہوگا جب تک
 لشکر کے ساتھ پرچم لہراتا ہوا خروج نہ کرے

یغیب لایری فیہم نہ ملنا
 اس عرصہ تک رعنوی میں پوشیدہ ہے
 اسے کوئی نہیں دیکھ سکتا اس کے پاس
 شہد اور پالی کی نہیں ہیں۔

فرق مختاریر کا محمد بن حنفیہ کے بارہ میں یہ عقیدہ پختہ تھا کہ آپ
 دشمنان دین کے خوف سے روپوش ہیں اور کسی مناسب وقت پر
 ظاہر ہوں گے، اس لئے "امامت" کی اب میں صورتیں پیدا ہو گئیں، ایک
 امام ظاہر، دوسرا امام غائب اور تیسرا امام منتظر، بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے
 کہ تینوں صورتیں ایک ہی شخصیت کی ہیں۔ امام محمد بن حنفیہ امام ظاہر بھی تھے
 اور روپوش ہوئے تو امام غائب بھی ہیں اہل آپ کی آمد ثانی کا انتظار
 بھی ہے اس لیے امام منتظر بھی ہیں۔ چونکہ اس موضوع کا تعلق آمد ثانی
 اور جہودیت سے بہت گہرا ہے اس لیے مناسب مقام پر ہم عقاید
 دوبارہ امامت پر مزید بحث کریں گے۔

مختار مارا گیا لیکن جو عقاید وہ اپنے متبعین کے ذہن میں راسخ کر
 چکا تھا اس نے ایک مستقل فرقہ کی صورت اختیار کر لی۔ امام محمد بن حنفیہ
 امام غائب اور منتظر ہے مگر جب اس شکل کا احساس ہوا کہ "غیبت" اور
 "انتظار" سے تو کام نہیں چل سکتا۔ امام غائب کا کوئی قائم مقام خواہ
 عارضی ہو ضرور ہوتا چاہئے جس کا تعلق براہ راست امام غائب
 سے ہو اور جس کے ذریعہ معتقدین کو امام غائب کے احکام اور ہدایات
 ملتی رہیں تو "کیا" کی اصطلاح بھی وضع ہوئی دو صدی بعد "امامت" نے
 ایک علم کی صورت اختیار کر لی اور اس پر بہت کچھ لکھا گیا۔
 فرقہ مختاریر خوب پھولا پھلا اور اس شجر کی کسی شاخیں یعنی فرقہ در فرقہ

پیدا ہوتے گئے سان کے عقائد میں حلول و تانسخ نے یہی جگہ لے لی۔ امام محمد بن
 حنفیہ کے بعد فرقہ مختار یہ کی ایک جماعت کا رجوع آپ کے بیٹے ابی ہاشم کی
 طرف ہوا۔ یہ فرقہ اشمیہ کہلایا۔ یہ بھی ابی ہاشم کی وفات کے بعد پانچ فرقوں میں
 تقسیم ہو گیا۔ ان میں سے ایک فرقہ "سیر" سے موسوم ہے جو عبداللہ بن عمرو
 بن حوب کنڈی سے منسوب ہے۔ اس فرقہ کا یہ عقیدہ ہے کہ ابی ہاشم
 نے وصیت عبداللہ بن عمرو کے حق میں کی۔ صرف امامت ہی نہیں بلکہ ابی ہاشم
 کی روح نے عبداللہ بن حلول کی شہرستانی اپنی کتاب الملل والنحل میں کہتا ہے کہ۔
 "عبداللہ تانسخ کا مالک تھا اس کا دعویٰ یہ تھا کہ روح اللہ علیہ دوبارہ دنیا
 میں تشریف لائیں گے اور آپ کی روح کا حلول مجھ میں ہوا ہے۔ اس لیے
 دعویٰ نبوت بحیثیت مہمل مہرج اور ابوہبیت بلحاظ روح اللہ کیا۔
 فرقہ "سیر" کا زور عراق میں رہا، مگر عبداللہ خراساں میں مارا گیا تو اس
 کے متبعین میں یہ تفرقہ رونما ہوا۔ بعض کہتے ہیں کہ زندہ ہے اور دوبارہ آئے
 گا، دوسرا کہتا کہ فوت ہو گیا مگر اسکی روح اسحاق بن زید بن حادث الصالی
 میں منتقل ہو گیا اس فرقہ کو حارمیر کہتے ہیں۔
 ان فرقوں اور ان کے عقاید پر اگر لکھا جائے تو ایک دفتر درکار ہے
 مختصر یہ کہ ان میں سے ہر ایک فرقہ اپنے امام کی آمد ثانی کا منتظر رہا۔ اور
 اگر یہ تسلیم کر لیا کہ وہ فوت ہو چکا ہے تو اس کی روح تو زندہ ہے وہ
 جس شخص میں منتقل ہوئی یا جس نے حلول و اتحاد کا دعویٰ کیا وہ امام تسلیم کیا
 گیا ہے۔ حضرت علی کی اولاد ایک تو بنو فاطمہ ہے اور یہ ہاشمی ہیں۔ لہذا دوسری
 اولاد علوی کہلائی، ہاشمیوں کے ہاتھ سے امامت نکلی تو علوی قابض ہوئے
 اور ان کے ہاتھ سے گئی تو غیر علوی قابض ہو گئے۔ چنانچہ ایسے امام بہت

ہوئے مگر ہمیں تذکرہ صرف ان حضرات کا مطلوب ہے جو کم از کم قریش
تھے۔

عبداللہ بن زبیر بن عوام بن اسد کا مورث عبدالعزیز بن کلاب
بن مرہ، عبدمناف کا بھائی تھا اور عبدمناف کے دو بیٹے عبدشمس اور
ہاشم تھے، عبدشمس خاندان امید کا مورث ہے۔ حضرت زبیرؓ حضرت
کی پھوپھی کے بیٹے تھے اور صدیق اکبر کی دختر اُسما کے شوہر تھے جن
کے بطن سے عبداللہ پیدا ہوئے۔ یہ پہلا مولود ہے جو مکہ سے مدینہ میں
ہجرت کے بعد پیدا ہوا۔ آپ کی ولادت پر مسلمانوں نے خوشی کا اظہار کیا
اس لیے کہ یہود کہتے تھے کہ مسلمان عورتوں کے رحم بند ہیں حضرت زبیر
عشرہ بشرہ میں سے بھی ہیں۔

ہم لکھ چکے ہیں کہ جب معاویہ ثانی تخت سے دست بردار ہو گیا تو
عبداللہ بن زبیر نے ارض حجاز میں دعویٰ خلافت کیا۔ آپ کی مدد
آپ کے بھائی مصعب نے کی۔ مختار مصعب کے مقابلہ میں مارا گیا تو
عبداللہ بن زبیر نے مکہ کے قبضہ میں عراق کا اکثر حصہ بھی آیا۔ اہل شام
اور مصر نے جب مروان اول کو خلیفہ منتخب کیا تو ابن زبیر سے لڑائی ناگزیر
امر تھا۔ ان امام میں عبداللہ کی حکومت کو تقویت دینے کے لئے چند
اعادیت شائع ہو رہی تھیں کہ شام سے ایک فوج مکہ پر حملہ کے لیے
آئے گی۔ مکہ اس وقت عبداللہ بن زبیر کا دارالحکومت تھا۔ شامی فوج
مدینہ اور مکہ کے درمیان مقام "مراہق" پر زمین میں دھنس جائے گی۔ مکہ
کا خزانہ ختم کیا جائے گا اور امیر المؤمنین مسلمانوں کو مالا مال
کر دیں گے۔ اور "رکن" اور "مقام" کے درمیان لوگ آپ کے دستِ حق

پرست پر بیعت کریں گے۔ ان میں سے آخری حصہ پیش گوئی تو عبداللہ بن
 زبیرؓ کے حق میں پورا ہوا۔ آپ نے "وکن" اور مقام کے درمیان بیعت المال
 اور خزانہ بھی اپنے متبعین میں فراخ دلی سے تقسیم کیا۔ مگر پہلا حصہ پورا نہ
 ہوا۔ شامی فوج نے مکہ کو محاصرہ میں لے لیا اور عبداللہ بن زبیرؓ یہاں
 لڑتے ہوئے کام آئے۔

یہاں تک تو پہلی صدی ہجری کے اواخر کے واقعات ہیں۔ اب ہم
 دوسری صدی ہجری میں داخل ہوتے ہیں۔ لیکن ان واقعات کو اچھی طرح سمجھنے
 کے لیے ہاشمی دعویٰ داران خلافت و امامت و جہد و بیت کی قرابت حضرت علیؓ
 سے ذیل کے شجرہ نسب کو پیش نظر رکھنے سے واضح ہو جائے گی۔ اور
 اسی قرابت پر ان کے دعویٰ مبنی تھے،

بنو ہاشم کے دو قبائل بنو فاطمہ اور بنو عباس کی متحدہ کوشش سے ایک صدی کے بعد بنو امیہ کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ اب بنو فاطمہ اور بنو عباس میں مسئلہ خلافت تنازعہ کا موضوع بن گیا۔ عبداللہ السفاح عباسی نے نو چند سال بنو امیہ کے خون سے ہاتھ رنگین کرنے میں بسر کر دیے۔ یہ قوت ہوا تو اس کا بھائی منصور تخت خلافت پر متمکن ہو گیا۔ بنو عباس کا ایک داعی ابو مسلم خراسانی تھا جس کا سلسلہ نسب حکیم بوزنہ جمہر ایرانی وزیر نوشیروان سے ملتا ہے، اس نے بنو عباس کا ساتھ اسی نیت و ارادہ سے دیا جس کے ساتھ مختار نے پہلے عبداللہ بن زبیر رحمہ اور بعد ازاں محمد ابن الحنفیہ کا دیا تھا۔ ابو مسلم یہ چاہتا تھا کہ قریش کی خانہ جنگی کا فائدہ اٹھا کر پھر ایرانی حکومت اور مذہب قائم کر دے۔ مگر تخت کہاں خالی تھا۔ اس لیے اس نے بنو عباس کو آواز دینا چاہا۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ اس کی کوشش سے بنو امیہ کی حکومت جو خالص عرب حکومت تھی شام میں ختم ہو گئی۔

حریف قبیلہ بنو فاطمہ کا ایک داعی مغیرہ بن سعید عجمی تھا۔ طبری اور ابن حزم نے اس کی سرگرمی کا تذکرہ لکھا ہے کہ اسی نے اعلان کیا کہ محمد المصعب النفس الذکیہ مہدی موعود ہے جس کی نسبت آنحضرت کی پیش گوئی ہے کہ اس کا نام میرا نام اور اس کے والد کا نام میرے والد کا نام ہوگا۔ مغیرہ کو خالد بن عبداللہ قسری نے جو اموی حکومت کی طرف سے والی عراق تھا ۱۱۹ھ میں بغاوت کے جرم میں قتل کیا۔ مگر مغیرہ کی کوشش سے اکثر اہل عراق بنو فاطمہ کے حق میں علم بغاوت بلند کرنے پر تیار ہو گئے اس وقت تک خود محمد النفس الذکیہ نے خود دعویٰ مجددیت کیا تھا اور

نہ خروج کیا۔ میغرہ یہی کہتا رہا کہ امام برحق کا ظہور وقت مقررہ پر ہو گا اور وہ لکن اور مقام کے درمیان لوگوں سے بیعت لے گا۔ اگرچہ یہ پیش گوئی عبداللہ بن زبیر نے کے حق میں پوری ہو چکی تھی مگر وہ امام برحق نہ تھا اس لیے کامیاب نہ ہوا۔ میغرہ تو مارا گیا مگر فرقہ میغرہ کی بنیاد رکھ گیا۔ جس نے محمد النفس الذکیہ کے خروج کے وقت آپ کا ساتھ دیا۔ چونکہ عوام کو بنو فاطمہ سے خاص عقیدت تھی اس لیے جب النفس الذکیہ نے دعویٰ خلافت کیا تو ائمہ دین نے بھی تائید کی۔

منصور عباسی تخت پر نشان ہوا، ایک تو ابھی خلافت عباسیہ کو استقلال حاصل نہ ہوا تھا۔ دوسرے عمام بنو فاطمہ کے حامی تھے اس نے کوشش کی کہ النفس الذکیہ کو میدان جنگ میں نہیں سیاسی چال سے شکست دے۔ محمد کو ایک خط لکھا کہ اگر اطاعت کرو تو تمہیں اور تمہارے کل خاندان کے افراد اور متبعین کو امان دیتا ہوں اور تمہاری اور ان سب کی حفاظت جان و مال کا ذمہ لیتا ہوں۔ ایک لاکھ درہم بطور وظیفہ بھی بھی تندر ہے اور جہاں خواہش ہو رہو میری طرف سے اجازت ہے۔ ابن خلدون نے یہ نامہ و پیام جو دو حریف دعویٰ داراں خلافت میں جاری رہا قلم بند کیا ہے۔ محمد النفس الذکیہ نے منصور کی پیش کش کا جواب دیا کہ "تم فرعون ہو اور تمہارے مطیع آل فرعون ہیں۔ ہم بنی اسرائیل کے شاہیہ ہیں جن پر تم نے فرعونوں کی طرح طرح کی ظلم کیے۔ حالانکہ خلافت ہمارا حق ہے اور تم ہمارے سبب اس کے مدعی بنے اور تمہاری کامیابی ہمارے ہی باعث ہوئی، لوگوں نے سمجھا کہ تم ہماری امداد کر رہے ہو اس لیے تمہارا ساتھ دیا۔ تم نے تقویت حاصل کر کے ہمارا حق غصب کر لیا

تم مطلق تھے اب مختار بن بیہیٹے۔

” ہمارا باپ علی وصی اور امام ہے محمد النفس الذکیہ حضرت امام حسن بن علی رضی اللہ عنہما کی تیسری پشت میں ہے کسی کا سلسلہ قرابت ایسا نہیں جیسا کہ ہمارا سلبتیت اور فضل کا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں تم پر شرف دیا ہے اور برگزیدہ بنایا ہے، نبیوں میں ہمارے والد محمد سب سے افضل ہیں اور سلف میں علی رضی اللہ عنہ سب سے پہلے اسلام لائے۔ ازواج میں خدیجہ ظاہرہ ہیں جنہوں نے سب سے اول قبلہ روح نماز پڑھی اور لڑکیوں میں بہتر و خیراں رسول اللہ ہیں اور ان میں فاطمہ سعیدۃ النساء عالمین ہیں۔

دین اسلام میں حسن و حسین جو اتان خبثت کے سردار ہیں۔ میں باعتبار نسب بہترین بنی ہاشم ہوں مجھ میں کسی عجمی کا میل نہیں۔ اور تمہی میں کنیزک زادہ ہوں اور تمہارے سلسلہ نسب میں یہ عیب ہے۔ شروع سے میرے آباد اجداد اور اہبات متاثر چلے آئے ہیں، میں اس کا بیٹا ہوں جس کا مرتبہ سب سے اعلیٰ و ارفع ہے (حضرت) میں اس کا فرزند ہوں جس کو دوزخ میں کھڑے عذاب ہوگا (ابوطالب)۔

” میں اللہ تعالیٰ کو ضامن دے کر تمہیں امان دیتا ہوں بشرط اطاعت اور میں تم سے زیادہ مستحق خلافت ہوں اور عہد کو پورا کرنے والا ہوں تم مجھ سے پہلے بھی لوگوں کو امان دے چکے ہو ان لوگوں میں سے تم مجھے کس کی امان دیتے ہو، ابن عبیدہ یا عبد اللہ بن علی یا ابو مسلم خراسانی کی۔“

خط کے آخری فقرہ میں النفس الذکیہ نے طنزاً اشارہ منصور کی بدعہدگی کی طرف کیا کہ ان لوگوں کو تم نے فریب سے قتل کیا۔ ابو مسلم خراسانی کے ارادوں کا جب حال منصور کو معلوم ہوا تو خام کی حکومت پیش کی۔ مگر خراسانی تارک گیا

کہ منصور اس کے اثر و رسوخ کو جو اس کا اہل خراساں پر تھا زائل کرنا چاہتا
 ہے۔ اور اہل خراساں اس کے اپنے بھائی ہی تھے۔ منصور نے کہا بھیجا
 کہ خراساں کی حکومت بھی تمہاری ہے۔ یہاں اپنا کوئی نائب معتمد مقرر کرو۔
 شام میں ابھی تک اموی اثر ہے اور تمہارے سوا میں کسی اور پر اعتبار
 نہیں کر سکتا۔ اپنے رشتہ داروں کو بھی شام کی ولایت نہیں دے
 سکتا مگر ہے کہ وہ دہاں علم بغاوت بلند کر دیں۔ تم فوراً میرے پاس
 بغداد میں پہنچو، مجھے کچھ راز دارانہ باتیں تم سے کرنی ہیں جو تحریر میں
 نامناسب ہیں۔ ابو مسلم چکھ لے گا۔ اس نے یہ خیال کیا کہ خراساں تو میرا اپنا
 ہے شام کا ملک اگر قبضہ میں آگیا تو طرفداران بنو امیہ کی مدد سے عباسیوں
 کو نیچا دکھا سکتا ہوں۔ بہ زور طمع دیدہ ہوشمند، مگر اس نے اتنی احتیاط کی
 اپنے ساتھ چند ہزار جانثار سپاہی بطور محافظ فوج بھی ساتھ لایا۔ منصور
 نے نہایت گرم جوشی سے استقبال کیا۔ محافظ فوج کی ہر طرح دلجوئی کی
 ابو مسلم خراسانی کی سات روز شاہانہ دعوت میں بہت کچھ عزت افزائی بھی
 کی۔ ابو مسلم اب بالکل مطمئن تھا۔ ساتویں روز مہمان عزیز کو الوداع کرنا
 تھا، آخری ضیافت نہایت پر تکلف تھی۔ ابو مسلم کے ہمراہ چند جانثار
 سپاہی مدعو تھے۔ خلیفہ راز کی باتیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے خلوت
 کی ضرورت تھی۔ ابو مسلم کو ان سے الگ ایک کمرہ کی طرف لے گیا۔ گھات
 میں عباسی سپاہی تھے۔ ایک دفعہ ہی خراسانی پر ٹوٹ پڑے۔ اور اس کا
 کام تمام کر دیا۔ خراسانی سپاہیوں کو ٹھکانے لگانے کی مشکل بات تھی۔
 ہم نے ابو مسلم کا بالخصوص ذکر ذرا تفصیل کے ساتھ اس لیے لکھا
 ہے کہ ابو مسلم نے اپنا ایک مذہب خراساں میں شائع کیا جو بعد میں

خرمیدہ کہلایا۔ اس ذوق کے لوگ ابومسلم کو منظر الوہیت کہتے، اور کبھی ابومسلم کی وفات پر یقین نہیں کیا۔ کہتے کہ وہ مصلحتاً روپوش ہے اور کسی وقت سیاہ بھنڈوں کے ساتھ جو اس نے بنو عباس کے نام پر اپنے متبیین کا امتیازی نشان مقرر کیا تھا خروج کرے گا۔ ان سیاہ بھنڈوں کے ساتھ مہدی کا خروج بھی بعض احادیث میں مذکور ہے۔ اس مذہب نے ایرانیوں میں کبھی مدعیان مہدویت پیدا کر دیے۔

نفس ذکیر کا جواب الجواب منصور نے یہ دیا کہ :-

تمہارے فخر کا دار و مدار صرف عورتوں کی قرابت پر ہے۔ اور یہ ابلہ فریب باتیں ہیں اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو چچاؤں اور باپوں اور عصبہ ولیوں کی طرح نہیں بنایا، چچا کو باپ کا قائم مقام بنایا ہے بلکہ کتاب اللہ میں وہ قریب ترین ماں پر مقدم ہے۔ یہ دعویٰ محل نظر ہے، اگر اللہ تعالیٰ عورتوں کی قرابت کا پاس کرنا تو آئمہ (والدہ آنحضرت) ان میں سے اقرب اور سب سے بڑھ کر حق والی ہوئی اور سب سے پہلے جنت میں داخل ہوئی اللہ تعالیٰ نے اپنی مشیت سے ان لوگوں کو جو گذر گئے پیدا کیا، اور تم نے فاطمہ ام ابی طالب اور اس سے پیدا ہونے کا ذکر کیا ہے اس کی تو یہ حالت ہے کہ اس کا کوئی لڑکا اور لڑکی اسلام سے بہرہ ور نہیں ہوئی اور اگر اللہ تعالیٰ کو مردوں میں سے کسی کو بوجہ قرابت رسول اللہ وائرہ اسلام میں داخل کرنا منظور ہوتا تو عبداللہ (والد آنحضرت) کو یہ شرف عطا ہوتا بیشک وہ دنیا اور آخرت میں بہتر تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے

دین میں جس کو چاہا داخل فرمایا اور فرماتا ہے کہ منہ لا یقعدی
 من لعبتہ ولیکن باللہ یعدی من یشاہدہ ورا علمہ بالمہتدین
 جب اللہ تعالیٰ نے آنحضرت کو مبعوث فرمایا، اس وقت
 آپ کے چار چچا زندہ موجود تھے۔ جب انہیں عیشرتک الاحزابین
 نازل فرمائی تو دونے اسلام قبول کیا دحزہ اور عباسؓ اور
 ان میں سے میرباب عباس ہے اور دودابی طالب لدابی کعبہ نے انکار کیا
 امدان میں سے ایک ابی طالب تمہارا باپ ہے اسلئے اللہ تعالیٰ نے دونوں کا صلہ
 ولایت آنحضرت سے منقطع کر دیا بعد آنحضرت امدان میں سے کوئی تعلق
 عزیز داری امدومہ اور میراث قائم نہ کیا اور تمہارا یہ خیال عام ہے کہ تم خیر الاشرار
 دابی طالب کے بیٹے ہو۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کرنے میں
 کوئی صبر نہیں ہوتا۔ اور مشرکوں کوئی بہتر نہیں ہوتا اور
 کسی مرد مومن کو زینہ نہیں دیتا کہ کسی دوزخی کی اولاد ہونے
 پر فخر کرے۔ اور قریب ہے کہ تم خود دوزخ میں جاؤ گے
 ارشاد الہی ہے جو قریب تر زمانہ میں ظالم جان لیں گے کہ وہ
 کس انقلاب کی زد میں ہیں، تم نے لکھا ہے کہ حسن رضی
 عبدالمطلب سے دوہرا معاملہ قرابت رکھتے تھے اور تمہیں
 رسول اللہ سے دو طرفہ تعلق قرابت ہے، بیشک خیر الاولیاء
 و الآخرین رسول اللہ ہیں، آپ کو ہاشم اور عبدالمطلب سے
 صرف ایک پاری تعلق تھا، اور تمہارا یہ زعم کہ تم بہترین
 بنو ہاشم ہو اور یہ کہ تمہارے آباؤ اجداد واجہات ان میں
 زیادہ مشہور تھے اور یہ کہ تم میں کنیزک کا لگاؤ نہیں ہے۔

میں دیکھتا ہوں کہ تم نے کل بتو ہاشم سے آپ کو متفخر بنا دیا
 ہے۔ غور کر دعت ہے تم پر۔ کل اللہ تعالیٰ کو کیا جواب دو
 گے۔ تم حد سے بڑھ گئے ہو اور تم نے اس سے بڑھ کر اپنا
 فخر جتایا ہے جو ذات و صفات میں تم سے افضل تھا ذابراہیم
 ابن محمد رسول اللہ جو ماریہ قبطیہ کے بطن سے پیدا ہوئے
 اور بالخصوص تمہارے باپ کی اولاد میں سے کوئی افضل سوائے
 کنیزک زاووں کے نہیں۔ بعد وفات رسول اللہ تم میں علی بن
 عین (ام زین العابدینؑ) سے افضل کوئی شخص پیدا نہیں ہو
 اور وہ کنیزک زادہ تھے۔ اور کچھ غمک نہیں کہ ان کا مرتبہ تمہارے
 دادا حسن بن حسین سے بڑا ہے۔ اور ان کے بعد تم میں سے
 محمد بن علی کی مثل کوئی نہیں ہوا۔ اور ان کی دادی کنیزک تھیں۔
 اور جعفر تم سے بہتر ہے، تمہاری دعویٰ کہ تم رسول اللہ کے
 بیٹے ہو قطعاً غلط ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ماکان محمد
ابا احد من احاکم۔ تم لوگ آنحضرت کی لڑکی کے لڑکے ہو اور بیشک
 یہ قرابت قریب ہے۔ مگر اس کو میراث نہیں پہنچ سکتی اور نہ
 یہ ولایت کی وارث ہو سکتی ہے اور نہ اس کو امامت جائز ہے
 تمہارے باپ علی رضی اللہ عنہ نے اس کی ہر طرح سے خواہش کی تھی،
 ناظرہ کو روز روشن نکالا اور در پردہ ان کو بیمار کیا اور سات کے
 وقت دفن کر دیا۔ بایں ہمہ لوگوں نے ابو بکر اور ان کے بعد
 عمر کے سوا کسی کو منظور نہیں کیا۔ اس میں مسلمانوں میں اختلاف
 نہیں ہے کہ نانا اور ماموں اور فاطمہ مورث نہیں ہوئے۔

تم نے جو علیؑ کے سابقہ ابلاہم ہونے پر فخر کیا ہے۔ اس کا جواب
 یہ ہے کہ رسول اللہؐ نے بوقت وفات ابوبکر کو امام بنایا۔ بعد ازاں لوگ
 ایک کے بعد دوسرے کو امام بناتے گئے۔ اور علیؑ کو منتخب نہ کیا۔ حالانکہ
 یہ بھی ان چھ بزرگوں میں سے تھے جن کو عمر نے نامزد کیا تھا۔ آپ کو خلافت
 کے لائق نہ سمجھا، عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے عثمان کو ان پر مقدم کر دیا۔
 طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہما آپ سے لڑے (جنگ جمل میں) اور سعد نے آپ کی
 بیعت سے انکار کیا۔ اور معاویہ کی بیعت کر لی، تمہارے باپ نے خلافت
 کی تمنا کی اور لڑے (جنگ صفین میں) اور آپ سے آپ کے مصاحب
 علیحدہ ہو گئے اور حکمیں (عمر و بن العاص اور ابو موسیٰ شرعی) مقرر کرنے سے
 پہلے ان کے ہوا خواہ (خوارج) آپ کے استحقاق میں شک و شبہ کرنے لگے
 حکمیں نے آپ کی معزولی پر اتفاق کر لیا۔ پھر آپ کی شہادت کے بعد حسن رضی
 اللہ عنہ خلیفہ ہوئے، امامت اور خلافت کو معاویہ کے ہاتھ کپڑوں اور زوپیوں کے
 عوض فروخت کر دیا۔ اور اپنے بدخواہوں کو معاویہ کے سپرد کر دیا۔ بس
 اگر تمہارا اس میں کچھ حق بھی تھا تو تمہارے باپ نے فروخت کر ڈالا۔
 اور قیمت وصول کر لی۔ پھر تمہارے چچا حسینؑ نے ابن مرجانہ (ابن زیاد) پر
 خروج کیا۔ ان لوگوں نے آپ کو قتل کیا، خرمہ کی ڈالیوں پر سولی دی، آگ
 میں جلایا، شہر بدر کیا، ہم نے تمہارے خون کا بدلہ لیا۔ اور تمہیں ان کی
 اہلک کا مالک بنایا، تمہارے باپ دادا کا نام بلند کیا اور فضیلت دی، کیا
 تم اس احسان کے ذریعہ ہمیں معقول کرتے ہو۔ تم جانتے ہو کہ ہم لوگوں کی
 بزرگی ایام جاہلیت درہ حیثیت آنحضرتؐ سے پیشتر حجاج کو پانی پلانے
 (سقاہ) اور ولایت زمام پر منحصر تھی۔ تمہارے باپ علیؑ نے اس استحقاق

کے بارہ میں ہم سے جھگڑا کیا۔ عمر نہ نے ہمارے حق میں فیصلہ دیا۔
آنحضرتؐ کے بعد بنی عبدالمطلب میں سے کوئی شخص سوائے عباسؓ باقی نہ
تھا۔ اس لیے وراثت چچا کی طرف منتقل ہو گئی۔

اس لفظی مجادلہ میں فریقین حق خلافت و امامت قرابت آنحضرتؐ قرار
دیتے ہیں۔ اور ساتھ ہی بنو عباس اس کی تردید بھی کرتے ہیں۔ جب اہل بین
خلفا کا انتخاب اس استحقاق کو نظر انداز کرنے کے بعد ہوا ظاہر ہے کہ امت
نے یہ کوئی حق تسلیم نہ کیا۔ اور جب منصور یہ کہتا ہے کہ آنحضرتؐ اتنے بوقت
وفات ابو بکرؓ کو امام بنایا تو دینی زبان سے یہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ حق امامت
حق قرابت پر مبنی نہیں تھا۔ بہر حال جب معقول دلائل سے کام نہ چلا تو برہان
قاطع تلوار نے فیصلہ کر دیا۔

عروس ملک کے درکنار گیر و چپت کہ بوسہ بر لب شمشیر آبدار زند
اس مجادلہ میں محمد النفس الذکیہ یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ میں امام مہدی
موجود ہوں اور میرے بارہ میں آنحضرتؐ کی احادیث ہیں، ایسا معلوم ہوتا
ہے کہ متبعین یا واعیان نے آپؐ پر احادیث چسپاں کر دیں۔ جو غالباً
ان لوگوں نے وضع کیں اور ان احادیث کو بھی آپؐ کا مصداق قرار دیا
جو ابن زبیرؓ کے بارہ میں شائع ہو چکی تھیں۔

منصور کے بیٹے کا نام محمد المہدی ہے اور منصور کے بھائی
موسیٰ کا بیٹا علیؑ اس وقت افواج عباسیہ کا سپہ سالار تھا۔ امام مہدی
(عباسی) اور حضرت علیؑ (عباسی) کا مقابلہ میدان جنگ میں نفس ذکیہ سے
ہوا۔ نفس ذکیہ موت کا ذائقہ شناس ہوا۔ میدان مہدی و علیؑ کے ہاتھ
رہا۔ نفس ذکیہ کے بھائی ابراہیم نے بصرہ سے خروج کیا۔ مہدی و علیؑ نے

اسے بھی شکست دے کر مارا۔ منصور عباسی کے بعد اس کا بیٹا محمد المہدی
تحت خلافت پر ممکن ہو گیا۔ لیکن اس نے کبھی دعویٰ نہیں کیا کہ میں مہدی
موجود ہوں۔ اس کے بعد اس کا بیٹا "ہادی" تحت نشین ہوا۔ معلوم ہوتا
کہ مہدی و ہادی نام اس غرض سے والدین نے نہیں رکھے تھے۔ کہ لوگ
ان کو مہدی موجود سمجھ کر ان کی اطاعت کریں۔ اور خود ابن زبیر اور محمد
نفسِ ذکیہ نے بھی ایسا دعویٰ کبھی نہیں کیا۔ البتہ بعض احادیث کو ان کے
متبعین نے ان کی شخصیت پر چسپاں کیا۔ مگر مہدی موجود کی اصطلاح یا تو
اس وقت تک وضع ہی نہ ہوئی تھی یا اس کا صاف صاف صاف تصور جیسا
کہ ہمارے زمانہ میں ہے دوسری صدی ہجری میں نہ تھا۔ اور یہی وجہ ہے
کہ صحیح بخاری میں "مہدی" کے بارے میں کوئی حدیث نہیں۔ یا تو اسے ایسی
کوئی حدیث نہیں ملی اور اگر ملی تو اس نے صحیح قرار نہ دی محض یہی اختراع
سمجھ کر مسترد کر دی۔ حالانکہ امام بخاری دوسری صدی ہجری کے آغا اور تیسری
صدی کے نصف تک (۲۵۶-۱۹۳ھ) تک موجود تھا۔ اس لیے قرین عقل
یہی ہے کہ امام بخاری کے آخری وقت تک "مہدی" کی اصطلاح وضع نہ
ہوئی تھی۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ اصطلاح کب اور کس نے وضع کی؟ اس
کی تحقیق کے لیے ہمیں پھر سے ابو مسلم خراسانی کی طرف رجوع کرنا چاہئے
عمرانی کتاب ہے کہ :-

« ابو مسلم کا مذہب کیسا نیک تھا جو مختار سے منسوب ہے۔» - دہم بیان
کر چکے ہیں کہ کیسا نیک ایک شارحِ تحریر ہے جو عبد اللہ بن عمرو بن حباب
کنذی سے منسوب ہے اور اس مذہب کے عقاید بھی بیان کر چکے ہیں
ابتداء میں ابو مسلم کی تعلیم و تربیت اسی مذہب پر ہوئی، جس میں الوہیت

و حلول و تاریخ نمایاں عقیدہ ہے اس نے کوشش کی کہ کسی طرح سے
 اہم جعفر صادقؑ کو اپنے قائم تزدیر میں لائے "دٹھیک اسی طرح جس طرح
 مختار نے زین العابدین کو پھسانا چاہا تھا" مگر جب ادھر سے نا امید
 ہوا تو ابوالعباس بن محمد کی طرف رجوع کیا۔ اسی کی کوشش سے بنو امیہ
 کا تختہ حکومت شام میں الٹ گیا۔ اور خلافت پر قبضہ بنو عباس کا ہو
 گیا۔ ابو مسلم خلیفہ عباسی منصور کے اشارہ پر مارا گیا مگر اس کی نسبت
 خراسانی جانثاروں کا یہ عقیدہ پختہ تھا کہ وہ مظہر الوہیت ہے اور زندہ
 ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ابو مسلم اپنی سلطنت قائم کرنا چاہتا تھا۔
 اقوام آریا، ایرانی، ہندوستانی، یونانی وغیرہ ہمیشہ سے دیوتا پرست
 رہے ہیں اور اپنے راہوں اور دینی پیشواؤں رضیوں منیوں کو "دوتار"
 مظہر الوہیت سمجھ کر ان کی پوجا بھی کرتے رہے۔ توحید کا صحیح صحیح
 تصور ان کے ذہن میں نہ کبھی تھا اور نہ آج تک ہے۔ یونانیوں اور
 رومیوں نے مسیح کو بحیثیت ایک دیوتا اور خدا اور خدا زادہ ہی تسلیم کیا۔
 اور اسی عقیدہ پر آج تک قائم ہیں۔ حالانکہ مسیح یہودی تھے اور اس
 شرک سے آپ کو دور کی نسبت بھی نہیں۔ جب ایرانیوں نے اسلام قبول
 کیا تو یہ عقیدہ جو وقتاً ان کے ذہن میں پختہ ہو چکا تھا محو نہ ہوا،
 بنو ہاشم کے داعیوں نے وہی روش اختیار کی جو پولوس یونانیوں اور
 رومیوں میں مسیح کے نام پر کر چکا تھا۔ ایرانیوں کو دعویٰ داراں خلافت و امامت
 کا گرویدہ بلکہ ان سے عالہانہ محبت پیدا کرنے کا اس سے بہتر کوئی طریقہ
 نہ تھا کہ ان کو دیوتا اور دوتار کی حیثیت سے پیش کیا۔ دیوتا مرنا نہیں جانتے
 وہ بشری صورت میں خدا ہوتے ہیں۔ وہ صرف دیوش ہو جاتے ہیں۔

اور پھر کسی مناسب وقت پر ان کا ظہور ہوتا ہے اور جب یہ عقیدہ پختہ ہو گیا اور آریا ذہنیت میں پہلے ہی اتنا راسخ تھا کہ ان کی طبیعت ثانیہ بن چکا تھا تو آمد ثانی کا انتظار بے مبری سے کیا جاتا۔ اور جب کوئی مدعی کھڑا ہو جاتا تو لوگوں کی توجہ کا مرکز بن جاتا، وہ خود خواہ لاف نلی سے کام نہ لیتا مگر مریدان می پر اندہ کی صورت پیدا ہو جاتی اور ایک نئے فرقہ یا مذہب کی بنیاد پڑ جاتی۔ عرب بالخصوص قریش کے ذہن میں تو دیوتا کا روپ دھارنے کا خیال پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن نو مسلم جوہی اس سوانگ سے خوب واقف تھے۔

پہلی صدی ہجری کے اواخر اور دوسری صدی کے شروع میں کوفہ میں نو مسلم جوہی کثرت سے آباد ہو چکے تھے، بنو ہاشم دعویٰ داران خلافت امامت تھے، لیکن یہ تاریخی واقعہ ہے کہ بنو امیہ کا پشت پناہ تمام عرب تھا اور اموی خلافت خالص عرب حکومت تھی بنو ہاشم کے لیے اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ انہی نو مسلم جوہیوں کی مدد سے اموی حکومت ختم کر کے اپنا راج پاٹ قائم کرتے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علیؑ نے بھی کوفہ کو مدینہ کی جگہ مستقر خلافت اسی لیے تجویز فرمایا تھا کہ یہ مقام ایران سے نزدیک تر ہے۔ بہر حال جب کبھی بنو ہاشم کی تائید ہوئی اسی شہر کوفہ سے اس کی ابتدا ہوئی۔

ایرانی بنو ہاشم کی تائید بظاہر اس لیے کر رہے تھے کہ ان کی قرابت قریباً حضرت سے ہے۔ لیکن اس کی ایک سیاسی غرض بھی تھی۔ بنو امیہ کی خلافت خالص عرب حکومت تھی اور اسی عرب حکومت نے ایران کی قومی حکومت کے ساتھ اس کی تہذیب و تمدن اور مذہب مٹا دیا تھا۔

ان میں بعض افراد کے دل میں قومی جذبہ انہیں اس بات پر ابھار رہا تھا کہ پھر سے گزشتہ شان و شوکت و عظمت بحال کریں۔ اور یہ ممکن نہ تھا جب تک عرب حکومت ان پر مسلط تھی اور اس وقت اس کی نمائندگی بنو امیہ کر رہے تھے۔

قاسم زاوہ ایرانی نے اپنی کتاب "جلوہ ریزی روح ایران" میں صاف صاف الفاظ میں اس حقیقت کو بے نقاب کیا ہے کہ ایرانیوں کو نہ تو بنو امیہ سے کوئی خاص دشمنی تھی اور نہ بنو ہاشم کا عشق تھا۔ وہ تو عرب حکومت کے دشمن تھے، خواہ اس کی نمائندہ اموی یا عباسی یا فاطمی حکومت تھی۔ ان میں خاندانی رقیابت کا فائدہ انہوں نے اٹھایا۔ اگر بنو فاطمہ کا ساتھ دیا تو اس لیے کہ اموی حکومت تباہ ہو اور اگر بنو عباس کا ساتھ دیا تو اس لیے کہ دونوں ہلاک ہوں، اور رفتہ رفتہ قوت اور اقتدار ایران میں منتقل ہو جائے۔

مولف "دلبان مذاہب" نے واقعات کی بنا پر لکھا ہے کہ اس کے اپنے زمانہ میں داورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں، ایسے مجوسی بھی تھے جن سے ملاقات اور رفتہ رفتہ دوستی کا شرف مولف کو حاصل رہا۔ کہ بظاہر مسلمان تھے اور اسلامی ناموں کے ساتھ مسلمانوں میں ملے جلے رہتے مگر دل میں ژند اوستا رچا ہوا تھا۔ اور عوام میں خاموشی کے ساتھ اپنے ہی عقاید شائع کرتے تھے، یہ تاریخی واقعہ ہے کہ خلافت عباسیہ کے وقت اس قماش کے سوگ جن کی سرگرمی کا مرکز کو فہ تھا بغداد اور بصرہ میں ایسی احادیث شائع کر رہے تھے جو ان کی اپنی وضع کردہ تھیں۔ اور ان کی احادیث ژند اوستا ہی کی باہیں تھیں۔ ایسی احادیث پہلی صدی

ہجری کے اواخر ہی سے شائع ہو رہی تھیں۔ دوسری اور تیسری جلد میں تو دنیا اسلام کے طول و عرض میں کثرت سے شائع ہو چکی تھیں۔ بہت عرصہ بعد مسلمانوں کو اس کا علم ہوا۔ ان لوگوں کو مسلمانوں نے "زندیق" سے مخاطب کیا۔ جو معرب ہے "زند" کا اور یہ پارسیوں کی مقدس کتاب "ادستا" کی مقدس زبان ہے، ماضیان احادیث تو اور بھی حضرات تھے واعظ اپنی گرم بازاری کے لیے اور اکثر ثقہ لوگ فضائل اور ترغیب کے لیے نیک نیتی سے حدیثیں بے تکلف وضع کرتے تھے، اس کا مذکورہ ملا علی قاری نے اپنی کتاب موضوعات کبیرہ میں مفصل کہہ ہے چودہ ہزار احادیث صرف ان زندیقوں کی اختراع تھے۔ زندیق عبدالکریم مصارع جب گرفتار ہوا تو اس نے تسلیم کیا کہ چار ہزار احادیث صرف اسی اکیلے نے وضع کیں اور یہ بھی کہا کہ جو چاہو مجھ سے سلوک کروہ میرا مقصد حاصل ہو چکا ہے ملک کے طول و عرض میں یہ احادیث شائع ہو چکی ہیں جس میں میں نے حرام کو حلال اور حلال کو حرام قرار دیا اور اب تمہارے مٹانے سے مٹ نہیں سکتی۔

اگرچہ یہ صحیح حدیث تو اتر سے منقول ہو رہی تھی کہ آنحضرت نے منع قرار دیا تھا کہ قرآن کے سوا کوئی اور حدیث جو مجھ سے منسوب ہو قلم بند نہ کی جائے۔ مگر حالات ایسے پیدا ہو گئے کہ موضوعات کی کثرت نے مسلمانوں میں فرقہ بندی کے ساتھ سٹرائیڈ تفرقہ ڈال دیا اس لیے بعض دور اندیش حضرات نے احادیث کی تحقیق اور بھی بلحاظ روایت شروع کر دی۔ امام بخاری نے کئی لاکھ شائع شدہ احادیث جمع کیں۔

انتخاب کے بعد کل ۷۳۹ احادیث "جامع صحیح" میں قلم بند کیں اور اگر "مکرات" نظر انداز کی جائیں تو ان کی تعداد ۳۷۱ رہ جاتی ہے۔ دوسرا کسی حدیث کو نہیں پرکھا گیا۔ لہذا اس کی یہی ضمانت نہیں کہ تمام احادیث جو جامع صحیح میں ہیں امام صاحب کی انتخاب کردہ ہیں۔ الحاقی نہیں یا ان میں رد و بدل کبھی نہیں ہوا۔ جبکہ بقول علامہ ابن خلدون اس وقت زیادہ تر اہل قلم عمی ہی تھے۔

"مہدی" کے بارہ میں امام بخاری تو خاموش ہیں اور قیاس غالب یہی ہے کہ امام صاحب کے وقت یہ اصطلاح وضع نہ ہوئی تھی اور اگر ہوئی تو اس کا علم نہ تھا۔ بہر حال اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ مہدی کے ظہور یا آمد ثانی کا عقیدہ حضرت شیخاں علی ہی میں محدود رہا اور ان میں اکثریت اہل ایران کی ہے۔ اہل سنت و اطاعت بہت عرصہ بعد اس پروپیگنڈہ سے متاثر ہوئے اور آج بھی شیخاں علی کے مہنوا ہیں۔ ہم کو چکے ہیں کہ جب بنو فاطمہ اور بنو عباس اور نو مسلم ایرانیوں کی متحدہ طاقت اور سیاسی ریشہ دوانی سے جس کا جال داعیان بنو ہاشم نے ملک کے طول و عرض میں بچھا رکھا تھا بنو امیہ کی حکومت کا تختہ شام میں الٹ گیا تو بنو فاطمہ اور بنو عباس خلافت اور امامت کے لیے دست و گریباں ہوئے۔ ایرانی دونوں جانب اپنے مفاد کے لیے اور ممکن ہے کہ بعض خلوص نیت سے طرفدار تھے۔ ہم صرف عین اٹھناص کو منتخب کرتے ہیں ان میں سے ایک ابو مسلم خراسانی تھا اور دوسرا مغیرہ بن سعید اور تیسرا ابو منصور تھا۔ اول الذکر دو کے مختصر حالات ہم بیان کر چکے ہیں۔ ابو مسلم تو بنو عباس کا داعی تھا اور موخر الذکر وہ بنو فاطمہ کے داعی تھے۔ دونوں

قبیلہ عجمی کے "موالی" تھے،

اصطلاح "موالی" کا مفہوم بھی اچھی طرح ذہن نشین کرنا چاہئے۔ اگر اہل قلم کو مناظرہ ہوا ہے کہ اس اصطلاح کا اعلان عجمی لوگوں پر ہوتا ہے جو عربی حکومت کے کسی قبیلہ کے غلام تھے اور پھر خدمات کے صلہ میں آزاد کئے گئے۔ کچھ شک نہیں کہ بعض حالات میں ایسے لوگوں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ بدعت اموی حکومت میں رائج ہوئی۔ قرآن میں تو انما المؤمنون اخوة "بی سب سے" اور آنحضرت نے ہاجرین و انصار میں مواخاۃ "قائم کی مگر یہ سب مدنی اور مدنی عرب ہی تھے جب غیر عرب حلقہ یگوش اسلام ہوئے۔ اور اشاعت اسلام کا سہرا بھی اموی خلافت کے سر ہے تو عرب و عجم میں مواخاۃ "نہیں بلکہ" موالات قائم کی گئی۔ اس لیے کسی عربی قبیلہ کے دوست عجمی موالی کہلائے، عجمیوں کو بنو امیہ کے خلاف سخت متعصب واقع ہوئے تھے یہ شکایت بھی تھی کہ باوجود قبول اسلام عرب ان سے برادرانہ سلوک نہیں کرتے۔ اور یہ شکایت بجا تھی۔

تینوں ابو مسلم اور مغیرہ اور ابو منصور میں فرقوں کے بانی ہیں۔ ابو مسلم کا مذہب حزمیہ تو خراسان میں پھولا پھلا اور بایک خرمی اور حکیم مقنع جیسی شخصیتیں اسی مذہب پر تھیں۔ عباسی خلیفہ محمد المہدی سے مستقم ہونے تک کو بار بار ان کی سرکوبی کے لیے لشکر کشی کرنی پڑی مگر یہ بھی جب حالات ذرا سازگار ہوتے علم بغاوت بلند کرتے۔ خلیفہ محمد المہدی اور اس کے جانشین ہادی نے ان کو چن چن کر قتل کیا مگر ان میں کمی واقع نہ ہوئی۔

ابو منصور امام ابو جعفر الملقب بہ الباقر کا ہم عصر تھا اور آپ کی امامت کا ایسا ہی قائل تھا جیسے مختار محمد ابن الحنفیہ اور ابو مسلم عباسیہ کا۔ جب تک

اہم زندہ رہے اس نے اپنے عقیدہ کی تبدیلی کا اظہار نہ کیا آپ کی وفات
(۱۱۱۱ھ) پر خود ذمہ دار امامت ہوا۔ فرقہ جس کی طرح ڈال چکا تھا پہلے باقرہ
پھر بعد وفات اہم "منصور" سے موسوم ہوا۔ اس فرقہ کا یہ عقیدہ تھا کہ
اہم باقر یا پانچویں امام ہیں نہ یہی مہدی ہیں۔ یہ فرقہ امامیہ، اثنا عشریہ کی
شاخ بھی گئی ہے کیونکہ وہ بھی امام باقرؑ کو پانچواں امام برحق تسلیم کرتے ہیں
ابو منصور امامت پر قانع نہ رہا اس نے وہی دعویٰ الوہیت کیا جو یحییٰ مراد
سے منسوب کرتے ہیں۔ ابو منصور نے اپنے متبعین میں یہ بے پرکی اڑائی
کہ میں آسمان پر اٹھایا گیا، مجھے روایت حق کا مشاہدہ ہوا۔ حق اللہ تعالیٰ
نے میرے سر پر تھپی دی اور سرمانی زبان میں فرمایا کہ "اے میرے بیٹے
زمین پر جا۔ آسمان سے میرا نزول زمین پر ہوا۔ کس ساقطہ میں ہوں
(انشاءً علیہ ان یروا السماء سماعاً و بآتلاً الدیہ ۱۱) جو میرے تابع ہے
اس کے لیے تو بارانِ رحمت ہے اور جو مخالف ہے اس کے لیے عذاب
ہے، نبوت ہرگز منقطع نہیں ہوئی، یہ ابدی ہے اور جاہل رہے
گی، اللہ تعالیٰ نے پہلے حضرت عیسیٰ کو خلق فرمایا پھر نقشِ ثانی حضرت
علیؑ ابن ابی طالب کو، اب نقشِ ثالث مجھے۔"

اس وقت یوسف بن عمر ثقفی بنو امیہ کی طرف سے عالمی عراق
تھا۔ فرقہ منصور یہ کے لوگوں نے یہاں بٹربوٹنگ چارکھی تھی ابو منصور کو
گرفتار کیا اور پھانسی دی، یہ صحیح معنی میں مثل مسیح تھا یا آپ کا نقشِ ثالث
کہ مسیح تو دارِ پراویزوں ہوئے اور یہ پھانسی پا گیا۔ اس کی شخصیت امامِ تیم
امامت اور نبوت احد الوہیت کی جامع تھی۔

اس تمام بحث کا حاصل یہ ہے کہ مہدی کا تصور خالص علمی ہے۔

اور آریا ذہنیت کے ہی مناسب سہیے، تاریخی حقیقت بھی یہی ہے کہ
 ایرانی پھر سے اپنی شان و عظمت کا خواب دیکھ رہے تھے جو آخر مشرق
 نصیر ہوا۔ خلافت عباسیہ پر رفتہ رفتہ ایرانی چھا گئے۔ خلیفہ منصور
 عباسی کی تمام تر توجہ اور ہمت اس بات پر مرکوز رہی کہ عربوں کا زور توڑ
 دیا جائے جو شروع سے بنو امیہ کے پشت پناہ تھے۔ اس کے عزم
 سرائے میں کوئی خالص عرب ملازم نہیں رہ سکتا تھا۔ عرب جس نسبت
 سے کمزور ہوتے گئے اسی نسبت سے علمی زور پکڑتے گئے۔ آٹھویں
 تا چہار عباسی معتصم نے جب دیکھا کہ ایرانی ہر طرف چھا رہے ہیں تو
 ترکوں کی بھرتی شروع کر دی، اسے بھی اس کا احساس نہ ہوا کہ عربوں کو
 ایرانیوں کے مقابلہ میں کھڑا کرے۔ عرب کے قومی شاعر و عیال سوزاخی نے
 آٹھ کے عہد سے ایک بات پیدا کی ہے۔

طوک بنی عباس تو دراصل سات ہی ہیں
 اور سات کا عدد ہی کتاب اللہ میں اشکال
 ہوا ہے اور آٹھ کا عدد نہیں اس وجہ
 سے اصحاب کہف خوابیدہ سات ہیں
 البتہ ان کا آٹھواں ہے مگر اس
 کتے لہذا آٹھویں خلیفہ عباسی میں فرق
 یہ ہے کہ وہ بیٹک دم (زین) رکھا
 ہے لیکن ڈنگ (زین) نہیں مارا
 اور یہ دم کا کتا ڈنگ مارنے سے نہیں
 چوکتا زین کے معنی گناہ بھی ہیں

ملوک بنی عباس فی الکتب سبعة
 ولم یاتھا فی ثامن منهم الکتب

کذلك اهل الکھف سبعة
 عداة ثورا فیھا وثامنهم کلب

وانی لازای کلبهم عنک مرغبة
 لانک ذوق ذنب ولسی لسا ذنب

کتا گنہگار نہیں اور یہ گنہگار ہیں۔
 معصم فوت ہوا تو جانشین واثق مابعد ہوا۔ حسب و عیال کو اس واقعہ کی اطلاع
 ہوئی تو کہا

الحمد لله لا صبر ولا جملہ
 ولا عزاء اذا اهل البلاد فتدوا
 الخلفاء ماتت لم یحزن لہا احد
 واخر قام لم یفرح بہا احد
 اللہ تعالیٰ کا، صبر و شکیب کا موقع نہیں
 قائم پرسی کی اس وقت خابوت نہیں
 جب اہل ملاء سور ہیں۔
 ایک خلیفہ مر گیا تو کسی کو اس کے مرنے
 کا غم نہ ہوا دوسرا اس کی جگہ کھڑا ہوا
 تو کسی کو خوشی نہ ہوئی۔

معصم نے بغداد کی جگہ شہر سمرقند راہ بسایا مخففت ہو کر سامرا رہ گیا۔
 ابتدا میں یہ ایک چھاؤنی تھی اس لیے اس کو عسکرہ بھی کہتے۔ شیعیان علی امامیہ
 کا گیارہواں امام حسن رضا $\frac{252}{898}$ اسی لیے عسکرہ کہلائے آپ کا بیٹا
 محمد مہدی رضا تھا باپ کی وفات پر اس کی عمر پانچ یا آٹھ سال تھی۔ رعایت
 یہ ہے کہ بنو عباس کے خوف سے سامرا کے ایک غار میں چھپ رہے
 بعد پھر باہر نہیں نکلے شیعہ اثنا عشریہ اسی بار ہوئے امام کو غائب اور منتظر
 اور مہدی موعود کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس پانچ یا آٹھ سال کے لڑکے نے
 باپ کی زندگی میں کسی دشواری برداشت نہیں کیا اور اس نے پیشتر کسی امام
 سے یہ دشواری منسوب نہیں۔ لہذا ہم محمد النفس الذکیہ اور منصور عباسی کے
 تجربی مجادلہ میں واضح کر چکے ہیں کہ کسی فریق نے استحقاق خلافت و امامت
 کی تائید میں یہ نہیں کہا کہ احادیث میں جس مہدی موعود کی پیش گوئی کی ہے
 اس کا مصداق میں ہوں وہ صرف اپنا حق قرابت ہواں کو آنحضرت سے

تھا بطور شہادت پیش کرتے ہیں۔ اس لیے ہم یہ سمجھنے میں حق بجانب ہیں کہ کسی بائیسویں صدی کے آخر تک دعویٰ مہدویت نہیں کیا۔ لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ "مہدی" کا تصور ایرانی ذہن میں تھا۔ ابتدا میں یہ اصطلاح وضع نہ ہوئی تھی مگر جوں جوں یہ تصور صاف صاف تیز ہوتا گیا دعایات بھی اس پر چسپاں ہوتی گئیں محمد المہدی کی غیبت کے بعد اس کی آمد ثانی فرقہ امامیہ کا خاص عقیدہ ہے جس کی آج کثرت ایران میں ہے اور مدہرب اثنا عشریہ راج و صرم ہے۔ ابن خلدون لکھتا ہے کہ آج بھی زچود ہویں صدی عیسوی) اثنا عشری سالانہ اس غار کے منہ پر جمع ہوتے ہیں اور امام غائب کو دعوت خروج دیتے ہیں۔ محمد المہدیؑ کی آمد ثانی کا انتظار آج بھی ہو رہا ہے، اہل سنت و الجماعت اتنا تو تسلیم کرتے ہیں کہ احادیث میں "مہدی" کا مذکور ہے اور وہ "مہدی آخر الزماں" حضرت عیسیٰ کے نزول کے ساتھ خروج کرے گا غالباً وہ اس محمد المہدی کی آمد ثانی کے منتظر نہیں۔ بہر حال کسی مہدی کے منتظر ضرور ہیں۔

خلافت عباسیہ رو بہ زوال تھی۔ "عبداللہ المہدی" امام جعفر صادقؑ کی پانچویں پشت میں شمالی افریقہ میں بنو قاطر کی خلافت قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ شیخ امامیہ اس کو امام جعفر صادق کے بڑے بیٹے اسماعیل کی اولاد تسلیم نہیں کرتے، وہ کہتے ہیں کہ اسماعیل امام صاحب کی زندگی میں فوت ہو گیا تھا۔ اس لیے امام صاحب نے اپنے دوسرے بیٹے موسیٰ کاظمؑ کو اپنا جانشین نامزد کیا جو دوازہ اماموں میں سے ساتواں امام ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ عبداللہ المہدی دراصل میمون القدرح کی نسل سے ہے یعنی ہاشمی نہیں عجمی ہے، اس دعویٰ کو سمجھنے کے لیے ایک مشہور شخصیت ابوالخطاب

محمد بن ابی زینب علوی اجدع کے حالات کا بھی کچھ علم ہونا چاہیے۔ امام محمد باقرؑ کے بعد شیعیان امامیہ دو فرقوں میں بٹ گئے ایک فرقہ محمد النفس الذکیہ کا طرفدار تھا جس نے خلیفہ منصور کے مقابلہ میں دعویٰ خلافت کیا۔ دوسرا امام جعفر صادقؑ کا، امام صاحب نفس ذکیہ کا دعویٰ تسلیم نہیں کرتے تھے مگر خود بھی دعویٰ خلافت نہ تھے، امام صاحب کا پر جوش معتقد ابو الخطاب تھا اس سے ایک فرقہ خطابیہ منسوب ہے۔ اکثر شیعہ فرقے اسی کی شاخیں ہیں۔ یہ امام صاحب کا شاگرد بھی تھا۔ عبدالقادر بغدادی اپنی کتاب "الفرق بین الفرق" میں لکھتا ہے کہ

"خطابیہ اور اس کی چار شاخیں دمہریہ اور بذلیقیہ اور عمیریہ اور منقیلیہ خلفاء راشدین ابو بکر و عمر و عثمان کو غاصب قرار دیتے ہیں۔ لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ وہ خود بھی اسی گناہ کے مرتکب ہوئے اولاد علی سے امامت چھین کر ابو الخطاب وغیرہ کے حوالہ کی بلکہ بعض کا عقیدہ ہے کہ ابو الخطاب امام جعفر صادق سے بھی اعلیٰ مرتبہ کا مالک ہے۔"

ابو الخطاب سے دو بائیں خاص طرز پر منسوب کی جاتی ہیں۔ یعنی ان کی ابتدا اسی نے کی ایک "تقیہ اور دوسرا دعویٰ الوہیت دعویٰ الوہیت تو کوئی نئی بات نہیں تھی۔ البتہ یہ نئی بات شاید ہو کہ امام وقت اللہ ہوتا ہے اور اس کے متبعین اس کے بندے ہیں۔ بہر حال یہ عقیدہ دنیا دار اسلام میں "تقیہ" کے ساتھ ہی مناسبت رکھتا ہے۔

ابو الخطاب نے اگرچہ امام جعفر کو بہت اکسایا کہ دعویٰ خلافت کریں مگر امام صاحب نے دھتکار دیا۔ اور اس کے عقاید سے بیزاری ظاہر کی۔ ابو الخطاب نے کچھ جمعیت فراہم کی اور کوفہ میں علم بغاوت بلند کیا۔ محمد المہدی

عجاسی لور علی بن موسیٰ سپہ سالار افواج عجمیہ نے شکست تاش دی۔
 ابوالخطاب ۱۳۸ھ میں ہار گیا۔ اس کے شاگردوں میں سے ایک شخص
 میمون القدر، طبرستانی تھا۔ امام جعفر صادق رضی کی وفات ۱۳۸ھ کے بعد
 اس نے محمد بن اسماعیل بن جعفر صادق کو گانٹھا۔ اس نے حسب و نسب میں
 ایک یا شاخہ نہ نکالا اور یہ پختہ عقیدہ فرقہ خطا بینہ اور اس کی تمام
 شاخوں کا ہے کہ حقیقی بیٹا روحانی ہے نہ کہ جسمانی، جسمانی تو ایک مرد اور
 عورت کے نکاح کا نتیجہ ہے لیکن ایک معلم جو شاگرد کی تعلیم و تربیت کرتا
 ہے اس پر روشنی سے زیادہ قدر و قیمت رکھتی ہے جو پیام بھی اپنے بچوں
 کی کرتے ہیں۔

نصیر الدین طوسی کا تعلق فرقہ اسماعیلیہ سے ہے وہ لکھتا ہے کہ
 امام کی اولاد چار قسم کی ہے ایک روحانی یا در معنی "جیسے سلاں فارسی کہ انحضرت
 نے اس کے بارہ میں فرمایا "سلاں من اہل بیت" دوسری جسمانی یا شکل میں عمیری
 روحانی لور جسمانی جیسے حسن ابن علی رضی لور روحانی "در حقیقت" جیسے
 امام حسین رضی

رشید الدین ایرانی مؤرخ لکھتا ہے کہ

"امام جعفر صادق نے اسماعیل کے بیٹے محمد یعنی اپنے پوتے کو
 میمون القدر کے پاس طبرستان میں بھیج دیا، میمون کا بیٹا
 عبداللہ تھا۔ اس نے محمد کو اس کی تربیت میں دیا۔ اور عبداللہ
 کو محمد بن اسماعیل کا بیٹا مشہور کیا کہ وہ محمد بن اسماعیل کا علی علیہ
 ہے۔ جب عبداللہ ۱۰۰ برس کا ہوا تو میمون نے اس کی
 امامت کا اعلان کر دیا۔ لہذا کسی شیخ نے اعتراض نہ کیا۔"

اس طرح خلفاء بنو فاطمہ اگر من ولد الصالح ہی تھے مگر بنو فاطمہ

ہی کہلائے۔

طوسی کا ذہن اس حقیقت کی طرف منتقل نہ ہوا کہ اگر اس کا منظر یہ تسلیم کیا جائے تو اصحاب رسول اللہ آنحضرت کے زیر تعلیم و تربیت سب آنحضرت کی اولاد ہی کہلائے۔ اور وہ اس نص قرآنی کا کیا جواب ہے کہ تَمَّا كَانُ مُحَمَّدًا يَا أَحَدَهُمْ لَمْ يَكُنْ آوَرِيهِ كَرَهُ "وَمَا جَعَلَ لِدِينِكُمْ آيَاتٍ كَمَا جَعَلَ لِدِينِكُمْ آيَاتٍ تَوَكَّمْ بِأَفْوَاهِكُمْ وَإِنَّهُ يَقُولُ الْحَقُّ وَهُوَ يَهْدِي السَّبِيلَ ادْعُوهُمْ لِأَسْمَائِهِمْ هُوَ أَقْسَطُ عِنْدَ اللَّهِ، فَإِنْ لَمْ تَعْلَمُوا آبَاءَهُمْ فَاخْتَارُوا فِي الدِّينِ وَمَوْلَاهُمْ هُوَ (پہلے) تمہارے پالک تمہارے بیٹے نہیں ہیں جو ان کو اپنے بیٹے کہتے ہیں یہ ان کی منہ کی بگو اس ہے اور اللہ کا ارشاد سچا ہے اور وہی سید ہے راستہ کی طرف رہنمائی فرماتا ہے ان کو ان کے حقیقی باپوں کے نام سے پکارو، یہ اللہ کے نزدیک صحیح تر ہے اگر تمہیں ان کے باپوں کا علم نہ ہو تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں اور دوست ہیں۔

وہی والدین کی بھی تحقیق ناقص ہے، خلفاء مصر میں سے اکثر بنو فاطمہ ہی تھے۔ علامہ ابن خلکان اور مقرئین، اعدا بن رشید اعدا القلوب جیسے مؤرخین نے ان کے حساباً کو تسلیم کیا ہے لیکن اس میں بھی کچھ کلام نہیں کہ ان میں سے ایسے بھی تھے جو بنو فاطمہ نہ تھے لہٰذا کسی نہ کسی حاکم کی اولاد تھے۔ اعدا اس راز سے صرف یہی لوگ واقف تھے کہ کون صحیح النساب قاطبی ہے لہٰذا کون من ولد الصالح یا کسی اور حاکم بیٹا ہے۔ اسماعیلی عقاید کے مطابق امامت دو قسم کی ہے، ایک اہم متودع اور دوسرا اہم مستقر۔۔۔ دونوں کو امامت کے پورے اختیار حاصل ہیں۔ مگر ان میں فرق یہ ہے کہ اہم مستقر کو یہ اختیار حاصل ہے کہ امامت کے

اختیارات بذریعہ وصیت جسے چاہیے سو نپ دے، امام مستور
 یہ اختیارات اپنی اولاد یا کسی کے نام منتقل نہیں کر سکتا۔ اس کی ضرورت
 اس لیے پیش آئی کہ فرقہ شیعہ امامیہ کے دوازدہ امام تو ہمیشہ امن پسند
 مجاہدین کی لشکر و شجاعت میں مشغول تھے اور سیاسیات سے بالکل کٹ کر رہے۔ اس
 لیے ابو عباس نے جو اس وقت صدر حکومت تھے ان سے تعزین نہ کیا۔ مگر ان پر کسی نگرانی ضرور
 تھی لیکن اسماعیل بن امام جعفر صادق کی اولاد کے حالات مختلف تھے ہم بیان کر چکے ہیں کہ ابو الخطاب
 کے شاگرد میمون القلاح نے محمد بن اسماعیل کو امام جعفر صادق کی وفات کے بعد سیاسیات میں
 الجھایا۔ القلاح نے اپنی اولاد کو بنو فاطمہ اس لیے ظاہر کیا کہ آنحضرتؐ کی تو ان پر آئے گی
 حقیقی بنو فاطمہ تو پتہ نہیں گے۔ فرقہ اسماعیلیہ شرح سے رازداری
 سے کام لیتا رہا اور یہ رازداری آج بھی ویسی ہے۔ بیرونی دنیا کو اس
 رازداری پر پردہ کا علم نہ پہنچتا تھا اور نہ آج ہے۔ ضرورتاً امام ناطقؑ اور
 ہم عصامت کی اصطلاح وضع کی گئی، حقیقی فاطمی امام تو عصامت عرصہ
 تک رہے، ناطق بھی جاننا شروع ہوئے جو نقلی فاطمی تھے۔ حکومت وقت
 ان کو قتل کر کے مطمئن ہو جاتی۔ اور اس پر یہ راز نہ کھلتا کہ اصلی تو پس پردہ
 موجود ہے اور خاموشی سے سرگرم عمل ہے۔ طرفداروں بلکہ جاں نثاریوں
 بنو فاطمہ نے یہ سب سمجھا کر اولاد علیؑ بالخصوص بنو فاطمہ کی جانوں
 کی حفاظت کی جائے اس لیے جب تک عباسیوں کا زور رہا ان کو
 چھپائے رکھا اور خود امامت کے فرض ادا کرتے رہے۔ یہ بھی
 ظاہر ہونے لگا کہ وہ خطابی ہیں یا قلدی، لوگ ان کو فاطمی ہی
 یقین کرتے رہے اس طرح وہ اپنی جاہیں قربان کرتے رہے
 ان کے لیے یہ بڑے فخر کی بات تھی کہ وہ کسی امام غائب یا منتظر کے

ابن "یا اب" ہیں۔ ہمارے موضوع سے یہ بحث خارج ہے۔ عام واقفیت کے لئے ہم نے یہ تاریخی حالات بھی لکھ دیئے ہیں۔

عبداللہ المہدی پہلا فاطمی خلیفہ ہے جو شمالی افریقہ میں اپنی سلطنت قائم کرنے میں کامیاب ہوا۔ اب ہم تیسری صدی ہجری میں داخل ہو گئے۔ اس کا ایک فاطمی ابو عبداللہ حسین کسی وقت بصرہ میں محشوب تھا۔ یہ "شیعہ" کے لقب سے مشہور ہے۔ قبائل بربر میں یہ کام کرتا رہا۔ لوگ اس کے تقدس پر فریفتہ تھے۔ گوشہ خلوت میں مجاہدہ اس حد تک تھا کہ باہر کم نکلتا۔ اس وقت آل اعلیٰ افریقہ میں صاحب حکومت تھے۔ ابو عبداللہ نے کاتی بحصیت فراہم کر لی تھی اور کبھی اس کے منبجین کی جھڑپیں بھی حکومت وقت سے ہو جاتی، آل اعلیٰ نے کوشش تو بہت کی یہ فتنہ دب جائے مگر کامیاب نہ ہوئے آخری اعلیٰ حکمران زیارت اللہ نے کھلے میدان میں حکمت کھائی اور طرابلس کی طرف بھاگ گیا۔ اعلیٰ مقبوضات پر ابو عبداللہ کا قبضہ ہو گیا۔ یہ پہلے ہی اعلان کر چکا تھا کہ اہم مکتوم یا غائب کے ظہور کا وقت آ گیا ہے اپنے خاص مصاحبین کے ذریعہ عبداللہ کو دعوت دی۔ تاجر کے لباس میں یہ سب افریقہ میں وارد ہوئے، عباہیوں نے یہ بھی اڑتی سی خبر سن لی۔ اور والیوں کے نام عیباللہ کا حلیہ لکھ کر احکام صادر کر دیے کہ جہاں ملے گرفتار کیا جائے۔ ایک دفعہ گرفتار بھی ہوا مگر ابو عبداللہ غافل نہ تھا، صاف بچا کر نکال لایا۔

ابو عبداللہ نے عیباللہ کا جلوس نکالا۔ آگے آگے آپ تھا اور بھرائی ہوئی آواز میں اعلان کر رہا تھا کہ ابھی ملج دیکھ تو یہی تمہارا

آنا نہیں موعود» اور آتا ہے، روتا جاتا تھا اور یہی فقرہ بار بار دہراتا
 عبداللہ کی خلافت اعلیٰ مقبوضات پر باستقلال قائم ہو گئی بحوالہ شام
 (روم) کے بوزار اور صقلیہ (سسیلی) میں بھی اس کی حکومت تسلیم
 کی گئی۔ اس وقت تک مدارالیم ابو عبداللہ اور اس کا بھائی
 ابو العباس تھے۔ مگر اب عبید اللہ نے عنان خلافت اپنے ہاتھ
 میں لے کر ان کے اختیارات سلب کر لیے۔ وہ اس وقت
 تک اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ اہم عموماً صامت ہی ہوتا ہے
 ناطق اور ہی ہوتے ہیں۔ جب ان کا ناطق بند ہوا تو علم بغاوت
 بتدیکہ۔ اور عبید اللہ کے قتل کا منصوبہ باندھا۔ لیکن عبید اللہ
 نے انہیں گرفتار کر کے قتل کر دیا۔ اور ان کا انجام بھی ابو مسلم
 خراسانی کی طرح ہوا۔

مصر کے سوا تمام شمالی افریقہ عبید اللہ کے قبضہ میں آ گیا۔
 اس نے سمند کے کنارہ مہدیہ» بسایا جو اس کا دار الخلافت قرار
 پایا۔ چوبیس برس سلطنت کے بعد ۲۱۸ھ میں فوت ہوا۔
 اس کا شجرہ نسب حسب ذیل ہے۔

امام جعفر صادق

موسى کاظم

اسماعیل

محمد المکتم

جعفر مصدق

عبد الجبیب

عبید اللہ المہدی (۲۹۶ھ / ۶۹۰ھ)

القاسم ابوالقاسم (۲۲۲ھ / ۶۳۳ھ)

المنصور (۲۲۲ھ / ۶۳۳ھ)

المغیر الدین اللہ (۲۲۲ھ / ۶۳۳ھ)

العزیز مابعد (۲۶۵ھ / ۶۷۵ھ)

الحکم بامر اللہ (۲۸۶ھ / ۶۹۶ھ)

الظاہر لاعزاز الدین اللہ (۳۱۰ھ / ۷۲۰ھ)

المتصر باللہ (۳۲۴ھ / ۷۳۵ھ)

ابوالقاسم احمد

الحافظ الدین اللہ (۵۲۲ھ / ۱۱۲۳ھ)

المعتلى باللہ (۳۸۶ھ / ۶۱۰ھ)

الامر باحكام اللہ (۳۹۵ھ / ۱۱۰۵ھ)

الظافر بامر اللہ (۵۲۲ھ / ۱۱۲۳ھ) يوسف

القاسم بن نصر اللہ (۵۲۹ھ / ۱۱۳۰ھ) العاصم الدین اللہ (۵۲۲ھ / ۱۱۲۳ھ)

سلطان صلاح الدین ایوبی نے آخری فاطمی خلیفہ العاصم کی وفات

کے بعد پھر سے عباسی خلافت مصر میں قائم کر دی اگرچہ یہ بھی چند روزہ
ی تھی۔

اب "ہدی" کا تصور کم از کم ایرانی ذہنیت میں بالکل واضح تھا۔
امامیہ تو محمد المہدی امام غائب کے منتظر رہے اور ہیں مگر اس کا قاعدہ
دوسرے مدعیان ہدویت نے خاطر خواہ اٹھایا۔ ہم بیان کر چکے ہیں
کہ عرب کی حدود میں تو کسی نے دعویٰ ہدویت نہ کیا۔ لیکن ایرانی بنو ہاشم
کے کسی نہ کسی دعویدار خلافت کو اسی صورت میں پیش کرتے رہے
جو کامیاب نہ ہوئے۔ شمالی افریقہ کی زمین نے ہدویت کا شکوہ
کھلایا۔ عبداللہ المہدی کے حالات جہاں تک ہمارے موضوع کا تعلق
ہے ہم لکھ چکے ہیں۔ ایک اور "ہدی" کا ذکر خیر اس مقام پر مناسب
ہے، اس کا ظہور بھی افریقہ میں ہوا۔ افریقہ میں عقیدہ ہدویت
کچھ ایسا پختہ ہو چکا تھا کہ ہمارے زمانہ میں بھی "سوڈان" سے ہدی
اٹھا مگر اس کا ذکر ہم سردست نہیں کرتے۔

ہم تین صدیاں اور پیچھے پھوڑ آئے ہیں جس میں قابل ذکر ہدی
نہیں ہوا۔ چھٹی صدی ہجری میں شمالی افریقہ اور ہسپانیہ میں "مرا بطین" کی
حکومت تھی جو ۱۱۷ھ تک قائم رہی، ان ایام میں ایک شخص محمد بن
عبداللہ بن تو مرث علی مغربی افریقہ کے شہر "سومن" کے باشندہ کو
تحصیل علم کا شوق علاء اسلام کی صحبت میں لے گیا۔ یاد رہے کہ
بنو قاطر حضرت علی اور قاطر زہرا کی اولاد میں اور علوی حضرت علی کی دوسری
ازواج کی اولاد میں یہ شخص امام محمد الغزالی کی خدمت میں بھی کچھ عرصہ
رہا۔ فارغ التحصیل ہو کر وطن کی طرف مراجعت کی عیش پرست علماء اور

صاحبان حکومت کے خلاف وعظ کرتا رہا۔ اور ان جھلا کے خلاف جو اولیاء اللہ کی قبور کا بھی احترام کرتے ہیں ایک تحریک شروع کر دی اس لیے اس کے متبعین کو لوگوں نے "موحدین" کا امتیازی لقب دیا۔ یہ شخص احادیث کا بہت بڑا عالم تھا۔ اس نے دعویٰ کیا کہ احادیث میں جس مہدی کے ظہور کا ذکر ہے وہ میں ہوں۔ لوگ اس کے گرد پرواز وار جمع ہوسے پہلے ہی اس کے زہد و تقویٰ کے گردیدہ بہت تھے۔ بالخصوص بربری اقوام تو اسی کے ہورہے۔ اس کا پہلا مقابلہ مراہطیس سے ہوا۔ افریقہ میں ان کی حکومت کا خاتمہ کر کے مراقش پر قابض ہو گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ خواہ غلطی خوردہ ہو نیت نیک تھی۔ اس نے ایک تاجر کے لڑکے عبدالملک کو اپنی فوج کا سپہ سالار اور اپنا جالیٹین نامزد کیا۔ اس نے ہسپانیہ میں بھی "موحدین" کی حکومت قائم کر دی۔ ۱۱۷۱ء میں اس کا انتقال ہو گیا موحدین کی حکومت ۱۲۲۸ء تک قائم رہی۔

مہدی تو لود بھی لند میں اذغالیا یہ سلسلہ تاجہاں باقیست جاری رہے گا۔ ہم نے صوت چند مشہور شخصیتوں کا ذکر کیا ہے اس سے پیشتر کہ ہم اپنے انتخاب کردہ مہدی کے حالات یہاں بیان کریں تاہم رام کے فائدہ کے لیے علم النفس کا ایک اہم مسئلہ جس سے جہودیت کی حقیقت بھی کسی حد تک واضح ہو جاتی ہے بیان کرتے ہیں۔ ہم بیان کر آئے ہیں کہ ائم سابقین سے آئیہ میں تنازع اور حلول اور آمد ثانی کا عقیدہ غالباً تاریخی زمانہ سے بھی پہلے کا پختہ ہو چکا ہے۔ یہ مسلمان ہونے تو اس عقیدہ کو محترم کر سکے۔ لہذا یہ عقیدہ آج بھی ایرانی ذہنیت میں اتنا راسخ ہے کہ مٹانے سے نہیں مٹ سکتا۔ اگر یہ لوگ اپنے دیوتاؤں لہذا لو تاروں تک ہی اسے محدود رکھتے تو آج ہمیں تاریخ "جہودیت" کہنے

کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ مسلمان ہونے تو بنو ہاشم میں سے دعویٰ رکھنے
 خلافت کو بھی اسی رنگ میں دیکھا یا پیش کیا۔ نفسیات کا یہ اہم مسئلہ
 ہے کہ جب کئی عقیدہ کسی قوم یا جماعت میں پختہ ہو جاتا ہے اور صد ہا سال
 سے وراثت میں منتقل ہوتا رہتا ہے تو روح اجتماع کی صورت
 اختیار کر لیتا ہے۔ یہ قوم یا جماعت ہر ایک واقعہ کو بالخصوص
 ایسے واقعات کو جو کسی وجہ سے جازب توجہ ہوتے ہیں اسی عقیدہ
 کے رنگ میں دیکھتی ہے۔ پیدل عقیدہ تنازع پر بحث کرنا ہوا
 مثنوی عرفان میں لکھتا ہے کہ

ای دولت کارخانہ نیرنگ تیرا دل کارخانہ نیرنگ ہے
 غنچرات گل فروش چندیں رنگ تیرا غنچہ دل کتنی رنگینوں کی گل فروش کر رہا ہے
 پیچ گل زیں بہار رنگ بست جو بھی خیال یا تصور میں پیدا ہوتا ہے اگر چہ
 کہ براہ شعور رنگ نہ لبست بہار فطرت کا حسین رنگین پھول ہی ہوتا ہے
 اور امور نہیں ہیں، اس رنگ خار سے پار شعور
 قدم قدم پر ٹھوکر کھاتا ہے، غرض ظہور تو یہ
 ہے کہ ہر ایک شے کو اس کے اصلی رنگ
 میں دیکھا جائے یعنی مشاہدہ سچی ہو۔

اصل برحق و باطل است یکے سے ہم سق و باطل سے تعبیر کرتے ہیں اور
 جادہ بسیار و منزل است یکے اور ان میں امتیاز پیدا کرتے ہیں دونوں کی
 اصل ایک ہی حقیقت ہے۔ اور یہی اصل
 منزل ہے اس منزل کی طرف بے شمار

راستے جلتے ہیں۔ اور راہرو جو بھی راستے
اختیار کرتا ہے سچی ہی سمجھتا ہے اور دوسرا
دوسرے راستے کو سچی کہتا ہے اور دوسرے
راستوں کو باطل قرار دیتا ہے۔

یہ سب راستے ہی ہیں۔ منزل نہیں ہیں۔ لیکن
راہرو میں اتنا شعور نہیں کہ سمجھے راستہ اور
منزل میں ماہر الامتیاز کیا ہے، اس لیے
جادو اور منزل میں فرق نہیں کرتا۔ راستہ
ہی کو منزل تصور کرتا ہے۔

راستہ گذرگاہ ہوتا ہے۔ جسے عبور کر کے
پہرہ منزل پر پہنچنے کی کوشش کرتا ہے
اس لیے تمام راستے جو منزل مقصود کی طرف
جاتے ہیں عبرت میں ٹھہرنے کا مقام نہیں
ہیں۔

اگر اس جہان ظہور میں "تنا سخی" ہی اصل
منزل ہوتی تو یہ حقیقت ہوتی۔ جو بدل نہیں
سکتی۔ اس لیے ہر ایک قوم کا یہی عقیدہ
ہوتا اور ایک قوم کے آئینہ عقاید میں
یہی صورت نظر آتی۔

اس آغا گوئی درخت سے جو کچھ پھل حاصل ہو
سکتا۔ بیج ہندوستان کی زمین ہی میں لویا

ایں ہمہ جادو است منزل نیست
پیک رہرو تمیز و قابل نیست

اگر ایں عبرت تنا سخی خام
در جہاں ظہور بودے نام

قوم دیگر ہم از وقوع خیال
کی شد آئینہ دار ایں تمثال

ایں نہال آنچہ بر فراشتہ اند
در زمین مال ہند کاشتہ اند

گیا ہے اور یہاں کے لوگ "پورا ہی" بیوگنا
جانتے ہیں۔

دوسری قوموں میں خواہ جاہل ہو یا عالم، ہیشیا
ہو یا غافل کوئی بھی اس سے آگاہ نہیں
تو یہی ہی اس عقیدہ سے واقف ہے
اور نہ یہودیوں کے ذہن میں یہ بات کبھی آتی ہے
یہودیوں کے نفوس میں اگر کسی شے کا نفوذ
تو وہ توراہ ہی کے احکام ہیں اور بس۔

نصاری کے عقاید میں بھی وہی بات مشاہدہ
ہوتی ہے جو حضرت عیسیٰ کے ارشادات ہیں
جو کچھ ان کے انبیاء یارشی منی یعنی انسان کامل
نے انکو درس دیا اسے ہی سبق علم ازبر کیا۔
جب تک عقاید کی پردہ دی نہیں ہوتی

بدہن کو کعبہ خواب میں بھی دکھائی نہیں دیتا
جب سے مسلمان دین کے مدارج سے واقف
ہوئے "کاشی" کے خیال سے بے پروا ہو گئے۔

قرآن میں انبیاء کے قصے جو کبھی مذکور ہیں
ان سے وید شاستر والے محض جاہل ہیں۔
شاستروں میں جو دیوتاؤں کے حالات
لکھے ہیں ان سے مسلمان بے خبر ہیں

ازگردھے وگر بریں آثار

نیت آگاہ نختہ تا بیدار

نہ نصاریٰ است زین مقام آگاہ

نہ خیال یہود وارد راہ

در مزاج یہود اگر ساریست

حکم توراہ یک قلم جارلیست

وز نصاریٰ نمی شود امت شہود

جز خیالے کہ عیشیں فرمود

ہر یکے راز درس قابل خویش

سبق علم بر دولت بر پیش

تا عقاید حجاب را ندید

برہمن کعبہ را بخواب ندید

تا مسلمان مدارج دین خواند

بے خیال از کاشی مساند

قصص انبیائی فرغانی

بیدیاں راست محض تا ذاتی

حالت دیوتائی شاستری

مسلمیں را گواہ بے خبری

ان دیوتاؤں کی حقیقت کے بارہ میں کا حد علم
جو اللہ کا پیغام لے کر آیا یعنی آنحضرتؐ
نے مسالوں کو کوئی پیام نہیں دیا بلکہ تردید کی۔
تناسخ کا عقیدہ امت محمدیہ میں نہیں ہے
مقبول بارگاہ الہی کی بزم میں کسی مرتد
کے لیے کوئی جگہ نہیں۔

اس رسول امین رحمۃ اللعین نے سب کو
اعمال کی جزا و سزا کا وقت موعود قیامت
کا دن بتایا۔

مسلمان کے ذہن میں قیامت کا نقش آنا
گہرا ہے کہ جو کچھ ان کے سامنے ظہور میں
آتا ہے اس کی دور بینی اس میں قیامت
کا جلوہ ہی دیکھتی ہے۔

ہر ایک مومن مسلمان کا ایمان اس پر
پختہ ہے کہ اعمال کی جزا و سزا کا مقام
عزات ہے۔

اگر اس دنیا میں کسی ناشائستہ عمل کا نتیجہ مشاہد
کرتے ہیں تو اپنے آپ کو اسی حشر ہی میں دیکھتے ہیں۔
رحمت اللعین کے ارشاد کے مطابق جو علم ہمیں
حاصل ہوا ہے اس نے ہمیں توہمات کی بھول بھلیوں
میں سرگردانی سے بچا لیا۔

زیر حقیقت بزمہ اسلام
زیر سائید پیک علم پیام

نسخ در امت محمد نیت
بزم مقبول جائے مرتد نیت

خال وفا جو ہر کرم بنیاد
ہمہ را وعدہ قیامت داد

بر مسلمان ز نکر و در اندیش
اگر آید قیامت آید پیش

مومنان را ظہور این آیات
نبود جز بموقف عرفات

گر مکاتائے از عمل بیند
خولش را ہم در او محل بیند
علم ما را بکلم رحمت فرد
متلانی خیال وہم نہ کرد

اہل اسلام بر کجا زادند۔ مسلمان خواہ کہیں پیدا ہو ان تو ہمت
زین خیالات فارغ افتادند۔ سے بے نیاز ہیں۔

عقیدہ اور شے ہے اور علم اور چیز ہے۔ ہم بیان کر چکے ہیں
جب کوئی پختہ عقیدہ دراشت میں منتقل ہوتا ہے خواہ کیسا ہی
نامعقول ہو لوگ اسے علم کا درجہ دیتے ہیں لیکن اس کے
علاوہ ایک اور بات بھی ہے۔ کسی ایک شخص کا تصور خواہ محض
وہم ہو اگر اسے یقین ہے کہ یہ حق ہے تو اور اشخاص اس سے متاثر
ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے، یہ دراصل قوت "یقین" کا اثر ہے۔

اتنی صدیوں سے مہدی کی آمد کا ڈھنڈورا پیٹا جا رہا تھا۔ باوجود
اس حقیقت کے کہ مہدی آئے اور گزر گئے یہ عقیدہ متزلزل نہ ہوا
اور آج بھی اپنی پوزی شان میں مشاہدہ ہو سکتا ہے، اس کی ایک
ہی وجہ ہے کہ یہ عقیدہ اب قومی دراشت ہو چکا ہے اور جو بھی
اس دراشت کے نبھانے والا کھڑا ہوا اگر ساری قوم نہیں تو ایک جماعت
نے اس کا دعویٰ ضرور تسلیم کیا۔ اور یا تو اس کی آمد ثانی کے انتظار
میں ہے یا ایک نئے مذہب یا فرقہ کو اس سے فسوپ کرتے
ہوئے اس کا نام زندہ رکھتی ہے۔ بیدل کہتا ہے کہ

باز آمدن مسیح و مہدی این جا۔ از تجرہ مزاج اعیال و دراست
لیکن برہان عقیدہ کو کون سنتا ہے۔ علم آزادی فکر سے حاصل
ہوتا ہے۔ لیکن عقیدہ قوت فکر کو جکڑ رکھتا ہے۔ اور یہ بیدل
ہو کر رہ جاتی ہے اس عالم گیر مدار میں زیادہ عقاید ہی کی جھک ہے
اور ہر ایک شخص اسے بزور منہانا چاہتا ہے۔ اصل منزل سے اکثریت دور ہی نہیں بلکہ
بھٹک رہی ہے۔

سلمان فارسی

سلمان فارسی کے بارہ میں روایات میں سخت اختلاف ہے۔ ابن اثیر "سیرۃ النبی" میں اس کو بھی اصحاب رسول اللہ کے زمرہ میں ذکر کرتا ہے۔ روایت یہ ہے کہ اس کی عمر چھ سو سال تھی جب آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس نے اگر حضرت علیؑ کو نہیں دیکھا لیکن سواروں کا زمانہ پایا۔ اور انجیل کی بشارت دوبارہ بعثت رسول منظم کا اسے ظلم تھا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ آنحضرتؐ کا ظہور کجوروں والے شہر میں سے ہوگا۔ چنانچہ وہ آنحضرتؐ کی بعثت کا منتظر رہا۔ سواریان مسیح کے بعد وہ ہر ایک صدی میں ایسا ہوا۔ مشائخ اور رہبانوں کی خدمت میں رہا جب ایک راہب فوت ہو جاتا تو حسب وصیت اس راہب متوفی وہ سرے راہب کی خدمت میں رہتا، وہ بھی آنحضرتؐ کی بعثت کے منتظر تھے۔ مولانا عبدالحلیم شرر نے اپنے ناول "جو یاسے سہی" میں یہی روایات بیان کی ہیں۔ آخر سلمان بحالت غلامی ایک یہودی سوداگر کے ہاتھ پڑا۔ اس کی رہائش "یثرب" کے مصنفات میں تھی۔ یثرب آنحضرتؐ کی مناسبت سے اب

مدینہ النبیؐ سے موسم ہے۔ کچھ عرصہ بعد آنحضرتؐ نے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی سلمان تو کئی صدیاں اسی انتظار میں تھا۔ شہرہ سنا تو خدمت میں حاضر ہوا۔ آنحضرتؐ نے یہودی کی غلامی سے روپیہ دے کر آزاد کرایا۔

ایک اور روایت یہ ہے کہ جب کفار مکہ نے دیگر حلیف قبائل کی مدد سے دس ہزار کی جمعیت کے ساتھ مدینہ منورہ کو محاصرہ میں لے لیا۔ تو سلمان ہی نے تجویز خندق «کھودنے کی باتی» چنانچہ خندق اسی کی زیر نگرانی کھودی گئی اور محاصرین شہر میں داخل نہ ہو سکے۔ قرآن میں رغز وہ «احزاب» اور روایات میں غزوة خندق کے نام سے موسوم ہے اس سے پیشتر عرب اس فن حرب سے واقف نہ تھے۔ چنانچہ محاصرین کہتے کہ محمدؐ نے حرب میں یہ بدعت اختراع کی ہے۔

ایک اور روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے ہجرت کے بعد جہا جہا اور انصار مدینہ میں مواخاة «قائم کی سلمان فارسی نہ تو جہا جہا تھے اور نہ انصار کے زمرہ میں آتے اس لیے یہ اکیلے رہ گئے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ سلمان من اہل بیتی۔ عربی محاورہ کے مطابق اس کا اردو میں ترجمہ یہ ہوا کہ سلمان میرے گھر والوں میں سے ہے اور لسان قرآن میں بھی «اہل بیت» کا یہی مفہوم ہے۔ لیکن عجمی لقب میں اہل بیت سے «بیچ تن» یعنی آنحضرتؐ اور حضرت علیؑ اور حضرت فاطمہؑ الزہراءؑ اور امام حسنؑ اور حسینؑ بن مراد ہیں یا اس معنی میں سلمان پچھتا تن «ہوے۔» ایک اور روایت ہے کہ آیہ کریمہ نازل ہوئی کہ

والآخرین منهم لایلحقوا بہم و ہوالعزیز الحکیم ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء وہو غنی العظیم
 اور دوسرے لوگوں کو بھی اللہ کی آیات سنا تا ہے اور پاک کرتا ہے جو ابھی تک
 ظاہر گمراہی میں ہیں جو ابھی تک ان سے ملحق نہیں ہوئے۔ اور اللہ غالب
 حکمت والا ہے، یہ ہے فضل اللہ کا جسے چاہے عنایت فرماتا ہے اور
 فضل عظیم کا مالک ہے، تو اصحاب رسول کریم نے دریافت کیا کہ وہ کون
 خوش نصیب لوگ ہیں جو ہم سے بعد میں آکر ملحق ہوں گے۔ آنحضرتؐ
 نے سلمان فارسی کے زانو پر ہاتھ مار کر فرمایا کہ اس کی قوم کے لوگ ہیں۔
 اور ان میں سے ایک شخص کا ظہور ہوگا جو ایمان کو اگر ٹریا میں ہوگا۔
 یا فری میں لے آئے گا۔

اس روایت سے دو باتیں بالکل واضح ہیں ایک تو ایرانیوں کی
 فضیلت عربوں پر، کیونکہ آیات میں لفظ فضل استعمال ہوا ہے۔ دوسرے
 ایک شخصیت کا ظہور جو علم و فضل میں سب سے بڑھ کر ہوگا۔ اور یہ ایرانی ہے
 روایات اور بھی ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ حضرت علیؑ
 کے سلمانؓ خاص منظور تھے۔ آپ نے انہیں کوفہ یا بصرہ یا ایران کے کسی
 صوبہ کا عالی بھی مقرر فرمایا تھا۔ اور ایک دفعہ شیر کے پنجے سے کسی جنگل
 میں پھڑایا تھا چنانچہ جب ہمایوں پسر بابر بادشاہ بصرہ کے مقابلہ
 میں شکست کھا کر صفوی شاہ ایران کے ہاں بخرمن امداد آیا تو اس واقعہ
 کا اشارہ کیا جو ایک قطعہ میں لکھ کر شاہ کی خدمت میں پیش کیا۔
 دقت شیر است و عمری پشت بر من کردہ است جانے از کیس دعوات روئے با من کردہ است
 آتھاس از شاہ دارم کہ با من آں کتہد آنچه با سلاں علی وردشت ارزن کردہ است
 روایات تو ہم نے بالاخصصار بیان کر دی ہیں، یہ فیصلہ اب کار میں کرام

خود کہہ سکتے ہیں کہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شخصیت تاریخ اور روایات میں گم ہو کر رہ گئی ہے۔ لیکن اگر حقائق کو حقائق کی حیثیت سے دیکھا جائے تو اس سلسلہ میں بعض گھنٹیاں ایسی ہیں جن کا سلجھانا آسان نہیں نظر آتا۔ ایران اور عرب کا تصادم خلافتِ راشدہ کے دور میں ہوا، خاص طور پر عہد ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ و حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں۔ بلاشبہ عہد حضرت عمر رضی اللہ عنہ میں ایرانی مدینہ میں نظر آتے ہیں، لیکن اس سے پیشتر کسی ایرانی کی مدینہ شریف میں رہائش کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ملتا۔ لیکن یہ تو عام بات ہوئی، حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کا جہاں تک تعلق ہے، نہ ان کے وجود سے انکار کیا جاسکتا ہے نہ ان کی تاریخی شخصیت سے، نہ ان کے قیام مدینہ سے۔ جس طرح عہد رسالت میں ان کا نام ہمیں نظر آتا ہے، اسی طرح عہد حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں بھی وہ نمایاں نظر آتے ہیں۔ بہر حال یہ ایک ایسا موضوع ہے جس پر تفصیل سے اس موقع پر گفتگو نہیں کی جاسکتی اس کے لئے ایک الگ مجلس جمانی پڑے گی۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرات شیعہ امامیہ نے سلمان کو وہ حیثیت کبھی نہیں دی جو مدعیان نبوت و مہدویت نے روایات و حکایات کی بنا پر اپنے مفاد کے لیے جائز سمجھی۔ شیعہ امامیہ اپنے بارہویں امام محمد المہدی کی آمد ثانی کا انتظار کر رہے ہیں۔ اور جب تک یہ انتظار باقی

ہے۔ وہ کسی اور شخص کے دعویٰ نبوت و جہودیت کو تسلیم نہیں کر سکتے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ اہل سنت و الجماعت بالخصوص اہل حدیث جہدی کے منتظر ہیں۔ لیکن ان میں ظہور جہدی کے بارہ میں اختلاف ہے۔ بعض جو شیعوں یا امید کے زیر اثر ہیں امام محمد الجہدی ابن امام حسن عسکریؑ کی آمد ثانی کے منتظر ہیں۔ اور بعض کسی اور شخص کے ظہور کا انتظار کر رہے ہیں جس کا حلیہ احادیث میں مذکور ہے۔ لیکن اس کے ساتھ نزول عیسائے بھی تسلیم کرتے ہیں اور حضرت عیسائے کے بارہ میں ان کا وہی عقیدہ ہے جو مسیحی دنیا کا ہے کہ آپ زندہ آسمان پر اٹھائے گئے۔ اور کسی مناسب وقت دمشق کے جامعہ کے منارہ مشرقی پر اتریں گے۔ لیکن ان میں سے ایک جماعت ایسی بھی ہے جو ان احادیث کو موضوع قرار دیتی ہے جس میں جہدی کے ظہور کا مذکور ہے۔ جیسا کہ علامہ ابن خلدون نے "مقدمہ" میں اس پر شرح و بسط کے ساتھ تنقید کی ہے اور اصول حدیث کے رو سے تمام روایتوں کی تنقیح کر کے غلط بتایا ہے۔ سرسید احمد خاں غفرلہ نے اسی تحقیق سے فائدہ اٹھا کر "جہدی آخر الزماں" کے عنوان سے "تہذیب الاخلاق" میں ایک مفصل مقالہ لکھا اور ان تمام احادیث کو سخت مجروح کیا۔

اگرچہ تمام مدعیان جہودیت جو تاریخی شخصیتیں ہیں زیادہ تر سیاسیات میں الجھی رہیں اور اس عقیدہ کا خاطر خواہ فائدہ اٹھایا۔ لیکن ایک شخصیت جس کا ہم نے انتخاب کیا ہے کبھی دنیوی مفاد کے لیے اس دعویٰ کے ساتھ کٹری نہیں ہوئی۔

سید محمد جو پوری اگر چاہتا تو کسی ریاست کا خود مختار سلطان ہو
 سکتا تھا۔ مگر اس نے ہمیشہ دنیوی جاہ و شہرت کو پائے استعمار
 سے ٹھکرا دیا۔ " دنیا بجاۃ تکبر زدہ او زوہ درت پا " اس کے
 حالات سے واضح ہو جائے گا کہ اس کا مقصد کیا ہے۔

سید محمد چوہدری

رحمت اللہ علیہ!

سید محمد جس کے حالات ہم نکلے رہے ہیں جو پور میں پیدا ہوا اس وقت دہلی میں خاندان تغلق رو بزدال تھا۔ دکن میں بہمنیہ کا ستارہ عروج پر تھا۔ گجرات میں سلطان محمود بیکہ حکمران تھا۔ سلطان حسین دانا پور میں والی ریاست تھا جس کی حدود میں قصبہ جو پور واقع تھا۔ سلطان اور اس کی ریاست ہندو راجہ دلیپ رائے کی باجگذار تھی ان ایام میں ہندوستان ہندو راجاؤں اور مسلمان نوابوں کی ریاستوں ہی میں تقسیم تھا۔ جن میں اقتدار یا ہوس ملک گیری کے لیے آتش جنگ مشتعل رہی۔

سید محمد چار سال کا بچہ تھا کہ باپ شیخ وانیال کی خدمت میں لے کر حاضر ہوا۔ رسم تسمیہ خوانی ادا ہوئی تو اسٹراف داعیان جو پور کو پر تکلف دعوت علی سات سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کیا۔ بارہ سال کی عمر میں علوم و سیر مروجہ سے فراغت حاصل کی، اس چھوٹی عمر میں یہ حال تھا کہ بڑے بوڑھے اس کی بائیں سن کر دنگ رہ جاتے۔ موشگافی اور حقائق عقلیہ میں اور مجادلہ اور مباحثہ میں شیر تھا۔

شیخ و اینال اسے اسد العلماء کہتے علوم ظاہری سے کچھ تسلی نہ ہوئی
 تو سلسلہ چشتیہ میں شیخ و اینال ہی کے دست حق پرست پر بیعت
 کی۔ جوانی کا عالم تھا ظاہر تو علوم مروجہ سے آراستہ ہی تھا اب تصوف
 اور زہد و تقویٰ سے باطن پر راستہ ہو گیا۔ یعنی نور علی نور ہو گیا۔ شیخ
 نے فرقہ خلافت عطا فرمایا تو مرید کثرت سے حلقہ ارادت میں داخل
 ہونے لگے۔ تقوٰیٰ نے عرصہ میں تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی۔ جوانی
 میں بزرگی کا شہرہ دور و نزدیک ہو گیا۔ سید یا تو گوشہ خلوت
 میں ذکر و فکر میں مشغول رہتا یا مجلس و عہد گرم رکھتا۔ کچھ ایسی قوت
 متعاطیسی اس میں تھی کہ ہر ایک شخص جو نام سنا خود بخود کھچا چلا آنا
 مجلس و عہد میں حاضرین دم بخود۔ بیٹھے رہتے اور اہل دل و جد میں آجاتے۔
 سید کی بزرگی کا شہرہ سلطان حسین کے کالوں تک بھی پہنچا۔ امیر خسرو
 کے بعد سلطان علم موسیقی میں بھی ماہر تھا۔ کئی راگنیاں ایجاد لیں۔
 ان میں سے "سورپوری" اور گور سارنگ آج بھی ہندوستانی ماہران فن
 کی محبوب راگنی ہے۔ اور اکثر گائی جاتی ہے۔ ایک روز سیر و شکار
 کے بہانہ سے سورپور میں وارد ہوا۔ اور سید کی درگاہ پر حاضر ہوا۔
 اصل غرض تو یہی تھی۔ اور یہیں کا ہور ہا۔ حلقہ مریداں با صفا میں داخل
 کے بعد چند روز سید کی خدمت میں رہ کر عرض کی کہ مجھ خادم کی دل
 آزادی ہے کہ آپ کے قدموں میں پڑا ہوں۔ میری سعادت داریں اسی
 میں ہے۔ لیکن کاروبار سلطنت ناممکن ہو جائے گا۔ چونکہ آپ سے
 مفارقت بھی گوارا نہیں کر سکتا اس لیے یا تو ارشاد فرمائیں کہ انتظام
 سلطنت کسی اور کے سپرد کروں اور خود خدمت والد میں حاضر رہوں۔

یا آپ میرے ہمراہ رہیں۔ سید نے آخر الذکر درخواست منظور فرمائی
اس کے بعد سلطان کے ہمراہ رہا۔

کچھ عرصہ اسی طرح گزر گیا۔ اس اثنا میں سید کو قرب و جوار کے
شہروں میں داعظ کا اچھا موقع مل گیا یہ سلطان کی حدود میں پابند نہ تھا۔
ریاست کے باہر بھی کبھی کبھی جاتا اور جہاں جاتا وہاں کے لوگ اکثر
حلقہ ارادت میں داخل ہوتے۔ سید کے ہمراہ کچھ مرید بھی ہمیشہ رہتے
ایک روز سید ولیپ رائے کی راجدھانی میں آدھکا، سید نہ صرف
مسلمانوں ہی کو راہ ہدایت پر رہنمائی کر رہا تھا۔ بلکہ اس کی زیادہ تر
توجہ ہندوؤں میں اشاعت اسلام کی طرف رہی۔

ولیپ رائے ایک بہادر راجہ تھا۔ یہ زمانہ ہی ایسا تھا کہ کوئی
والی ریاست چین سے زندگی بسر نہیں کر سکتا تھا۔ اسے بھی اُسے
دن اندوتی فرخشوں اور بیرونی حملوں کا دھڑکا لگا رہتا۔ وہ اعلیٰ پایہ
کا منتظم بھی تھا اور اکثر اپنی ریاست کے طول و عرض میں دورہ کرتا ہوا
نظر آتا۔ اس وقت ہندو مذاہب توجہ شمار تھے مگر سب بت
پرست تھے۔ ولیپ رائے بھی اسی زمرہ میں داخل تھا۔ ان ریاستوں
میں جہاں ہندو راجے راج کرتے تھے بت پرستی کا بازار خوب گرم تھا
ولیپ رائے جتنا اپنے مذہب میں پکا تھا اتنا ہی اسے بت شکن
مسلمانوں سے نفرت تھی مگر یہ اس کا اعلیٰ سیاسی تدبیر تھا کہ اگرچہ
اس کی راج دہانی میں مسلمانوں کی تعداد نسبتاً بہت کم تھی مگر اس نے
مسلمانوں کو کبھی شکایت کا موقع نہ دیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ
اس کے گرد پیش مسلمان نوابوں کی ریاستیں تھیں۔ اگرچہ عموماً خانہ جنگی میں

ہینڈا رہتے مگر جب کبھی کسی مسلمان نواب کی لڑائی کسی ہندو راجہ سے
 پھڑ جاتی تو یہ ایک دوسرے کی مدد بھی کرتے۔ ہندوں میں اشاعت
 مذہب تو ممنوع ہے۔ یہ ان کا قومی دھرم ہے اور غیر قوم کا آدمی
 اس میں شامل نہیں ہو سکتا۔ مسلمان ریاستوں میں ہندو برطیب خاطر اسلام
 قبول کر رہے تھے مگر دلپ رائے کی ریاست میں شاید ہی کوئی ہندو
 اسلام کے انخوش میں آتا۔ سید محمد نے اس کی بساط الٹ دی۔ غالباً
 سید پہلا مبلغ اسلام اور داعظ تھا جس نے دلپ رائے کی راجدہانی
 گوڑ میں دلیرانہ قدم رکھا اور سلسلہ وعظ شروع کر دیا۔ یہاں کوئی مسلمان
 نہ تھا جو سید کے حلقہ ارادت میں داخل نہ ہوا ہو۔ ہندو اگرچہ پنڈتوں
 کے مشورہ کے مطابق دور دور ہی رہے مگر جو آجاتا وہ اسلام قبول کر کے
 ہی جاتا۔ برادری سے خارج ہوتا تو مسلمانوں سے رشتہ اخوت جوڑتا
 یہ وقت نہ صرف دلپ رائے کے لیے انتہائی پریشان کن تھا بلکہ سید
 بھی مطمئن نہ تھا۔ سید چاہتا تھا کہ اس کی مجلس وعظ میں ہندو کثرت
 سے شریک ہوں، اودیر نہ ہوا۔ چند روزہ قیام کے بعد یہ پھر سلطان
 حسین کے پاس آیا۔

اس وقت سید کا واحد مقصد زندگی یہ تھا کہ تمام ہندوستان
 بت پرستی کی آلائش سے پاک ہو۔ اس لیے اس نے اب اپنے مبلغ
 بالخصوص ہندو ریاستوں میں بھیجنے شروع کر دیے۔ یہ ایک جماعت تھی
 جس کی تربیت سید کے زیر تعلیم ہوئی۔ اس کو فوج تہریاں سے موسوم
 کیا گیا۔ اس کے ساتھ سید نے ہندو راجوں کو دعوت اسلام کے نامے
 لکھے، ایک پیام دلپ رائے کے نام بھی آیا۔ دلپ رائے کی طرف

سے جو جواب ملا وہ کسریٰ کا جواب تھا جو آنحضرتؐ کو ملا۔ الحمد للہ یہی دوسرے
راہوں سے توقع تھی۔

جمعہ کا روز تھا۔ سید حسب معمول منبر پر خطبہ بنا رہا تھا۔ مسجد میں
کافی رجم تھا۔ سلطان حسین بھی موجود تھا۔ سید محمد ولحمت کے بعد کفر و شرک
کی مذمت بیان کر رہا تھا۔ اثناء تقریر میں اس نے جہاد فی سبیل اللہ کی آیات
قرآنی اور احادیث صحیحہ سے ثابت کی اور یہ بھی کہا کہ ہر ایک مومن مسلمان
پر جہاد فرض ہے اور جو مسلمان معذور نہیں اور جہاد سے جی کڑاتا ہے وہ
نفس قرآنی کا عمدہ منکر ہے۔ خواہ اعتقاد نہ ہو۔ ایسے لوگ چند موقدہ
فانی زندگی کے آرام و آرائش پر مرتے ہیں، ان کا ٹھکانا جہنم ہے۔ اور
مسلمان صاحبان ریاست و حکومت جو طاقت رکھتے ہوئے جہاد نہیں
کرتے دوزخ کا ایندھن ہیں۔

سید تقریر کر رہا تھا، یک لحنت اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس
وقت جلال اس کے چہرہ سے اس کے لفظوں سے ٹپک رہا تھا۔ اس
نے سلطان حسین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ان عالیان ریاست
میں ایک یہ شخص ہے۔ سلطان حسین لڑے گا۔ چاہتا تھا کہ کھڑے ہو کر
کچھ کہے اور غالباً "آمناء و صدقنا" کے سوا اور کچھ نہ کہتا۔ مگر زبان بند
ہو گئی۔ سید نے سلسلہ تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا کہ جہاد فی سبیل اللہ
کے لیے بلاشبہ چند شرائط ہیں۔ اور دشمنان دین کے مقابلہ و مقاتلہ
کے لیے زبردست عسکری قوت اور پسندیدہ قیادت از بس ضروری ہے
لیکن ایمان سے قوی تر کوئی طاقت کوئی قوت نہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کا
بھی وعدہ ہے اور اللہ سے بڑھ کر وعدہ کا کون سچا ہے کہ اگر تم اہل

ایمان ہو تو تم ہی غالب رہو گے اور یہ کہ اکثر مقوڑے بہتوں پر غالب آتے ہیں۔

سید کی آواز بلند ہو رہی تھی۔ وہ بہت بڑا عالم دین بھی تھا۔ اور تقریر برجستہ اور فصاحت میں لاجواب کرتا۔ موضوع جہاد پر اس کی آتش بیانی نے ایک جوش پیدا کر دیا۔ سید کی تقریر میں بھی ایک بے پناہ جوش تھا۔ آخر سید نے ایک دفعہ پھر بلند آواز کرتے ہوئے کہا کہ آج میں ہر مسلمان کو جو کسی وجہ سے معذور نہیں دعوت جہاد دینا ہوں اور کافر دلیپ رائے کے خلاف اعلان جہاد کرتا ہوں۔

سید کی تقریر اور اعلان جہاد کا اثر حاضرین پر جو کچھ ہوا اس کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ تین روز کے عرصہ میں یہ اعلان دور دور تک نشر ہو گیا۔ سلطان حسین کے پرچم کے نیچے تیس ہزار مجاہدین جمع ہو گئے۔ سلطان چاہتا تھا کہ اور مسلمانوں کو دعوت شرکت دے اور اگر سید ذرا تحمل سے کام لیتا تو کچھ شک نہیں کہ ایک لشکر حرار تیار ہو جاتا اور دلیپ رائے کو مقابلہ کا کبھی سوسلہ نہ ہوتا۔ مگر سلطان کی کیا مجال تھی کہ سید کے حکم کی تعمیل میں تاخیر سے کام لے۔ اسی فراہم شدہ ہمجیت کے ساتھ بیلغار کرتا ہوا دلیپ رائے کی راجدھانی گوڑکی طوت بڑھا سید ہرات خود اپنے پندہ سو بیرایاں کو لیے سلطان کے لشکر کے میمنہ پر تھا۔

دلیپ رائے کو بھی اس اعلان جہاد اور سلطان کی لشکر کشی کی اطلاع وقت پر ملتی رہی، اسے کسی تیاری کی ضرورت نہ تھی۔ وہ ہر وقت تیار

تھا۔ لیکن اسے یہ امید تھی کہ سلطان صاحبزادہ تجر بہ کار سپاہی اتنی ہی
 جمعیت کے ساتھ اس سرعت کے ساتھ اس کے پایہ تخت پر یورش
 کرے گا۔ اسے کیا معلوم تھا، کہ سلطان کس طاقت کے زیر اثر پیش قدمی
 کر رہا ہے، دونوں لشکروں کا آمنہ سامنا ہوا۔ جس گرم جوشی سے مجاہدین
 نے حملہ کیا اس کا اثر راجہ کے ہراول پر خاطر خواہ ہوا۔ راجہ خود قلب
 لشکر میں ایک ہاتھی پر سوار یہ خوفناک منظر دیکھ رہا تھا، ہراول کو پس پا
 ہوتے دیکھا تو راہپوتی خون رگوں میں کھولنے لگا، ہاتھی کو آگے بڑھایا
 اور آخر خود ہاتھی سے اتر کر گھوڑے پر سوار ہوا۔ اس کے داسینے اور
 بائیں بازو پر راجپوت سوار سلطان کی فوج پر بجلی کی طرح ٹوٹ پڑے
 یہ ایک سیلاب تھا جو سامنے پڑا منس و خاشاک کی طرح بہا کر لے گیا۔
 سلطان حسین پر ہراسیمگی کا عالم چھایا۔ ہر طرف موت کا بازار گرم ہو رہا
 تھا اس کی پریشاں نظر سید کو ڈھونڈ رہی تھی۔ سید اس وقت گھوڑے
 پر سوار اپنی فوج بیراگیاں کے ساتھ ایک طرف تماشائے رزم دیکھ رہا
 تھا۔ سلطانی لشکر کو بری طرح پس پا ہوتے دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک
 سرور کی حالت میں اس کی نگاہ میدان جنگ کا جائزہ لے رہی ہے۔
 وہ جلال و جمال کا دکش مجسمہ تھا۔ اس وقت اس نے نعرہ "الذاکر"
 پورے زور سے بلند کیا اور ساتھ ہی میدان جنگ فوج بیراگیاں کے نعرہ
 سے گونج اٹھا۔ سید اور اس کے ساتھ اس کی صوفیانہ جماعت نے
 دلیپ رائے کے ایک بازو پر حملہ کیا۔ دلیپ رائے خود بھی اس
 طرف متوجہ ہوا۔ اور عثمان راہوار سید کی طرف پھیر دی۔ بیراگی راجہ
 کے بائیں بازو کی صفیں الٹ چکے تھے۔ اوہر سے سید اور اوہر سے

راجہ ایک دوسرے کے استقبال کو بڑھے دونوں قریب تر ہو گئے۔ راجہ
 کا ہاتھ تلوار کا وار کرنے کے لیے اٹھا مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہوا
 میں کسی زبردست طاقت نے تمام لیا۔ سید نے گھوڑے کی رکابوں پر
 کھڑے ہو کر شمشیر براں کا ہاتھ اس زور سے دیا کہ سینہ پھرتی ہوئی
 ناف تک دم نہ لیا، بے سرفوج کے پاؤں اکھڑ گئے۔ اب اسلام اس
 ریاست میں بھی سرعوت سے پھیلا۔ دلیپ رائے کا ہمیشہ زادہ
 جس کا اسلامی نام میاں دلاور ہے۔ سید کا رفیق ہر ایک سفر میں رہا۔
 اس جنگ کے واقعات میں کچھ اور روایات بھی بیان کی جاتی ہیں
 کہتے ہیں کہ سید کی تلوار راجہ کا سینہ پھرتی ہوئی نکلی تو دلیپ رائے
 کا دل باہر نکل آیا اس پر اس بت کا نقش تھا جس کی پوجہ راجہ کیا کرتا
 نظر ہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نقش سینہ پر ہوگا۔ ہندو مانتے پر تلک
 تو لگایا کرتے ہیں۔ جسم کے کسی حصہ پر کسی مورتی کا نقش بھی بنا لیتے
 ہیں۔ روایت یہ ہے کہ سید پر اس کا اثر اتنا ہوا کہ بحالت جذبہ بے
 ہوش ہو گیا۔ کہ جب معبود باطل کے پوجاریوں کو اتنا شغف ہے کہ
 اس صورت خیالی سے جدا نہیں ہوتے تو معبود حقیقی تو کسی حال اور
 کسی مقام میں ذہن سے جدا نہ ہونا چاہئے۔ *الحی قیاماً و قعوداً*
 جنوبی، اسی کی یاد میں صحویت واجب ہے۔ بیان کیا جاتا ہے
 کہ بارہ برس تک سید اسی حالت جذب میں رہا۔ ہم نہیں کہہ سکتے
 کہ یہ اس سیر النفس کے دوران میں کن مرحلوں کو طے کر گیا اور کیا واردات
 اور کشف حقائق اس کے قلب سلیم پر ہوا۔ اس ضمن میں سید کی کرامات
 اکثر بیان کی جاتی ہیں۔ اس کے دروازہ پر عقیدتمندوں کا ہجوم رہتا مگر

وہ سب سے بیگانہ تھا۔

راہر ولیپ رائے کی ریاست کا مالک اب سلطان حسین تھا۔ بارہ برس کا عرصہ گزر گیا۔ آخر سید نے مراجع لاہوت سے نزول عالم ناسوت کی طرف گیا۔ اور پھر وعظ و نصائح کا دروازہ کھول دیا۔ وطن مالوت کو خیر باد کہا تاکہ اس سے باہر خلق خدا اس کے فیض سے محروم نہ رہے۔

واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ سید کو ہوس سلطنت اور خواہش حکومت نہ تھی۔ وہ ابتدا سے درویش تھا اور آخر عمر تک درویشانہ سادہ زندگی بسر کی۔ اگر وہ چاہتا تو یہی ریاست جو اس کی تیسرا خانا شکامت نے بزور مسخری اس کی تھی مگر اسے دینیوی جاہ حسرت سے نفرت تھی۔ اس کے ذرا سے اشارہ پر ہر ایک ممکن سامان عیش و عشرت موجود ہو سکتا تھا وہ بے انتہا مال و منال جمع کر سکتا تھا۔ مگر "النقر غزی" اس کی زندگی کے ہر ایک واقعہ سے نمایاں تھا۔

بارہ برس کا عرصہ گزرنے کے بعد سید اپنے چند مریداں باخلاص احمد اہل و عیال کے ساتھ شہر چندیری میں آیا۔ اس بات کا سلسلہ تو اس سے پیشتر شروع ہو چکا تھا اب اس نے دعویٰ کیا کہ "مہدی موعود میں ہوں۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ سید پر کس طرح منکشف ہوا۔ کہ وہ مہدی موعود تھے۔ روایت یہ ہے کہ خواب یا رویا میں اس نے ایک شخص کو دیکھا جس کے چہرہ پر تقدس کے آثار نمایاں تھے اس نے سید کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ تو مہدی موعود تھے۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ یہ عقیدہ کہ مہدی کا کسی زمانہ میں ظہور ہو گا۔ اس وقت

تک پختہ ہو چکا تھا، احادیث جو ابو داؤد اور ترمذی میں روایت ہوئی ہیں ان میں مہدی کا مذکور ہے۔ ترمذی (۳۷۹ھ) اور ابو داؤد سجستانی (۳۸۶ھ) چوتھی ہجری کے آخر کے راوی ہیں۔ اس لیے یہ قرین عقل ہے کہ مہدی کا صاف صاف میز تصور چوتھی ہجری کے شروع میں موجود تھا۔ چونکہ سید محمد احادیث کا بہت بڑا عالم تھا اور ریاضت شاقہ اور مجاہدہ جاترے تزکیہ کا نفس و تصفیہ کے قلب کے ساتھ بہت کچھ حقائق دینی منکشف کر دیے تھے اس لیے یہ بہت بیدھی بات ہے کہ اسے بعض ارادات قلبی کے ذریعہ یہ یقین ہو گیا ہو کہ مہدی موعود ہی ہے۔ رفقا سفر نے سید کے دعویٰ پر اُمناء و صدقاً کہا۔ سید جس جگہ اس کے علم و فضل و زہد و تقویٰ اور جہاد فی سبیل اللہ کی شہرت اس کے درود سے بہت عرصہ پہلے پہنچ چکی تھی اس لیے ہر ایک جگہ اس کا استقبال نہایت گرم جووشی سے ہوا۔ اگرچہ عوام ذوق و شوق سے سید کے خلق ارادت میں داخل ہو رہے تھے۔ مگر علماء اسلام مخالفت پر کھڑے ہو گئے۔

اب سوال یہ ہے کہ حضرات شیعہ امامیہ تو ایک خاص شخصیت کی آمد ثانی کے منتظر ہیں اگر وہ کسی اور شخص کے دعویٰ مہدویت کا انکار کریں تو کچھ بات بھی ہے۔ لیکن اہل سنت و الجماعت میں سے وہ فریق جو کسی مہدی کا منتظر ہے خواہ وہ کوئی ہو کیوں انکار کرتے ہیں؟ بات یہ ہے کہ مہدی کا مذکور صرف چند احادیث میں ہے اور جن میں ہے ان میں مہدی کا علیہ اور مقام خروج مدینہ یا خراسان حسب دعایت شعبان بیان کیا گیا ہے۔ ہندوستان کا مذکور کسی احادیث

میں نہیں۔ اور بعض احادیث میں مہدی کے ساتھ حضرت علیؑ کے نزول کا بھی مذکور ہے اس کے علاوہ اور باتیں بھی ہیں۔ یہ تمام شرائط کسی شخصیت میں موجود ہوں تو سنی علماء اسلام بھی تسلیم کریں۔

اب سید اور علماء اسلام کا مباحثہ کا بازار گرم ہو گیا۔ سید کو چندیری سے نکلنا پڑا۔ اس جگہ سے وہ شہر مندوہ میں آیا جو صوبہ مالوہ کا صدر مقام تھا۔ سلطان ناصر الدین بن سلطان غیاث الدین بن سلطان محمود خلجی یہاں فرما کر رہا تھا۔ سلطان غیاث الدین بقیہ حیات تھا۔ مگر بیٹے نے نظر بند کر رکھا تھا۔ اس بادشاہ کے فضائل و سیرت کی تصویر فرشتے نے خوب کھینچی ہے۔ شہزادگی کے عالم میں ایک بہادر جفاکش سپاہی تھا بادشاہ ہوا تو عیش و عشرت میں مستغرق ہو گیا۔ خوب صورت عورتوں کا اتنا دلدادہ تھا کہ صدا بنو جوان صاحب جمال عورتیں اس کے محل سرا میں موجود تھیں جو عموماً لونڈیاں ہی تھیں۔ ایک دن اپنے مقرروں سے کہا کہ میں نے کئی ہزار صاحب جمال عورتیں دیکھیں لیکن وہ صورت جو میرے تصور میں ہے آئینہ شہود میں جلوہ گر نہیں ہوئی ایک ندیم نے عرض کی کہ جو لوگ اس خدمت پر مامور ہوئے صورت خوب و پیکر مرغوب کی تمیز نہیں رکھتے تھے اگر بندہ درگاہ اس خدمت پر مامور ہو تو وہ صورت جو طبع سلیم کے موافق ہے بہم پہنچائے گا۔ سلطان نے پوچھا کہ معیار حسن کیا ہے؟ جواب دیا کہ خداوند تعالیٰ صاحب جمال کی صفت ہے کہ وہ ایسا متناسب الاعضا ہو کہ جو عضو اس کا نظر آئے دیکھنے والے کو دوسرے اعضاء کے دیکھنے سے مستغنی کر دے۔ سلطان نے اسی کو اس خدمت پر مامور کر دیا۔ دور دور

تک مختلف ممالک کی سیر کی مگر اس صفت کی کوئی مسورت نظر نہ آئی
 مایوس ہو کر واپس لوٹا اتفاقاً سلطان حما کی ولایت کے ایک موضع میں
 ایک ماہ پیکر نازنین منظر بڑی بوجہ بہرہ صفت موصوف تھی۔ چند روز اسی
 موضع میں بسر کیے آخر اس پری دوش کو اٹھا لایا۔ سلطان کی خدمت میں
 حاضر ہو کر عرض کی کہ میں نے اس حسن یوسف کو ہزار ہا روپیہ میں خرید
 کیا ہے یہ تو محل سرا میں داخل ہوگی۔ مگر اس کے والدین لڑکی کی تلاش
 میں آئے۔ اور بارگاہ سلطان میں فریاد کی کہ آپ کے مقربین میں سے
 فلاں شخص ہماری بھولی بھالی لڑکی کو اغوا کر کے لایا ہے۔ آخر سب راز
 افشا ہو گیا۔ سلطان نے علماء سے فتویٰ طلب کیا اور کہا کہ جو حکم شرع
 کا ہو مجھ پر جاری کیا جائے۔ جب لڑکی کے والدین کو اصل حالات کا علم
 ہوا تو کہا کہ ہم اپنے دستوں سے دست بردار ہوتے ہیں۔ نصیب
 نصیب ہمارے کہ سلطان کی دامادی کا نخر حاصل ہوا۔ سلطان نے کہا
 کہ اب یہ عورت میرے لیے مباح ہوئی۔ لیکن اس سے پیشتر میں زنا
 کا مرتکب ہوتا رہا ہوں اس لیے شرعاً جو سزا میرے لیے تجویز کی
 جائے میں اس کا سزا وار ہوں علماء نے کہا کہ تاوان لستہ جو بھی گناہ سہرزد
 ہو شرعاً قابل مواخذہ نہیں البتہ کفارہ واجب ہے۔ اب سلطان نے
 بھی توبہ کی اور حکم دیا کہ آئندہ کوئی شخص میرے لیے کوئی مسورت نہ
 لائے ایک دفعہ ایک شخص گدبے کا ایک سم لایا اور کہا کہ حضرت
 عیسیٰ کے گدبے کا ہے۔ پچاس ہزار روپیہ میں خرید کیا۔ اسی طرح
 تین آدمی لوہے کی ایک ایک سم لائے ان کو بھی فی سم پچاس ہزار تہہ دے
 پانچواں شخص بھی کچھ عرصہ بعد ایک سم لایا۔ وہ بھی پچاس تہہ کے عوض

خرید کی۔ ایک مقرب نے کہا کہ شاید حضرت عیسیٰ کے گدھے کے پانچ پاؤں
تھے۔ جواب دیا کہ حضرت عیسیٰ کے گدھے کو عام گدھوں میں نصیبت اور
فوقیت ضرور ہوگی۔

اگر یہ صحیح ہے کہ اکثر اہل جنت سادہ لوح ہیں تو سلطان خیاث الدین
سے بڑھ کر اس زمانہ میں کوئی نہ ہوگا۔ اس پر بھی اس کی سخاوت اور
رحم اور حلم ضرب المثل تھا۔ تمام عمر کسی ایسی شے کا استعمال نہ کیا جو نشہ آور
ہو ایک دفعہ علماء نے ایک مہجون ایک لاکھ روپیہ صرف کر کے تیار کی
اس کے اجزا میں دو درم "بوزبوا" بھی تھے۔ معلوم ہوا تو حکم دیا کہ جلا دو،
کسی مقرب نے کہا کہ اگر حضور استعمال نہیں فرماتے کسی اور کو عنایت فرمائیں
کہا کہ حاشا جو میں اپنے لیے پسند نہیں کرتا دوسرے کے لیے بھی پسند
نہیں کرتا۔ صوم و صلوٰۃ کا پابند تھا۔ تہجد بھی قضا نہیں کی۔

المختصر یہ نیک بہاد سلطان اپنے بیٹے نام الدین کے حکم سے محل
میں نظر بند تھا کہ سید محمد مندو میں وارد ہوا۔ یہاں توقع سے بڑھ
کر کامیابی ہوئی۔ خود سلطان حلقہ ارادت میں داخل ہوا جیسا راجہ دیسی
پر جا اکثر امرا و وزرا نے بھی بیعت کی عوام تو گرویدہ ہی تھے۔ امرا و سلطان
میں سے ایک شخص مسمیٰ "الداو" بھی سید کا مرید ہوا۔ اس شخص کے
علم و فضل کی بہت تعریف کی جاتی ہے۔ امداد کا یہ حال ہے کہ امارت
پر لات ماری اور فقر و فاقہ قبول کیا۔ سید کا ساتھ ہر ایک سفر میں دیا
صاحب تصانیف بھی سب سے "سالہ بار امانت" اور "ثبوت مہدویت"
اسی کی تصنیف ہے۔ صاحب دیوان بھی ہے۔

سید محمد ایک جگہ جم کر بیٹھا پسند نہیں کرتا تھا۔ بعض مقامات

سے تو اسے مجبوراً علماء اسلام کی مخالفت کی وجہ سے نکلنا پڑا۔ اور اکثر اوقات وہ خود شہر بہ شہر اور ملک بہ ملک وعظ کرتا ہوا اور اپنے دعویٰ کو لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہوا سفر کرتا رہا۔ وہ خاص وصف جو فطرت نے اس کی زبان میں ودلیت کیا ہوا تھا۔ ہر ایک سامع کو گرویدہ بنا لیا مریدوں کی تعداد روز بروز بڑھتی گئی۔ اور اس کا شہرہ اکثر ممالک ہند میں پھیل گیا۔ اگر ہم صرف سید کے سفر نامہ کو لکھیں تو ایک دفتر چاہیے۔ ہم صرف چند واقعات کا ذکر کرتے ہیں جو دوران سفر میں پیش آئے۔

سید مندوسے نکل کر "جاپانیر" میں آیا۔ سلطان محمود بیکہ والی گجرات اور العزم فرما رہا تھا اگر علماء اسلام مانع نہ آتے تو یہ بھی سید کا مرید ہو چکا تھا۔ مگر باوجود مخالفت اکثر لوگ عام و خاص حلقہ ارادت میں داخل ہو گئے۔ ان میں ایک نوجوان طالب علم میاں نظام الدین نامی تھا۔ ہر ایک سفر میں سید کے ہمراہ رہا۔ اسی جگہ سید کی بیوی کا انتقال ہو گیا ہندوئی اسے بی بی آمنہ کہتے تھے۔ قلعہ کے نیچے مزار ہے اس جگہ سے سید براہ برہان پور اور دولت آباد شہر احمد نگر میں آیا۔ بہمنیہ خاندان کے بعد پانچ سلطین دکن میں قائم ہو چکی تھیں جو دہلی کی ہم عصر حکومتوں سے موسوم ہیں۔ احمد نگر سلطنت نظام شاہیہ کا پایہ تخت تھا۔ بانی سلطنت احمد نظام الملک بھری سے موسوم ہے۔ فرشتہ لکھتا ہے کہ اس شہر یار کے خصائل حمیدہ اور فضائل پسندیدہ لفظوں میں ادا نہیں ہو سکتے۔ اس کے زہد و صلاح و پرہیزگاری کے قصے مشہور ہیں۔ سوار ہو کر جب کسی شہر میں آتا کبھی فائیں بائیں نہیں دیکھتا

تھا، ایک ندیم کے سوال پر کہا کہ بادشاہ کی سواری کے وقت اگر مرد و
زن زیارت اور تماشائے جلوس کے واسطے آتے ہیں، میں ڈرتا ہوں
کہ میری نگاہ بے محابا کسی نامحرم عورت پر پڑے تو وبال اس کا میری
گردن پر ہو۔

ہزار آفریں از جہاں آفرین براں شاہ با دانش و داد و دین
احمدنگ میں سید کا استقبال نہایت گرم بوحشی سے ہوا۔ خود
احمد نظام شاہ سید کا مرید ہو گیا۔ ایک دہائی جس کی حیثیت ایک ادا العزم
خود مختار سلطان کی تھی۔ ایک درویش کا مرید ہونا معمولی بات نہیں ہے
سید کی کامیابی کا اس سے بڑھ کر اور شاید ہی ثبوت ہو سکتا ہے کہ
فایان ملک بھی اس کے آستانہ پر لبصد عجز و نیاز حاضر ہوتے اور
اسے سعادت داریں یقین کرتے۔ سلطان کی تقلید رعایا نے بھی کی۔
سلطنت نظام شاہیہ میں کوئی شخص ایسا نہ تھا جو سید کا کلمہ نہ پڑھتا ہو۔
اگر سید دنیوی جاہ و جلال اور حکومت کا خواہاں ہوتا تو یہ سب کچھ اس
کے دست تصرف میں آسکتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دل میں
ایک ہی جذبہ اور دماغ میں ایک ہی خیال کا ذکر کار فرما تھا کہ تمام دنیا
اسلام کے سامنے دعویٰ جہد و یت پیش کرے اور وہ تسلیم کرے۔
احمدنگ کو مسخر کر کے وہ شہر احمد آباد بید میں آیا۔ یہ پایہ سلطنت
برید شاہیہ تھا۔ حکمران ملک قائم برید تھا۔ اور یہی اس سلطنت کا
بانی بھی تھا۔ عوام الناس کے علاوہ علماء اسلام اور قاضی شہر نے بھی
بیعت کی۔ یہاں سے سید سلطنت بہمنیہ کے دارالسلطنت گلبرگہ
حسن آباد میں آیا۔ اس جگہ سید محمد گیسو دراز کا مقبرہ ہے۔ آپ

خلیفہ نصر الدین چوہراغ دہلی تھے۔ اور چوہراغ دہلی خلیفہ نظام الدین
 اولیاء کے تھے۔ اہالیان دکن کی عقیدت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے
 کہ زشتہ کہتا ہے کہ اگر کسی دکنی سے پوچھو کہ سید محمد گیسو دراز اور آنحضرت
 کے درجات میں کیا فرق ہے تو یہ جواب دیتا ہے کہ آنحضرت تو
 رسول خدا ٹھہرے مگر سید محمد چیزے دیگر است۔ ہمارا سید محمد
 خود بھی چشتی تھا مقبرہ پر حاضر ہو کر فاتح خوانی کی۔ اسی جگہ حج بیت اللہ
 کا شوق دل میں پیدا ہو گیا۔ خاک سیاہ ہند کو خیر باد کہہ کر مسواصحاب
 مکہ معظمہ میں احرام باندھے ہوئے حاضر ہوا۔ جس وقت حرم میں قدم
 رکھا مٹا ایک حدیث یاد آئی۔

عن اہل مسلمہ عن النبی صلواتہ علیہ قال یكون اختلاف عند موت خلیفہ فیخرج رجل من اہل
 المدینۃ ھاربا الی مکة فیاتیہ ناس من اہل مکہ فیخرجونہ وھو کارہ فیبايعونہ
 بین الکن والمقام (الخ)

اگرچہ یہ واقعہ عبداللہ بن زبیرؓ کے متعلق ہے اور شہد میں
 اس کا ظہور ہو چکا تھا مگر اسی جگہ رکن و مقام کے درمیان سید کے
 منہ سے نکلا من اتبعنی فہو من۔ جو بھی میرا اتباع کرے گا وہی مومن
 ہے، میاں نظام الدین اور قاضی علاء الدین نے اُمتا و صدقنا کہہ کر
 بیعت کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ اس طرح یہ پیش گوئی بھی کسی حد تک
 سید کے حق میں پوری ہوئی۔

حج بیعت اللہ کے بعد سید نے ہندوستان کی طرف مراجعت کی۔
 مسجد تاج خاں سالار واقع احمد گجرات میں ٹھہرا۔ ملک برہان الدین اور
 ملک گوہر طبقہ امرا میں تھے۔ حلقہ ارادت میں داخل ہوئے سلطان محمود

اہلی بکرات علماء اسلام کی مخالفت کی وجہ سے مجبور ہوا۔ اور سید کو یہاں سے نکلنا پڑا۔ سید قصیدہ "بدلی" میں آیا۔ مولف مذکورہ علماء ہند اس روایت کا ذمہ دار ہے کہ اس جگہ سید نے ایک جلسہ عام میں کہا کہ اصدی مبعین مراد اللہ اور اپنے جسم کی جلد کو دوانگلیوں سے پکڑ کر کہا کہ جو شخص اس ذات کے دعویٰ جہودیت کا منکر ہے کافر ہے بھے اللہ تعالیٰ سے جو اسطہ احکام ملتے ہیں، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ علم اولین و آخرین اور بیان یعنی فہم قرآن اور ایمان میں نے سب تجھے عنایت فرمایا۔ جو شخص تیرا اقرار کرتا ہے مومن اور تیرا منکر کافر ہے۔

لیح مریداں با اخلاص سے آمنا و صدقنا نکلا۔
 یہ بہت بڑا رسول ہے۔ اور کوئی مومن مسلمان جو شریعت محمدیہ کے تابع ہو اور احکام شرعیہ کا سختی سے پابند بھی ہو کسی مسلمان کو کافر نہیں کہے گا جو اہل قبلہ اور بظاہر ارکان اسلام کا پابند بھی ہو۔ سید ذاب اللہ کی مزارات پر فاتحہ خوانی کے لیے بھی جاتا رہا اور حج بھی کیا۔ اور اپنے متبعین کو معمولی صوم و صلوٰۃ کے علاوہ ذکر و شغل جو خاوادہ چشتیہ میں رائج ہے تلقین کرتا۔ اس کے سلسلہ میں بڑے بڑے اولیاء گندے ہیں جن کا تذکرہ بدایونی وغیرہ نے لکھا ہے۔ اس سے یہ توقع تو نہیں ہو سکتی کہ اپنی شخصیت کے منکر کو کافر کہے۔ یہاں دعویٰ الہام و القار بانی یعنی بے واسطہ واردات قلبی، جسے ہمارے علماء وہی غیر منکر بھی کہتے ہیں تو یہ کچھ ایسی بات نہیں جس کا انکار کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کائنات کی ہر ایک شے سے فطرتاً کلام فرماتا ہے۔ زمین اور آسمان میں وہی فرماتا ہے، اہل اللہ کو تقویٰ کا

الہام ہوتا ہے۔ اور بدکاروں کو فحور کا، ایک نمفی سی جان شہید کی مکھی کو
 وحی ہوتی ہے ام موسیٰ کو وحی ہوتی۔ لیکن ایسے الہامات اور وحی
 کی بنا پر کوئی نبی یا نبیہ نہیں ہو سکتی۔ علم ادلیں و آخریں بھی ہمدانی
 کا دعویٰ ہے۔ سید نے اپنی کوئی تصنیف نہیں چھوڑی جس سے اس
 دعویٰ کا جائزہ لیا جائے۔ ایسا دعویٰ تو آنحضرت سے بھی منسوب
 نہیں کیا جاتا۔ آج تک کوئی انسان ایسا نہیں ہوا، جو یہ دعویٰ بدلائل
 ثابت کر سکے کہ ایک ذرہ بے مقدار کا علم بھی کماحقہ حاصل ہے۔
 ہمارے زمانہ میں "اٹانک انار جی" کا علم بھی ابتدائی مرحلہ میں ہے۔
 "الغیب" یعنی وہ امکانات جو کائنات کی ہر ایک شے بلکہ ذرہ ذرہ
 میں پوشیدہ ہے اللہ تعالیٰ جتنا چاہے اپنے بندوں میں سے
 برگزیدہ اشخاص پر منکشف فرماتا ہے۔ آنحضرتؐ بھی یہی کچھ کہتے
 ہیں کہ میں غیب کے خزانوں کا مالک نہیں۔ اگر ان کو علم ہوتا تو بہت
 کچھ چیزیں اپنے لیے جمع کر لیتا۔ مجھے اتنا بھی معلوم نہیں کہ میرے
 ساتھ اور تمہارے کل کیا ہونے والا ہے۔
 جہاں تک ہم نے غور کیا ہے۔ سید کے مخالفین نے بعض باتیں
 سید سے ایسی منسوب کر دی ہیں کہ لوگ بدظن ہوں۔ علماء اسلام تو
 مخالف تھے۔ سید کو قصبہ بدلی بھی چھوڑنا پڑا۔ اور خود بھی ایک جگہ جم
 کر بیٹھنا چاہتا تھا فرمان سلطان بلائے ناگہانی کی طرح لائے۔ یہاں
 سے سید شہر ٹھٹھہ میں آیا جو سندھ میں صدر مقام تھا۔ فرشتہ
 لکھتا ہے کہ ٹھٹھہ ہی وہ مقام ہے جسے کسی وقت "ویل" کہتے تھے
 یہاں بھی کچھ آدمی حلقہ ارادت میں داخل ہوئے۔ مگر علماء کی مخالفت

کا طوفان بھی اٹھا چلا آ رہا تھا۔ سید سے وہ وہ باتیں منسوب کیں جن کا ذکر ہم کر چکے ہیں۔ شاہ سندھ نے حکم قتل صادر کیا۔ کین ایک مصاحب نے مشورہ دیا کہ تحقیق کے بعد ایسا حکم قابل تعمیل ہو سکتا ہے علماء کے ایک طرف فیصلہ پر کسی کا حکم قتل جائز نہیں۔ اگر سلطان کو شورش اور بد امنی کا خوف ہے تو سید کو حکم دیا جاسکتا ہے کہ آپ کی مملکت کے حدود سے باہر ہو جائے۔ چنانچہ سلطان نے اسی مشورہ پر عمل کیا۔ سید کے ہمراہ اس وقت آٹھ سو آدمی تھے۔ ان کے ساتھ خراساں کی طرف ہجرت کی۔ ان میں سے تین سو ستر آدمی ایسے منتخب تھے کہ ان کا لقب اصحاب لور تھا بحرین ہوا۔ قندھار میں پہنچا تو مرزا شاہ بیگ حاکم قندھار کو سید اور اس کے دعویٰ کی اطلاع ہوئی جمعہ کے روز مسجد جامعہ میں طلب کیا۔ علماء اسلام سے بحث کی طرح ڈالی۔ اس مجادلہ کے محرک خود علماء تھے۔ علماء اسلام نے نہایت سختی بلکہ روایتی بد اخلاقی سے گفتگو کی۔ سید کی طرف سے نہایت عجز و انکسار کے ساتھ مہذبانہ الفاظ میں جواب دیا گیا حاکم قندھار پر سید کے اخلاقی حسنہ لعد فرمائی بالخصوص استدلال کا یہ اثر ہوا۔ کہ گردیدہ ہو گیا۔ یہاں بھی سید نے ٹھہرا "فراة" میں آیا۔ علماء کی عام مخالفت نے امیر ذوالنون حاکم شہر کو سید کے حالات کی طرف متوجہ کیا، اس طرح پھر ایک دفعہ علماء اسلام سے مناظرہ کی ٹھہری۔ امیر نے کل حالات مرزا حسین شاہ خراساں کی خدمت میں لکھے اور جواب کا منتظر رہا۔ سید نے تو ماہِ اسی انتظار میں یہاں بسر کیے۔ لیکن افسوس ہے کہ آخر وہ دن آ گیا جس کا دھڑکا ہر ایک ذی حیات کو لگا ہوا

ہے۔ یعنی بروز پنجشنبہ ۹۱۱ھ تہتر برس کی عمر میں سید محمد المہدی جو پورے
 کا انتقال اس دار فانی سے دار البقا کی طرف ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ
 راجعون، شہر ذراہ میں مدفون ہوا۔ الر داد نے قبر پر کھڑے ہو کر مرثیہ پڑھا
 سید کے استقلال کی تعریف لفظوں میں نہیں ہو سکتی۔ مرتے
 دم تک اپنے دعویٰ پر قائم رہا۔ اور پچ تو یہ ہے کہ جو کچھ وہ کہتا
 اس کی صداقت کا اسے کامل یقین بھی تھا۔ علماء اسلام نے اس کی
 سخت مخالفت کی، کئی دفعہ شہر بدہ ہوا۔ کئی دفعہ قید کی مصیبت بھی بھلی
 قتل ہوتے ہوتے بچ گیا۔ مگر معظمہ گیا۔ خراساں گیا۔ اور اس حدیث
 کا بھی مصداق بنا جو شعبان سے مروی ہے کہ جب دجل خراساں سے
 خروج کرے گا۔ اگر یہ حدیث ابو مسلم خراسانی کے حق میں پوری ہو چکی
 تھی۔ اور اس کا فائدہ بنو عباس نے خاطر خواہ اٹھایا۔ ابو مسلم مارا گیا
 اور کذاب تھا۔ سید تو "اہل بیٹی" و "عترتی" سے تھا، وہ ہر ایک جگہ
 اپنے دعویٰ پیش کرتا رہا۔ اسے اپنی جان کی فکر نہ تھی۔ اسے کامل
 یقین تھا کہ اس کا دعویٰ سچا ہے اور آخر لوگ تسلیم کر لیں گے۔ اور
 کوئی شخص اس کا بال تک بیکا نہیں کر سکتا۔
 سید کو زندگی میں جو کچھ کامیابی ہوئی اس سے کہیں بڑھ کر وفات
 کے بعد ہوئی۔ دکن میں مذہب مہدیہ بالاستقلال قائم ہو گیا۔ پابن پور اور
 جزیرہ وغیرہ ریاستوں میں اسی مذہب کے متبعین اب بھی ہیں۔
 ۹۱۱ھ ایک تاریخی سال ہے۔ نزلہ لورطاعون دونوں بلاؤں کا
 ظہور ہوا۔ زلزلہ کی نسبت فرشتہ سلطان سکندر لودی کے حالات
 میں لکھا ہے کہ "اس سال بروز یک شنبہ ماہ صفر کی پیمبری تاریخ

تھی کہ ایک زلزلہ عظیم واقع ہوا۔ یہاں تک کہ پہاڑ بھی لرز گئے۔ بلند اور
محکم عمارات گر پڑیں، زندوں نے قیامت اور مردوں نے حشر محسوس کیا۔
قلعہ تاریخ اس واقعہ کا یہ ہے۔

ورنہ صد و اعلیٰ عشر از زلزلہا گردید سواد اگرہ مرعلہا
با آنکہ نپا ہاش جسے عالمی بود از زلزلہ شد عالیہا سا فلہا
اس زمانہ تک ایسا تباہ کن زلزلہ ہند میں واقع نہ ہوا تھا اور
کوئی شخص کسی تاریخی شہادت سے کسی ایسے زلزلہ کا نشان نہیں بتا سکتا
یہ زلزلہ اکثر بلاد ہند میں آیا۔

طاعون تو دو تین سال پیش پھوٹ پڑا تھا، باوجود اس امر کے
ہندوستان میں آمد و رفت کے ذرائع جیسے کہ ہمارے زمانہ میں ہیں۔
مفقود تھے مگر یہ دیا ایسی عالمگیر تھی کہ کوئی شہر ایسا نہ تھا کہ اس موذی
نے خانہ ویرانی نہ کی ہو۔ زلزلہ کے جھٹے تو آئے اور گزر گئے مگر طاعون
عرصہ دراز تک رہا۔ فرشتہ اس کی تباہ کاری پر بھی بہت کچھ لکھتا ہے
ایسے حوادث کا اثر عوام کے دل پر بہت ہوتا ہے۔ سلطان محمود غلا
دلج کے عہد میں ایک یہودی نے بیت المقدس میں دعویٰ کیا
میں "مسیح موعود" ہوں۔ مورخین لکھتے ہیں کہ بہت باتوں اور شعبہ باز
تھا اور وجہ یہ بھی تھا۔ کثرت سے یہودی اور ہزاروں عیسائی اس کے
گردیدہ ہو گئے۔ دلی بیت المقدس نے اس کی گرفتاری کا حکم دیا
تو بھاگ کر قسطنطنیہ میں آیا۔ یہاں صدر اعظم احمد پاشا نے جیل میں
بند کر دیا۔ عیسائی اور یہودی روزانہ کثیر تعداد میں دوپیرہ دے کر
زیارت کے لیے آتے۔ سلطان کو بھی اطلاع ہوئی۔ بد نفس نفیس ملاقات

کے لیے آیا۔ مدعی مسیحیت نے تقریر شروع کی۔ سلطان نے کہا کہ میں آیات و روایات نہیں جانتا۔ سپاہی ہوں۔ چند تیر اندازوں کو حکم دیا ہو کہ تجھے نشانہ بنائیں اگر تیرے جسم پر اثر نہ ہوا تو میں تجھ پر ایمان لے آؤنگا اور یہ وسیع مملکت بھی تیری ہے۔ مسیح کا ذب سلطان کے پاؤں پر گر پڑا اور کہا مجھ میں آپ کے امتحان کی طاقت نہیں اور ساتھ ہی کلمہ طیبہ پڑھا لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ، سلطان بھی ہکا بکا ہو کر رہ گیا۔ مورخین کا بیان ہے کہ اس کی کامیابی اتنا عرصہ اس لیے ہوئی کہ سترہ میں متواتر زلزلوں اور طاعون نے لوگوں کو خوف زدہ کر دیا تھا اور ہر ایک کو یقین تھا کہ قیامت نزدیک ہے۔ اور اور مسیح کا نزول بھی قریب قیامت کی دلیل ہے۔

صد قیامت رفت وازد مرزا فردانگرد

مدعیان ہمدویت کا تذکرہ ہم نے بالا خفقار لکھا ہے سید محمد

جو پوری سے پیشتر جو بھی مدعی ہمدویت تھا اس کا مقصد سیاسی تھا۔ لیکن یہ معلوم نہ ہو سکا کہ سید کا اصل مقصد اس دعویٰ کے ضمن میں کیا تھا۔ یہ تو ناقابل انکار حقیقت ہے کہ سید دنیوی حکومت کا خواہاں نہ تھا۔ تبلیغ و اشاعت اسلام کا کام جو اس نے شروع کیا وہ ایک عظیم الشان مقصد تھا۔ ولیپ رائے کے معرکہ کے بعد اس کے خاندان کے اکثر افراد نے اسلام قبول کیا۔ ان میں سے ولیپ رائے کا ہمشیرہ زادہ بھی جس کا نام اسلامی میاں دلاور رکھا گیا تھا۔ ہر ایک سفر میں سید کا ساتھ ساری کی طرح دیا۔ اسی طرح سید کے دعویٰ ہمدویت سے پیشتر اکثر ہندو خاندان طلقہ بگوش

اسلام ہوئے۔ لیکن دعویٰ مہدویت کے بعد سید کی توجہ کو علماء اسلام کی مخالفت اور مناظرہ نے جذب کر لیا۔ اس لیے ابتدائی مقصد کی تکمیل خاطر خواہ نہ ہوئی۔ دعویٰ مہدویت کا مقصد خواہ تحت الشعور ہو اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ سید اپنی شخصیت کو منوانا چاہتا تھا۔ لیکن تعجب زیادہ تر اس بات کا ہے کہ سید بہت بڑا عالم دین اپنے زمانہ میں تھا۔ علماء ہند کے تذکرہ میں سید کا ذکر اسی لحاظ سے کیا گیا ہے۔ جو دعویٰ آنحضرت نے بھی نہ کیا۔ اس سے توقع نہیں ہو سکتی کہ اس کا یہ مقصد درحقیقت تھا۔ مگر نفسیات کے عالم جانتے ہیں کہ ایسے لوگوں نے دعویٰ اسی شخصیت پرستی کے لیے کیا۔ اس لیے سید کو بھی معذور سمجھنا چاہیے۔

اسی شخصیت پرستی کا نتیجہ ہے کہ مسلمانوں میں بے شمار فرقے پیدا ہوئے جو کسی نہ کسی شخصیت سے وابستہ تھے اور ان میں سے بعض آج بھی ویسے ہی وابستہ چلے آتے ہیں۔ اسی طرح ایک فرقہ مہدویت کا ظہور ہوا جو سید محمد سے وابستہ ہے۔ ہمیں معلوم نہیں کہ سید کے متبعین جو اب بھی لاکھوں نہیں تو ہزاروں کی تعداد میں موجود ہیں دوسرے مذاہب کے پیروں کی طرح سید کی آمد ثانی کے منتظر ہیں یا نہیں بلکہ سید نے جو کچھ تلقین فرمایا اسی پر کار بند ہیں۔

آخر میں ان واقعات کا تذکرہ بیخاندہ نہ ہوگا۔ جو فسق مہدیہ

کی ابتدائی تاریخ کے ضمن میں بیان کیے جاتے ہیں۔ سلطنت مغلیہ کے شروع تک اس فرقہ کا زور بہت رہا۔ دکن میں دہلی کی بمبھہ حکومتوں میں تو اس کے متبعین کثرت سے موجود تھے۔ احمد نگر کے واقعات میں فرشتہ ایک شخص جلال خاں سپہ سالار افواج کا ذکر کرتا ہے کہ ایک جنگ کے موقع پر دس ہزار جہدوی اس کے جھنڈے کے نیچے جمع تھے۔ مورخین شیخ علائی کا تذکرہ مفصل لکھتے ہیں۔ اس مقام پر ہم اس کا اقتباس اس غرض سے کرتے ہیں کہ معلوم ہو کہ سید کے متبعین کا کیا شغل تھا۔ اور ضمناً یہ بھی واضح ہو جائے گا کہ سید کے دعویٰ جہودیت کے ضمن میں اور کیا بات تھی۔

شیخ علائی کا باپ حسن بنگالہ کے فیوح میں سے تھا۔ شیخ نے حج کے بعد علوم و فنون کی تعلیم اپنے باپ سے حاصل کی پیریاری بھی ایک فن ہے اس لیے ہم نے علوم دین کے ساتھ اس کو بھی شامل کر لیا ہے۔ باپ کا انتقال ہوا تو خود مسند ارشاد پر بیٹھا۔ جیسا کہ ہر ایک پیر کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کا حلقہ ارادت وسیع اور وسیع تر ہو۔ اور اس کی ذات مرجح خاص و عام ہو۔ اور دیگر پیروں سے رقابت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ شیخ علائی بھی دوسرے مشائخ وقت کی عزت و احترام پسند نہ کرتا۔ ایک دفعہ ایک پیر کو محف سے اتار کر سخت ذلیل کیا۔ اس وقت شیخ علائی کی مشیخت کا یہ حال تھا۔

بزرگ و لوق مرصع کندہ دارند
ہزار دستی امیں کو تہ آستیناں ہیں

میاں عبداللہ نیازی انحال شیخ سلیم چشتی کے خلفا میں سے تھا۔
شیخ سلیم کا اکبر بہت معتقد تھا۔ اسی کی دعا سے اکبر کے ہاں لڑکا پیدا

ہوا اس کا نام سلیم رکھا اور اسے "شیخ جیو" کہہ کر مخاطب کیا کرتا۔ یہ بعد میں نور الدین جہانگیر ہوا۔ میاں عبداللہ شیخ سے اجازت لے کر حج کعبۃ اللہ کو گیا۔ واپسی پر سید محمد جو پوری کے کسی خلیفہ سے ملاقات ہوئی حلقہ ارادت میں داخل ہو گیا۔ مذہب مہدویت اختیار کیا اور بیانہ میں آیا۔ اس مقام پر شیخ عللی کی سکونت تھی، آبادی سے دور ایک باغ کے گوشہ میں سکونت اختیار کی۔ صوفیوں سے گھڑے بھر کر سر پر اٹھا کر لاتے نماز کے وقت کسانوں اور راہ گیروں کو نماز باجماعت ادا کراتے۔ جس کسی کو کچھ تامل ہوتا کچھ اپنے پاس سے دیکر جماعت کو ترغیب دیتے یعنی "مولفہ الطوبہ" پر بھی عمل تھا۔ ایک دن شیخ عللی کا بھی اس طرف گزر ہوا۔ میاں عبداللہ کا طریقہ بہت پسند آیا اپنے خادموں سے کہا کہ دین و ایمان اور عمل اسی کا نام ہے اور جس روش پر ہم چل رہے ہیں وہ محض بت پرستی اور زنا و دانی اور ریا کاری ہے۔ سب کچھ چھوڑ کر میاں عبداللہ کے دست حق پرست پر بیعت کی۔ جو لوگ اس کی گذشتہ عادات سے ناراضی تھے انہیں منت و سماجت سے راضی کیا، اسباب دنیوی جو کچھ پاس تھا یہاں تک کہ کتابیں بھی محتاجوں میں تقسیم کر دیں۔ زوج سے کہا کہ اگر فقر و قاقہ منظور ہو تو بسم اللہ میرے ساتھ رہو ورنہ اپنا حصہ اس مال سے لے لو اور مختار ہو جہاں چاہو رہو۔ بیوی نے فقر و قاقہ بخوشی خاطر منظور کیا۔

خاندان حدویہ میں پاس انفا میں ابتدا میں تسلیم کرتے تھے۔ اور یہ دیگر افکار و مشغلہ دبی کچھ ہیں جو خاندان چشتیہ و قادریہ وغیرہ میں تسلیم کرتے ہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ سوائے

دعویٰ اہدویت سید محمد تے کوئی اور بدعت رائج نہیں کی، اس کے مقبضین
 کو لوگ ہدی کہتے ورنہ یہ نام بھی سید کا مجوزہ نہیں، شیخ علائی نے
 تمام ازکار و شغل جو اس طریقہ میں مروج تھے سیکھے، بدایونی لکھتا
 ہے کہ تصفیہ قلب و تزکیہ نفس کے بعد "فہم قرآن" حاصل ہوا۔
 اس وقت شیخ علائی کے رفقاء سیکڑوں آدمی تھے۔ ان میں سے
 میں سو صاحب اہل و عیال بھی تھے مگر اکثر کوئی پیشہ یا تجارت نہ کرتے
 تھے، جو کچھ کہیں سے مل جاتا سب برابر تقسیم کر کے کھاتے۔ اور اگر کوئی
 کسب بھی کرتا تو دسواں حصہ فی سبیل اللہ ضرور صرف کرتا۔ دن میں
 دو دفعہ ایک جگہ جمع ہوتے، قرآن شریف کا درس ہوتا شیخ علائی
 کی تو کایا پلٹ گئی تھی، اس کے واسطے میں یہ اثر تھا کہ جس کسی نے
 ایک دفعہ سن یا سب کچھ چھوڑ کر خدمت میں حاضر ہو جاتا۔ اور پھر
 کسی دوسرے کام کے نزدیک نہ جاتا۔ یہ لوگ ایسے توکل پیشہ تھے
 کہ اگر بھوک کے مارے دم بھی نکل جاتا تو دم نہ مارتے اور نہ دست
 سوال دراز کرتے۔ آگئی تو روزی ورنہ روزہ، ان کی صحبت کا یہ اثر
 تھا کہ اگر کوئی غیر شخص ان کے پاس آ نکلتا تو زیادہ توفیق نہ ہوتی
 تو طبیہات سے توبہ ضرور کرتا۔ رات کو کھانا پکاتے اور استعمال
 کے برتن الٹے رکھ دیتے، آٹا اور نمک کا تو کیا ذکر ہے، پانی
 بھی پاس نہ ہوتا۔ اللہ تعالیٰ مسبب الاسباب ہے۔ دوسرے
 دن کہیں سے کچھ روزی کا سامان ہو جاتا۔ مگر اس فقر و فاقہ کے ساتھ
 ہمیشہ مسلح رہتے اور بازاروں میں بکد جس جگہ کوئی بات خلافت
 شرع دیکھتے بزور روکتے۔ شہر کے حکام تو ان کے معتقد تھے، ہی

ہر طرح مدد و معاونت کرتے اور جو منکر تھے ڈر کے مارے کچھ نہ
 کہتے، شیخ علانی کا اثر اس قدر بڑھ گیا کہ باپ بیٹے کو اور بھائی بھائی
 کو خاوند بیوی کو چھوڑ کر دائرہ مہدویت میں داخل ہو رہے تھے،
 لوگوں کا ہجوم ہو رہا تھا۔ میاں عبداللہ نیازی ایک درد لیش خلوت
 نشین تھا گھبرا گیا اور شیخ علانی کو کہا کہ میرے اوقات میں خلل واقع
 ہوتا ہے اور میں اتنے ہجوم اور ان کے شور و غل کا متحمل نہیں ہو
 سکتا یا تو قاموشی سے گوشہ نشینی اختیار کرو یا سفر حج پر کمز باندھو۔
 شیخ علانی تو فطرۃ بوشیلا آدمی تھا۔ کچھ شہنہالی میں بیٹھنا مشکل نظر آیا۔
 اس لیے "بیانہ" سے چل پڑا۔ کسی شہروں کا چکر لگا کر پھر بیانہ میں آگیا۔
 سلیم شاہ سوری اس وقت آگرہ میں تھا۔ شیخ کی شہرت سنی تو آگرہ
 میں بلایا۔ شیخ اپنے مریدوں کے ساتھ جو ہر وقت زرہ پہنے، ہتھیار
 لگائے رہتے دربار شاہی میں آیا۔ آداب و مراسم کو بالائے طاق
 رکھ کر موافق سنت نبوی "اسلام علیکم" کہا۔ سلیم شاہ نے بڑی کراہت
 سے جواب دیا شیخ کی یہ حرکت حاضرین دربار کو ناگوار گذری۔ اہل
 غرض نے سلیم شاہ کے کان پہلے ہی بھر دیے تھے کہ امام مہدی تمام
 جہان کے بادشاہ ہوں گے اس لیے ضرور ہے کہ اس شخص کا ارادہ
 بھی خروج و بغاوت کا ہو۔ درباریوں میں سے ایک امیر نے شیخ علانی
 کی شکستہ حالی اور پھٹے پرانے کپڑوں اور ٹولی ہوئی جو تینوں پر پھلتی
 بھائی کہ یہ حال اور ہیبت کذالی اور دعویٰ شاہی۔ کیا ہم افغان مرگے
 گئے ہیں کہ ایسے ایسے گناہوس شاہی کرتے ہیں۔ شیخ علانی پر
 سلیم شاہ کے غصہ اور درباریوں کی یادہ گولی کا کچھ اثر نہ ہوا۔ حسب معمول

قرآن شریف کی چند آیات سے تقریر مشروع کی۔ اس میں دنیا اور دنیا والوں کی مذمت اور احوال قیامت اور دین فرود ش علما نے بے عمل کو آڑے ہاتھوں لیا۔ سلیم شاہ اور درباری مہوٹ ہو کر رہ گئے۔ اور انھوں نے زار زار روتے لگے۔ آخر بادشاہ اٹھ کر محل سرا میں گیا۔ اور وہاں سے شیخ علانی اور اس کے رفقاء کے لیے کھانا بھیجا۔ مگر ان میں سے کسی نے نہ کھایا۔ سلیم شاہ نے واپس آکر سب دریافت کیا تو شیخ علانی نے بے دھڑک جواب دیا کہ تمہارا خزانہ بیت المال ہے جس پر رب مسالوں کا حق ہے، اس پر تمہارا ذاتی تصرف بے جا ہے۔ اور تمہارا کھانا بھی اسی قسم کا ہے۔ سلیم شاہ کو غصہ تو آیا مگر ضبط کیا۔ پھر علماء کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ آپ لوگ مسد مہدویت و مہدی کے بارہ میں کیا کہتے ہو۔ میر رفیع الدین صفوی نے وہ احادیث بیان کیں جن میں ام مہدی موجود کی علامات مذکور ہیں۔ شیخ نے جواب دیا کہ تم شافعی ہو اور ہم حنفی ہیں، ہمارے اور تمہارے عقاید میں بڑا فرق ہے اور تمہاری توجیہ اور تاویل ہمارے واسطے سند نہیں۔ اور نہ ہم تسلیم کرتے ہیں اس لیے تمہارے استدلال کو کس طرح قبول کریں۔ البتہ اس مجلس میں حنفی علماء موجود ہیں۔ اگر وہ کچھ کہیں تو میں بھی سنوں گا۔ بادشاہ نے ملا عبداللہ محرم الملک کی طرف دیکھا۔ یہ بادشاہ کے مقربوں میں سے تھا۔ شیخ علانی نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ تو دنیا دار فاسق ہے اور عہدہ قضا کے لائق نہیں۔ علانیہ تیرے گھر سے باہوں کی آواز سنائی دیتی ہے۔ حدیث صحیح میں آیا ہے جو مکھی نجاستوں پر بیٹھی ہے وہ اس عالم سے بدرجہا بہتر ہے جس کا شیوہ بادشاہوں اور امیروں کی

خوشامد ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیخ علانی کو علماء عصر کے حالات کا
 بخوبی علم تھا۔ محذو الملک تو اپنا سامنے لے کر رہ گیا۔ ملا جلال دانشمند اگر وہ
 موجود تھا اس نے وہ حدیث بیان کی جس میں امام مہدی کا علیہ موجود
 مذکور ہے۔ اور لفظ "اجل الجبیبہ" لغتوہ جسم اور بہ تشدید عدم جو جلال
 سے مشتق ہے اور جلیل کی تفصیل ہے پڑھا شیخ نے نفرت انگیز لہجہ میں
 کہا کہ تو نے عوام کا لالعام میں اپنے آپ کو بہت بڑا عالم مشہور کر رکھا
 ہے۔ حالانکہ عربی کا ایک فقرہ بھی صحیح نہیں پڑھ سکتا۔ حدیث کے نکتوں
 اور باریکیوں اور اشاروں کو کیا خاک سمجھے گا، یہ لفظ "اجل الجبیبہ" جلی کی
 تفصیل ہے نہ کہ تیرے نام جلال کی۔ بے چارہ ملا ایسا شرمندہ ہوا کہ پھر
 نہ بولا۔ اسی مجلس میں شیخ مبارک بھی موجود تھا جس کے دو بیٹے فیضی اور
 ابوالفضل اکبری دربار کے رتن ہوئے شیخ علانی کے علم و فضل کا قائل ہو
 گیا۔ اکر کے زمانہ میں علانے اس کی سخت مخالفت کی تھی بلکہ فتویٰ کفر
 و قتل بھی صادر کیا تھا اس پر بھی مہدوی ہونے کا شبہ کیا جاتا تھا۔ علماء
 دربار تو دم بخود بیٹھے تھے سلیم شاہ میران تھا کہ شیخ علانی کی نسبت کیا
 حکم صادر کرے۔ آخر شیخ علانی کو اپنے قریب بلا کر کہا کہ اگر چکے میرے
 کان میں عقیدہ مہدویہ سے انکار کرو تو اپنے تمام ملک کا لقب مقرر
 کرتا ہوں۔ اور تم ہمیشہ قرآن شریف مجھے سنایا کرو، شیخ نے سلیم شاہ کا
 پیشکش رو کر دی مردست سلیم شاہ نے بھی یہی مناسب خیال کیا کہ شیخ
 کو احترام کے ساتھ رخصت کر دیا۔ شیخ نے بھی اگر وہی میں ڈیرے
 ڈال دیئے دربار شاہی میں جو کچھ علماء کی گت بن چکی تھی وہ عوام سے
 پوشیدہ نہیں رہ سکتی تھی۔ چند روز میں صدا ہوا اشخاص حلقہ مہدویہ میں

شامل ہو گئے۔ مخبر سلیم شاہ کو روزانہ خبر دیتے کہ آج فلاں امیر اور
 فلاں سردار شیخ کا مرید ہو گیا۔ اور اس کا حلقہ ارادت روز بروز
 وسیع ہوتا جاتا ہے۔ ملا عبداللہ مخدوم الملک جو اندر ہی اندر
 بیچ و تاب کھا رہا تھا سلیم شاہ کو شیخ کے قتل پر تعجب دے رہا
 تھا۔ مگر سلیم شاہ کا دل اندر ہی اندر بیٹھا جاتا تھا۔ آخر بعد مشکل و
 خروج کا حکم دیا۔

اس مقام پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ملا عبداللہ مخدوم الملک
 کا کچھ حال بتایا جائے۔ اسی پر اس زمانہ کے علما کی عام ذہنیت کا اندازہ
 ہو سکتا ہے۔ یہ ملا سلیم شاہ کا مقرب اور عہدہ قضا پر فائز تھا۔ جب
 افغانی حکومت کا خاتمہ ہوا۔ اور اکبر نے مغلیہ سلطنت قائم کی تو یہ
 ابن الوقت اکبر کے مقربوں میں داخل ہو گیا۔ اکبر نے اسے صوبہ پنجاب
 کا قاضی القضاات مقرر کیا۔ اگرہ پائے تخت مغلیہ میں صدر الصدور
 شیخ عبدالبنی امام بو حنیفہ کی اولاد سے تھا۔ بقول بدایونی اکبر اس
 کی جو تیاں سیدھی کرتا تھا۔ اگرہ میں شیخ عبدالبنی لود لاہور میں مخدوم الملک
 دینی خود مختار بادشاہ تھے۔ جو چاہتے کر گذرتے۔ اکبر پیدائشی سیاسی
 آدمی تھا۔ اس نے دیکھا کہ دین کے نام پر دنیوی حکومت تو ان ملاؤں
 کی ہے۔ اور عمام کے دلوں پر حکومت کرتے ہیں۔ ان کا زور توڑنے کے
 لیے اسے خوب سوچھی۔ ایک مجلس مذاکرہ علمیہ منعقد کی اور بڑے بڑے
 جنادری ملاؤں کو دعوت شمولیت دی، بطاہر مقصد یہ تھا کہ تمام اختلافی
 مسائل پر علماء مجتہد کے بعد متفق ہو جائیں تو وہی شریعت اسلامیہ مملکت
 میں نافذ کی جائے۔ بدایونی ان مجالس میں موجود ہوتا۔ وہ کہتا ہے

کہ مسلمانوں کی یہ حالت تھی کہ ایک ہی شے کو اگر ایک خادم
کہتا تو دوسرا حلال ثابت کرنے کے لیے ایڑی پھٹی کا زور لگا دیتا اور
دونوں روایات اور فقہاء کے اجتہادات کا پورا دیتے ہیں بحث کی
کرمی میں تو تو میں میں سے لڑائی تک نوبت پہنچ جاتی۔ اگر خود مناظرہ میں
شامل ہوتا۔ ایک روز کہا کہ اگر کوئی آداب مجلس کا لحاظ نہ کرے گا تو آئندہ
اسے مجلس میں شرکت کی اجازت نہ ملی جائے گی اور دوران مناظرہ میں
کوئی ناشائستہ کلمہ کہا تو نکلوا دیا جائے گا۔ ہدایوں لکھتا ہے کہ میں قریب
ہی بیٹھا تھا دلی زبان سے کہا کہ پھر تو نسب بھی اس لائق ہیں کہ نکلوائے
جائیں۔ اگر نے سن تو لیا تجاہل عارفانہ سے کام لیا اور مجھے کہا کہ کیا کہتے
ہو میں نے کہا کہ سھنور پرخ فرماتے ہیں۔ علامہ ہی ایسے شستہ زبان ہوں
تو عوام سے کیا توقع ہو سکتی ہے۔ غرض علامہ نہ صرف دربار اکبری میں
ذلیل ہوئے بلکہ لوگوں کی نظروں سے بھی گر گئے۔ ان کے سرغنہ یہی
عبدالبنی اور مخدوم الہک تھے۔ دونوں کے نام حکم صادر ہوا کہ مکہ معظمہ
جاؤ۔ اور جب تک واپسی کا حکم نہ ہو وہیں رہو۔ لاکھوں روپیہ ان
کو دیا اس میں سے وہاں کے مسکین کے لیے بھی کافی رقم تھی۔ اس کے
حکم کی تعمیل کے سوا چارہ کار بھی نہ تھا یہ کس منہ سے کہتے کہ ہم حج کو نہیں
جاتے۔ چارو ناچار جانا ہی پڑا۔ اگرچہ روپیہ پیسہ کی کمی نہ تھی۔ ضرورت
اکبر اور بھی بھیج دیا مگر وہ حکومت کا نشہ تھا جو مسند قضا پر سرشار رکھتا۔
جسم تو حرم کعبہ میں تھا مگر دل ہندوستان میں، سن یا کہ میرزا حکیم نے
کابل میں علم بناوت بلند کیا ہے۔ ایک ملحد بادشاہ کے خلاف
ایک دیندار کی حمایت فریضہ مذہبی تھا۔ دونوں چل پڑے، بندر گاہ

سورت پر اترے تو دریافت پر یہ خبر ہوئی رہا سنی کہ حکیم کی بناوٹ
 تو چند روزہ تھی۔ فرد ہو گئی۔ مخدوم الملک تو پیٹ پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اسہال
 شروع ہو گئے اور جائزہ ہونے لگا۔ عبدالبنی ذرا سخت جان واقع ہو
 تھا۔ اگرہ میں آیا تو اکبر نے قید میں ڈال دیا۔ ٹوڈر مل سے کہا کہ اس سے
 اس سے پیسہ کا حساب لے جو اہل حرم مکہ کے لیے دیا گیا تھا۔ ٹوڈر مل نے
 ایسا شکنجہ میں لیا کہ شیخ نے خیر دنیوی اور سعادت اخروی اسی میں
 دیکھی کہ اس بلائے بے اماں سے جان بچائے قیامت میں حساب
 کتاب سہل تر ہے۔ چند روز کے بعد فوت ہو گیا۔ کسی گھر کے بھیدی
 نے خبر دی کہ عبداللہ مخدوم الملک کے مکان میں جو چند قبور ہیں
 ان کی زیارت نفع بخش رہے گی۔ کھلی گئیں تو چاندی اور سونے کی
 اینٹیں برآمد ہوئیں۔

یہ تھے چوٹی کے علماء انہی کے حالات پر دوسروں کو بھی قیاس کرنا
 شیخ علانی جیسے زاہد و عابد درویش کا مقابلہ یہ کیا کر سکتے تھے۔
 اگرہ سے شہر بدر ہوا تو دکن میں آیا۔ یہاں ہمدویہ کا پہلے ہی بڑا
 زور تھا۔ "ہمدیہ" میں پہنچا تو حاکم جس کا لقب اعظم ہمایوں شروانی
 تھا مرید ہو گیا۔ اودھا لشکر چند روز میں حسلقہ ارادہ سے میں داخل
 ہو گیا۔ ادھر سلیم شاہ کو ان حالات کی اطلاع ہوئی تو بہت گھبرایا
 پھر شیخ کی طلبی کا فرمان صادر ہوا۔ اس وقت علماء وقت کی بن آئی
 ان کا سرغنہ مخدوم الملک تھا۔ قتل کا فتویٰ صادر کیا۔ سلیم شاہ سمجھ
 گیا کہ مخدوم الملک اہل غرض ہے اس لیے حکم دیا کہ شیخ بدھ کی طرف
 رجوع کیا جائے۔ اس کے علم و فضل کا شہرہ دور دور تک تھا لہذا اس

میں کچھ شک نہیں کہ اس پایہ کا عالم اس وقت ہندوستان میں نہ تھا۔
 صاحب تصنیف بھی ہے ملک الضار تاضی شہاب الدین جو پوری کی
 کتاب الارشاد پر شرح لکھی، شیر شاہ سوری اتنا معتقد تھا کہ ہوتیاں
 سیدھی کرتا تھا۔ شیخ غلامی کو اس کے پاس بھیج دیا۔ غرض یہ کہتی کہ پہلے
 اس کی سن لو پھر جو کچھ مناسب ہو فتویٰ دو۔

اسے اتفاق نا ظالم ہی کہنا چاہئے کہ شیخ غلامی مسہ چند ملازمان
 شاہی و علماء کرام شیخ بدھ کے دروازہ پر پہنچے تو کسی خوشی کی تقریب
 پر گھر کے اندر سے گانے بجانے کی سریلی ریلی آوازیں آرہی تھیں۔
 اور بعد میں معلوم ہوا کہ کچھ ایسی رسمیں بھی ادا ہو رہی تھیں جو شرعاً
 ممنوع ہیں اور مسلمانوں نے ہندوں سے اختلاط کی وجہ سے سیکھیں،
 شیخ غلامی کا سیاب جوش انتہائی درجہ پر پہنچ گیا۔ شیخ بدھ اس وقت
 بہت فصیح العر تھا بات کرنے کی بھی طاقت نہ تھی۔ اور اسی نسبت
 سے شنوائی بھی کمزور تھی۔ شیخ غلامی نے جوش میں آکر کہا کہ آپ کے
 علم و فضل کا شہرہ تو بہت سنا تھا مگر عمل آج دیکھا شیخ کے بیٹوں
 نے جواب دیا کہ ہندوستان میں ایسی رسمیں رائج ہیں کہ اگر ان سے
 منع کیا جائے تو ناقص العقل تصور میں خیال کرتی ہیں جان یا مال کا ضرر
 نقصان ہو گا۔ لہذا اگر اتفاقاً ایسی صورت ہو جائے تو کہتی ہیں کہ اسی
 رسم کے نہ ادا کرنے کا وبال ہے۔ اس عقیدہ کی وجہ سے بالکل کافر
 ہو جاتی ہیں ظاہر ہے کہ کافر ہونے سے ان کا فاسق رہنا ہی
 قیمت ہے۔ شیخ غلامی نے جواب دیا کہ عند گناہ بدتر از گناہ جب
 شروع سے یہ اعتقاد ہے کہ ایک گناہ ترک کرنے سے نقصان

جان و مال ہونا ہے اور اتباع سنت نبوی سے آدمی کی موت کا بھی خطر ہے تو ایسے عقیدہ کا مالک شروع سے ہی کا فر ہے نہ اس کے اسلام کا لحاظ کیا ضرور ہے۔ بلکہ صحت نکاح میں بھی کلام ہے۔ لہذا جب ایسے عالم و قاضی لوگوں کے گھروں کا یہ حال ہے تو معلوم نہیں کہ تمام مسلمانوں پر اس کا کیا اثر ہوگا۔

شیخ ہدوہ طبیب منصف مزاج بزرگ تھے، فوراً راگ رنگ بند کر دیا اور توبہ استغفار کی اور شیخ علانی کی بہت تعریف کی۔ بعد ازاں سلیم شاہ کو ایک خط کہ مسئلہ مہدویت اصول مذہب نہیں ہے اور اس کے انکار و اقرار پر انحصار ایمان نہیں۔ علاوہ ازیں اہم مہدی کے علامات میں بڑا اختلاف ہے اس لیے شیخ علانی کے کفر یا فسق کا حکم نہیں دیا جاسکتا، بد قسمتی سے یہ خط سلیم شاہ تک نہیں پہنچا، اس کی جگہ ایک اور خط ملا جس میں مرقوم تھا کہ آج ملا عبداللہ محمدوم الملک کا علم و فضل میں تدبیر نہیں۔ وہ جو بھی فتویٰ دے صحیح ہے، ظاہر ہے کہ یہ سب رد و بدل ملا صاحب ہی کی کرتوت تھی۔ شیخ علانی سلیم شاہ کے سامنے آیا تو اس نے کہا کہ میں اہم مہدویت کے لیے کہتا ہوں کہ عقیدہ مہدویت سے توبہ کرو، شیخ نے انکار کیا۔ اس پر سزائے تازیانہ تجویز ہوئی۔ شیخ علانی نہایت الجبہ تھا۔ ان دنوں بلاتحون کی ذبا بھی عام تھی، شیخ کی گردن پر بھی ایک دائرہ نکلا ہوا تھا۔ میسرے درے پر جان بحق تسلیم کی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون، لعن یا تھی کے پاؤں سے ہاتھ کر تھیری گئی۔ تجہیز و تکفین کی ممانعت کی گئی مگر اسے اتفاق کہو یا شیخ کی کرامت کہ اس وقت اس زور کی

اندھی آئی کہ جہاں روشن تیرہ دتار ہو گیا۔ ہر ایک شخص جو اس باختر
 کہہ رہا تھا کہ اب سلیم شاہ کی دولت کو زوال آیا۔ اس کے بعد لوگوں
 نے نیش پر اس قدر کھول برسا ئے کہ پھولوں کے نیچے دب گئی عبدالقادر
 بدایلی جو ان واقعات کو قلم بند کر رہا ہے لکھتا ہے کہ میں اس
 وقت بارہ سال کا لڑکا تھا

اس مقام پر مناسب معلوم ہوتا کہ اس بات کا بھی ذکر کیا
 جائے کہ سید محمد سوم جو پوری خاندان چشتیہ سے منسلک تھے اور آپ
 کے تبعین کو بھی اسی خاندان سے لگاؤ تھا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ سماع اور
 قتالی مزامیر کے ساتھ چشتیوں میں عام رائج ہے اس فرقہ ہندوؤں کو
 اس سے انکار کی وجہ کیا ہے؟ حقیقت یہ ہے اور یہ تاریخی واقعہ
 بھی کہ خواجہ معین الدین اجمیری ہندوستان میں بحیثیت مبلغ اسلام
 وارد ہوئے تھے۔ اور اجمیر میں جو کفر گرہ تھا اور پر تقویٰ راج
 کی مملکت میں شامل تھا ایک تبلیغی مرکز قائم کیا۔ اپنے فارغ التحصیل
 مریدوں کو مختلف مقامات کی طرف تبلیغ کے لیے بھیجتے رہے۔ چنانچہ
 خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کا تبلیغی حلقہ اثر دہلی تھا۔ اس وقت
 تک چشتیہ میں سماع نہیں پایا جاتا۔ خواجہ قطب الدین اجمیری کے
 خلیفہ بھی تھے۔ اس وقت اسلامی حکومت قائم ہو چکی تھی۔ اور شمس الدین
 التمش دہلی میں حکمران تھا۔ اور خواجہ قطب کا مرید بھی تھا۔ خواجہ قطب
 نے دیکھا کہ ہندو بہت کم تعداد میں آپ کی مجلس و عہد میں شریک
 ہوتے ہیں۔ تحقیق پر معلوم ہوا کہ ہندوستان میں عبادت بھی ناگ ہی

میں ادا ہوتی ہے اور ہندو موسیقی کے بہت دلدادہ ہیں۔ اگر مجلس وعظ میں اس کی بھی چاشنی ہو تو اثر خاطر خواہ ہو گا۔ خواجہ قطب الدین نے اس بارہ میں قاضی حمید الدین ناگوری سے فتویٰ طلب کیا اور صورت حالات سے بھی آگاہ کیا۔ قاضی صاحب نے لکھا کہ خوش الحانی بہر حال پسندیدہ ہے مگر رگ رنگ اور وہ بھی مزا میر کے ساتھ محقق خط نفس ہے اور اکثر خرابیوں کا موجب ہے۔ خوش الحانی سے آیات قرآن اور اخلاقی غزلیں اور حمد و نعت میں نظمیں تو مباح ہیں مگر مزا میر ہرگز استعمال نہ کئے جائیں۔ خواجہ قطب الدین کے خلیفہ باوا فرید الدین شکر گنج اور آپ کے مرید خلیفہ نظام الدین لویا اور آپ کے مرید امیر خسرو تھے۔ امیر بلند پایہ شاعر تھا اور موسیقی کا بھی ماہر تھا۔ اس نے قول "ایجاد کیا جو اب قوالی سے موسوم ہے۔ اور مستار" بھی اختراع کی۔ لیکن تاریخی واقعات سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ بہت عرصہ تک مزا میر یعنی موسیقی سازوں طبلہ وغیرہ کا دخل چشتیہ کی محفل سماع میں نہ ہوا۔ اور جو زیادہ پابند شریعت تھے۔ وہ اس سے ہمیشہ کنارہ کش رہے۔ اپنی بزرگوں میں سید محمد جوہنورا اور آپ کے متبعین شیخ علانی وغیرہ تھے اور علماء اسلام تو ہمیشہ اس کے مخالف رہے ہیں۔

ملا عبد اللہ مخدوم الملک کا دل اب بھی ٹھنڈا نہ ہوا۔ شیخ عبد اللہ نیازی کے خلاف سلیم شاہ کو بھڑکایا کہ عقاید مہدویہ کا شائع کرنے والا یہی شخص ہے۔ اس کی بھی طلبی ہوئی۔ حقیقت یہ ہے کہ ملکیت اور ملائیت وہ دینی اور دینی حکومتیں ایک دوسرے کی راز دار ہیں۔

یکے وزو باشد و گر پر وہ وارہ اور ایک کے بغیر دوسرے کا قیام ممکن نہیں۔
 گرو نیوی حکومت کبھی اڑھے تو اسے جلدی ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ دینی
 حکومت سے بگاڑ اچھا نہیں۔ یازنی جب باریاب دربار سلطانی ہوا تو
 حسب معمولہ اسلام علیکم کہا ایک درباری نے گردن دہائی کہ بادشاہ کو
 سلام اس طرح کیا کرتے ہیں۔ یازنی سخت برا فرختہ ہوا آخر یہ بیجان ہی
 تھا کہا کہ جو سلام سنت رسول اللہ ہے میں اس کا پابند ہوں۔ اس
 کے سوا کوئی اور نہیں جانتا۔ سلیم شاہ کے اشارہ پر درباریوں نے
 زود کوب شروع کر دی۔ جب تک ہوش بجا رہے زبان پر رہتا
 اغفر لنا ذنوبنا و اسی اذنا فی امرنا و شیت اقدامنا و انعمنا علی القوم الکافرین
 سلیم شاہ نے پوچھا کیا کہتا ہے ملا عبداللہ مخدوم الملک نے کہا کہ مجھے
 اور مجھے کافر کہتا ہے۔ بادشاہ کا غصہ اور بھڑکا۔ ٹا کر وہ گناہ نیازی
 زود کوب کا کب تک متحمل ہوتا۔ بے ہوش ہو گیا۔ سلیم شاہ نے سمجھا
 کہ مر گیا۔ زندگی نے کچھ دن لگا رکھے تھے لوگ اٹھا کر لے گئے۔ مگر
 اس کے بعد بیان سے ہجرت کی۔

سلیم شاہ ان واقعات کے بعد دو سال زندہ رہا۔ مرا تو برادر زادہ
 ابراہیم نے حکومت سنجال لی یہ اندلی کے نام سے مشہور ہے۔ خوشامیلا
 نے "علی" بنا دیا۔ اس کے سپہ سالار ہیموں بقال کو پانی پت کے
 میدان میں بیرم خاں سپہ سالار منلیہ افواج نے شکست دی۔ اور
 اس کے ساتھ سوری خاندان کا چراغ حکومت بجھ گیا۔

عبداللہ یازنی مہر ہند میں مقیم ہوا۔ مہر ہند اہل میں مشہور مذہب ہے
 یعنی شیروں چیتوں کا جنٹل، بڈ کر مہر ہند ہوا۔ اکبر سے دو تین دفعہ ملاقات

ہوئی۔ بادشاہ نے کچھ زمین مدد معاش کے لیے دی، انکار کیا مگر
خواہ مخواہ فرمان لکھ دیا۔ مجبوراً فرمان لے لیا مگر قبضہ نہ کیا۔ تمام عمر
توکل پیتہ رہے۔ نوے سال کی عمر میں ۹۹۳ھ انتقال کیا۔

عبدالقادر بدایونی عہد اکبر شاہی میں اولیاء اللہ کے ذکر میں
شیخ برہان الدین کی نسبت لکھا ہے کہ زاہد اور متقی اور متوکل،
تعلقات سے آزاد، صاحب استغنا اور گوشہ نشین بزرگ تھے۔

میاں الوداد باری مالابو ایک واسطہ سے سید محمد جو پوری کے مرید
تھے فیض بطنی حاصل کیا۔ مجاہدہ اور ریاضت ایسی سخت کی کہ ایک
ہفتہ درانی نظر آتے تھے۔ کالی میں ایک تنگ و تاریک حجرہ میں

ذکر و فکر مراقبہ میں مشغول رہتے، پاس انھیں موافق طریقہ مجددیہ
ان کا معمول تھا۔ قرآن شریف کی تفسیر بہت اچھی طرح بیان کرتے تھے

اگرچہ علوم عربیہ میں سے کچھ نہ پڑھا تھا۔ کشف القلوب آپ کو حاصل تھا۔
۹۹۴ھ کا ذکر ہے کہ بدایونی اور ایک اور شخص مہر علی سلدوز شیخ
کی ملاقات کو گئے۔ مہر علی اگرچہ درویش دوست تھا مگر مردم آزار

بھی تھا۔ آج اپنے نوکروں کو سخت زود کوب کی تھی اور فحش گالیاں بھی
دیں۔ جب دونوں شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو شیخ نے یہ
حدیث پڑھی۔ قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم

المسلم من سلم المسلمون من لسانہ وریحہ
اور اس کے بعد بہت سے نکات بیان فرمائے، مہر علی سخت نام ہوا
عند بخاری کی، مذہبوں کی مگر قبول نہ ہوئی شیخ مجددی نے سو برس
کی عمر میں ۹۹۴ھ میں وفات پائی۔ تاریخ وفات ہے دل گفت کہ شیخ اولیاء

ایک اور بزرگ شیخ ابو لفتح گجراتی سید محمد جو پوری کے دانا دتھے۔
 مگر سید کو دیکھا نہ تھا یہ قرابت بعد وفات سید محمد واقع ہوئی صاحب
 جاہ و جلال و حال و اہل کمال تھے۔ طریقہ مہدویہ پر ثابت قدم تھے۔
 آگرہ میں جہان کے دوسرے کارسے پر شیخ بہاؤ الدین مہدی کے محلہ میں
 رہائش تھی، اس جگہ بدایونی ملاقات کے لیے گیا، اثنا ملاقات میں یہ حدیث
 پڑھی۔ لا یقعد قدم یدکر و ان الله الاخفتم الملائکة و غشیتم الرحمة انزلت علیہم
 السکینة و ذکرہم اللہ فی من عندہ اس کا ترجمہ بھی بیان فرمایا۔ اس کا اثر یہ ہوا
 کہ عبدالقادر بدایونی لکھتا ہے کہ میں نے بھی ذکر شروع کر دیا۔ وہ خود بیان
 کرتا ہے کہ قرآن شریف کے معانی کا انکشاف مجھ پر ہونے لگا اور
 مدت تک یہ حال رہا کہ جو آواز میرے کان میں آتی اس کو میں ذکر
 ہی سمجھتا۔ شیخ کے بعض مرید اپنے لبوں کو سریش لگا کر بند رکھتے
 اور بعض کے لنگریاں منہ میں ڈال رکھی تھیں۔ کہ بے فائدہ گفتگو نہ کریں۔
 فرقہ مہدویہ آج بھی موجود ہے۔ دکن میں اسے فروغ رہا۔
 اب پاکستان میں بھی اس کے متبعین ہیں۔ اس فرقہ کے ایک ممتاز شخص
 سید علی عرف میاں عالم نے چند رسالے اپنے عقاید کی تائید میں
 لکھے جو ۱۹۲۱ء میں شائع ہوئے، ماضی دلاور علی حاکم دارالقضاہ حیدرآباد
 کو مخاطب کر کے کہا کہ جواب لکھو۔ مولوی محمد زماں خاں صاحب شاہ
 جہاں پوری نے جواب میں ہدیہ مہدویہ لکھا۔

سہ شنبہ ششم ذالحجہ ۱۹۲۱ء کا واقعہ ہے کہ پرنس آف ویلز
 یعنی ایڈورڈ ہفتم آنجہانی ہندوستان میں تشریف فرما تھے۔ مولوی
 محمد زماں حسب معمول نماز مغرب سے فارغ ہو کر تلاوت قرآن مجید

میں مشغول تھے کہ ایک نوجوان مسجد میں خنجر بکف داخل ہوا اور چند
ضربوں میں مولوی صاحب کا کام تمام کر دیا۔ آریہ کریمہ۔ بانظر کیفیت
کیف کان عاقبتہ المتیقن پر قطرات خون شہادت کا نشان تھا۔ معلوم نہیں
متیقن کا اشارہ کس طرف ہے۔

تبصرہ

ان اوراق میں ہم نے مہدویت اور مدعیان مہدویت کے حالات
بیان کئے ہیں۔ سید محمد جو پوری کے بعد بھی اور کئی ایک مہدی ہوئے
اور گذر گئے۔ غالباً اور بھی آئیں گے اور اسی طرح گذر جائیں گے۔ اور ان
کے مقبضین ایک فرقہ کا اضافہ کرتے رہیں گے۔ ان میں سے بعض مہدی
ایسے بھی گذرے ہیں جن سے دعویٰ نبوت بھی منسوب کیا جاتا ہے
یا انہل تے خود دعویٰ نبوت کیا۔ اور اس قماش کے لوگ تمام عجمی ایرانی
نژاد تھے۔ اور ان کا مقصد اصل مزدکی مذہب کا احیاء تھا۔ رسم آریہ
میں ہر ایک ممتاز شخصیت دیوتا یا دیوتا کی اولاد اور بھگوان تھا۔ اس
لیئے ان مدعیان مہدویت کا دعویٰ الوہیت بھی تھا۔
نو حقیقت یہ ہے کہ اس عقیدہ نے گمراہیاں
بھی پیدا کیں اور غلط فہمیاں بھی۔ ورنہ اسلام
تو صرف تقویٰ کا قائل ہے، نہ کہ حسب
نسب کا۔ کاندریں۔ راہ فلاں ابن فلاں چیز نے
نبوت۔

حکیم نزوک ایرانی شہنشاہ قباد کے عہد میں آنحضرت کی ولادت

سے قریباً ایک صدی پیشتر گزرا ہے۔ اس نے اشتر اکیت کا پرچار کیا۔ ہمارے زمانہ میں تو اشتر اکیت کا مطلع نظر مساوات السانی و معاشیات یعنی سرمایہ داری کے خلاف جنگ ہے۔ اور رفتہ رفتہ حاکم و محکوم کا امتیاز محو کرنا ہے مگر حکیم مزدک کو ان مسائل پر دینی کاوش کی ضرورت نہ تھی۔ اس کا نظریہ صرف صنف ضعیف کی آزادی تک محدود تھا۔ اور اسی کو عملی جامہ پہنانا چاہتا تھا، یہ آزادی بھی انوکھی تھی۔ اس کا کہنا یہ تھا کہ ایک مکروہ صورت یا بوڑھا ایک قبول صورت نوجوان عورت کو پیہ لانا ہے۔ دونوں کا بوڑھا نامزدوں ہے۔ مناسب ہے کہ مکروہ صورت مرد اپنی خوب صورت عورت کو کچھ عرصہ کے لیے یا وقتاً فوقتاً کسی خوش گل نوجوان کے پاس بھیج دے۔ یہ نظریہ ہمارے ہندوستان کے "نیوگ" سے ملتا جلتا ہے۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس نے ہندوستان کے "عام مارگ" کو مانچ کیا جس میں کچھ تمیز ماں بہن کی نہیں۔ شہنشاہ قباد نے مزدکی مذہب قبول کیا اور یہ راج دھرم ہو گیا۔ قباد کے بعد اس کا بیٹا نوشیرواں تخت نشین ہوا تو حکیم بزرچہبر کے صلاح و مشورے سے مزدک کو قتل کیا۔ اور اس مذہب کی بیخ کنی کے درپے ہوا۔ مزدک کی بیوہ کا نام "غما" تھا۔ چونکہ عورت ذات تھی لہذا عورتوں کی آناہلی کا سندا اس سے بہتر مرد حل نہیں کر سکتا تھا اس لیے فرقہ مزدکیہ کا رجوع اسی کی طرف ہوا۔ یہ مذہب "خرمید" کہلایا۔ اسی مذہب کے پیروہ المسلم خراسانی اور بابک خرمی لہذا حکیم معنیح وغیرہ تھے۔ ابو مسلم بنو عباس کا دالی تھا۔ اور بنو فاطمہ کے حاحیان قاسم اور حسن بن صباح کے خلیفہ وغیرہ بہت تھے۔ سید امیر علی اپنی دہشٹی آٹ ساراہین میں لکھتے ہیں کہ بنو فاطمہ

ذوق باطن کے بانی ہیں اور داعیان بنو فاطمہ تے زرکشی اور مالوی آمد
 مزوی عقاید کو مسلمانوں میں شائع کیا۔ اور قرآن کے ظاہر الفاظ کے معنی
 اپنے عقاید کے مناسب جو کچھ سمجھتے بیان کرتے اس کی تاویل یہ کرتے
 کہ قرآن کا ایک ظاہر ہے اور دوسرا باطن اور باطن اہل شیعہ ہے۔
 اس حد تک تو ہم بہ وثوق کہہ سکتے ہیں کہ بنو امیر ہوں یا بنو عباس
 یا بنو فاطمہ ان میں سے کسی تے دعویٰ نبوت والوہیت نہیں کیا۔ صرف ایک
 خلیفہ ابو علی منصور الحاکم فاطمی کے بارہ میں کہا جاتا ہے کہ اس نے فرعون
 کی طرح دعویٰ الوہیت کیا۔ ۳۸۲ھ میں مصر کے تخت پر باپ کی وفات
 کے بعد متمکن ہوا۔ ابن خلدون لکھتا ہے کہ اس کی عادت تھی کہ رات
 کے وقت "المعلم" کی پہاڑی کی طرف نکل جاتا۔ یا تو اختر شماری کرتا یا
 خلوت میں عبادت، ایک رات حسب معمول دو آدمیوں کے ساتھ گیا۔
 مگر پھر واپس نہ آیا۔ تلاش کی گئی۔ پہاڑی کے قریب ہی ایک چشمہ پر
 اس کی سواری کے گدھے کے چاروں پاؤں کٹے ہوئے ملے اور چشمہ
 میں حاکم کا لبادہ جس پر خنجر کے نشان تھے ملا۔ لاش باوجود تلاش نہ
 ملی۔ اس سے ایک مذہب فسوب سے جو "تنبان" میں "الدروزیہ"
 یا "دروزی" سے موسوم ہے۔ ان لوگوں کا عقیدہ ہے کہ الحاکم زندہ
 ہے اور دوبارہ آئے گا۔ الحاکم کے بعد چند بے حقیقت خلفا فاطمہ
 ہوئے جن کی حکومت مصر کے محدود رقبہ میں تھی۔ اور آخر اس خلافت
 کا خاتمہ ہو گیا۔

ہم اس موضوع پر کافی بحث کر چکے ہیں کہ ابتدا میں صرف ایسی
 ہی پیش گوئیاں شائع ہوتی رہیں کہ ایک شخص کی آمد کا انتظار کرنا چاہئے

یہ یا تو فاطمہ سے ہو گا یا سلمان فارسی کا کوئی نہمقدم، غرب اور اہل عرب میں تو یہ تحریک کچھ عرصہ ندروں پر رہی جب ان پیش گوئیوں کے مخبرین کا مقصد حاصل ہو گیا تو یہ بھی ختم ہو گئی۔ مگر ایرانی اور اہل ایران کا مقصد حاصل نہ ہوا اس لیے وہاں اس کا زور بدستور رہا۔ اور ہمارے نماز میں بہاء اللہ نے اس کا قائدہ خاطر خواہ اٹھایا۔ اور دعوتِ نبوت و رسالت والوہیت بھی کیا۔

اگر ہم ان مدعیانِ جہودیت کی سیاسی اغراض کو نظر انداز کر دیں جس کے ساتھ جہودیت کی تحریک وابستہ ہے تو ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ ہر ایک مومن مسلمان "مہدی" ہے۔ ہم روزانہ نمازوں میں دعا مانگتے ہیں کہ "اعدنا الصراط المستقیم" بار خدایا ہماری رہنمائی صراطِ مستقیم پر فرما۔ یعنی ہم بالاستقلال اسی روش پر قائم رہتے ہوئے سفر زندگی ختم کریں جو فطرۃً پسندیدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنہ میں سے ایک ہادی بھی ہے۔ لہذا آنحضرتؐ بھی بالبیع ہادی ہیں وانک لتدعوہم الی صراطِ مستقیم (توبہ) انک لتہدی الی صراطِ مستقیم ہے، "مہدی" تو ہر ایک ہدایت یافتہ مومن مسلمان ہے۔ جو سیدھے راستے پر ہو اور اس پر آنحضرتؐ بذریعہ قرآن رہنمائی فرما رہے ہیں۔ ہر ایک مسلمان کا ایمان ہے کہ وہ اسی روش پر چل رہا ہے۔ جسے اسلام سے موسوم کیا گیا ہے۔ لہذا اگر اسے اس کا یقین نہ ہو تو وہ مسلمان ہی نہیں۔

ہم صاف کر چکے ہیں "مہدی موعود" کا تخیل جو مسلمانوں میں پختہ ہو گیا تو یہ بالکل ممکن ہے کہ بعض اشخاص کو اس کا پختہ یقین تھا کہ وہ

جہدی موعود ہیں، سید محمد جو پوری کے بارہ میں تو ہم شواہد کی بنا پر بھی
 کہہ سکتے ہیں کہ اس نے دعویٰ جہودیت اسی یقین کے ساتھ کیا تھا۔
 ”الاعمال بالنیات“ نیتوں کو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ لیکن نیتوں کا حال
 اعمال سے معلوم ہوتا ہے۔ سید کو ہوس دنیوی حکومت و جاہ و جلال
 نہ تھی۔ وہ درویش تھا اور آخر عمر تک درویش رہا۔ سلاطین اس کے
 مرید تھے۔ وہ دنیوی مال و دولت جتنی چاہتا جمع کر سکتا تھا۔ اس
 نے یہ بھی پسند نہ کیا کہ اپنے مریدوں کی حدود مملکت میں مستقل رہائش
 رکھے۔ اس کے زہد و تقویٰ کا کیا ملکہ ہے۔ ملا عبدالقادر بدایونی سا
 کٹر ملاح بھی اس کے متبعین کی ولایت کا قائل ہے۔ جس شخص نے
 ایسے زاہد و عابد ولی اللہ پیدا کیے اگر وہ اپنے دعویٰ میں غلطی خورد
 بھی تھا پھر بھی یہ کوئی ایسی بات نہیں کہ علماء اسلام کفر کا فتویٰ صادر کریں۔
 بلکہ مخدوم الملک کی طرح واجب القتل ٹھہرائیں۔ ہمیں اس زمانہ کے فضل
 اجل شیخ بدھ سے کمال اتفاق ہے اور آج علماء اسلام کا بھی
 اس پر اتفاق ہے کہ مسد جہودیت سرے سے جہود دین ہی نہیں
 سید محمد کے سخت مخالفین بھی اس کے علم و فضل اور زہد و ورع اور
 اتباع شریعت اسلامیدہ کے معترف تھے۔ پھر یہ خود ساختہ عقائد ہی کا
 کرشمہ ہے کہ ایک نکمی بات پر کسی مومن مسلمان کو کافر اور واجب القتل
 قرار دیا جائے۔

پنجاب میں حکموں کی حکومت قائم تھی اور جہارا بہر رنجیت سنگھ اول
 و آخر حکمران تھا۔ سید احمد ریلوی نے سکھ حکومت کے خلاف اعلان
 جہاد کیا۔ اور لڑے۔ آپ کے رفیق مولیٰ محمد اسماعیل شاہ ولی اللہ محدث دہلوی

کے خاندان کے ممتاز فرد تھے۔ سید اور اس کے رفقا مجاہدین نے آنسو
ایک لڑائی میں شکست کھائی اور مولوی محمد اسماعیل شہید کی لاش تو ملی
مگر سید کی نہ ملی۔ آپ کے متبعین اب بھی سرحد میں موجود ہیں۔ ان
کو مخالفین "وہابی" کہتے ہیں۔ اور یہ تحریک ایک وقت اتنی زور پر تھی
کہ گورنمنٹ انگلینڈ نے اسے خلاف قانون جرم قرار دیا۔ کئی علماء پھالی
پاگئے۔ اور کئی جیس دوام کی سزا کے مستوجب سمجھے گئے۔ سید احمد
غفرانہ نے گورنمنٹ کی غلطی رفع کی۔ سید احمد بریلوی کے متبعین کا عقیدہ
ہے کہ آپ ہی مہدی موعود ہیں اور فوت نہیں ہوئے، روپوش ہیں اور
دوبارہ تشریف لائیں گے۔ لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ سید احمد
بریلوی سختی سے شریعت کے پابند تھے اور یہ کہ غیرت دینی نے آپ
کو آمادہ جہاد کیا۔ ایسے مومن جو صحیح معنی میں مومن ہیں۔ اگر دعویٰ مہدویت
بھی کریں تو گوہم ان سے تسلیم نہ کریں لیکن جہاں تک تبلیغ و اشاعت اسلام
سلف صالحین اور سنت رسول اللہ کے مطابق ہے ہمیں اس کی ذمہ داری
مخالفت ہی نہیں بلکہ حتی الوسع موافقت کرنی چاہیے۔ یہ تو میری ذاتی
رائے ہے کہ علماء اسلام کا شیوہ کافرگری نہایت مذموم ہے۔ کسی
اچھے بھلے مسلمان کو دائرہ اسلام سے کسی فرعی بلکہ خود ساختہ عقیدہ
کہ خارج کرنا نامناسب بات ہے۔ البتہ اگر کوئی شخص دعویٰ نبوت
یا الوہیت کرے تو وہ ہمارے نظام اسلامی سے خود بخود خارج ہو
جاتا ہے، ایسے شخص سے ہمارا کچھ سروکار نہیں۔ لیکن سید محمد جو پوری
اور سید احمد بریلوی سے بزرگ اس فتویٰ کی زد میں نہیں آتے۔
ایک عرض بیغرض ہم ان حضرات کے گوش گزار کرنا چاہتے ہیں

جو فرقہ بندی اور نثر انگیز فرقہ تفرقہ میں ماحالتہ یا حالتہ مبتلا ہیں کہ وہ خود عقاید سے علیحدہ ہو کر غور کریں کہ آیا وہ "لا تفرقوا" پر عامل ہیں؟ اور جب نص قرآنی سے یہ حقیقت ثابت شدہ ہے کہ ہمارا نام صرف "مسلم" ہی اللہ تعالیٰ نے مقرر فرما دیا ہے (وہو مسلم المسلمین) اور یہ کہ ہم مسلمان صرف "اللہ" اور "دین اللہ" سے وابستہ ہیں۔ تو کیا بشری شخصیت سے اپنے آپ کو وابستہ کرنا شرک کی حد تک نہیں پہنچتا؟ اور بشری ناموں کی پوجا نہیں؟ ارشاد قرآن ہے کہ

اذ قال الله يا عيسى ابن مريم و انت قلت للناس اتخذوني و اهل الهين من دون الله

جب اللہ نے پوچھا کہ اے عیسیٰ مریم کے بیٹے کیا تو نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو الوہیت کا درجہ دے کر اللہ کے سوا پوجیں تو اس نے عرض کی کہ سبحان اللہ مجھے اتنا حوصلہ کب تھا کہ حق کے سوا کچھ لود کہتا۔ اگر میں نے کوئی ایسا نادا جب کل کہا ہوتا تو جانتا ہی ہے کہ

اپنی زبان سے میں نے کبھی ایسا نہیں کہا اور نہ ہی میرے دل میں اس کی تمنا تھی کہ لوگ مجھے پوجیں اور میں اعماض کروں۔۔۔۔۔ جب ملک میں ان میں رہا وہ بھی (میرے سوا) تیرے سوا کسی اور کی بندگی نہیں کرتے تھے اور میں ان کا نگران حال رہا، جب تو نے مجھے وفات دی تو تو ہی ان کے عقاید اور اعمال سے بہتر واقف ہے، اگر تو انہیں عذاب دے تو تیرے بندے ہیں، بخش دے تو تیرا اختیار ہے اور تو زبردست حکمت والا ہے۔ انجیل میں خود مسیح کی شہادت انہی آیات کی تائید میں

ہے کہ واقعہ صلیب سے پیشتر اپنے اپنے بعد فارقلیط (احمد) کی
 بعثت کی بشارت (انجیل) اپنے سواروں کو دیتے ہوئے دعا کی کہ
 "دیالٹاب میں اس دنیا میں نہیں ہوں، لیکن یہ میرے
 متبعین موجود ہیں اور میں تیرے حضور آ رہا ہوں مقدس
 باپ ان کو اپنے ہی نام سے وابستہ رہنے دے
 جن کو تو نے میرے اتباع کے لیے دیا۔"
 "جب تک ہیں ان میں تھا ان کو تیرے ہی نام سے
 وابستہ رکھا جن کو تو نے مجھے دیا۔ میں ان کا نگران حال
 تھا۔ اور ان میں سے ایک بھی گمراہ نہیں ہوا مگر فرزند
 لعنت و ہلاکت تھا کہ نوشتہ رزبور ^۹ پورا ہو۔ (مقدس یوحنا ^{۱۱})
 فاضل رینا کی تحقیق کا حوالہ ہم دے چکے ہیں کہ سواروں نے اپنے آپ کو مونی
 اور انجان ہی کہتے اور مسیح بھی ان کو اپنا دوست ہی کہتے ہیں، جو کچھ
 میں نے تمہیں تعلیم دی اگر تم اس پر عمل کرو گے تو میرے دوست ہو
 (مقدس یوحنا ^{۱۱}) جیسے آنحضرتؐ کے متبعین کو "اصحاب" کہتے ہیں۔
 آنحضرتؐ کا زیادہ حق تھا کہ ہمارا نام جہلی یا احمدی تجویز فرماتے۔ ایسے
 ناموں سے ہمیں نامسلمان مخاطب کرتے ہیں ہمیں "مٹھن" اور اسلام کو
 "مٹھن ازم" سے تعبیر کرتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ انجیل کی بعض آیات سے مسیح کی "آمد ثانی"
 بعد واقعہ صلیب کا ثبوت ملا ہے مگر اس آمد ثانی کا مفہوم آپ نے
 واضح لفظوں میں خود ہی واضح فرما دیا تھا کہ "یہ نسل یعنی آپ
 کے معاصرین میں سے اکثر موت کے ذائقہ شناس نہ ہوں گے جب

مک ابن آدم (مسیح) کو دوبارہ آتے ہوئے نہ دیکھ لیں گے مقدس
متی ۱۶: ۱۶) یہ ارشاد مسیح تو اتر سے ثابت شدہ ہے۔ چنانچہ
مقدس مرقس ۱۶: ۷ اور مقدس مواتا (۱۶: ۷) بھی اپنے لفظوں میں
بھی کچھ روایت کرتے ہیں۔

ساریاں مسیح اس ارشاد کا مطلب نہ سمجھے اور بقول مقدس یوحنا
وہ آپس میں پرمی گولی کرنے لگے کہ "یہ کیا کہتا ہے کہ تم تقوڑی دیر
کے بعد مجھے نہ دیکھو گے اور پھر تقوڑی دیر کے بعد دیکھ لو گے" (مقدس
یوحنا ۱۶: ۱۶) ساریوں میں سے بعض نے آپ کو صلیب پر آدیزاں دیکھا اور
یقین کر لیا کہ مارے گئے۔ لیکن آپ صلیب پر فوت نہ ہوئے۔ اور
ایک دو گھنٹوں میں کوئی فوت بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ آپ کے ساتھ
ایک یا دو چوروں کو بھی صلیب دیا گیا تھا۔ چونکہ سبت "مشرع ہونے
والا تھا اور حسب الحکم توراہ سبت کے روز کوئی مجرم صلیب پر نہیں رو
سکتا تھا اس لیے چوروں اور آپ کو صلیب سے اتارا گیا۔ پھر تو زندہ
تھے اس لیے انہیں ہڈیاں توڑ کر قتل کیا گیا اور آپ کو دیکھا کہ مر چکے
ہیں۔ اس لیے آپ کو نہ چھیڑا گیا۔ سبت کے روز جھیز و تکفین کی رو
بھی ادا نہ ہو سکتی تھیں اس لیے آپ کے جسم کو ایک چادر میں لپیٹ
کر ایک قبر کے لحد میں جو یوسف آرتیبہا نے اپنے لیے تیار کی تھی
رکھ دیا کہ سبت کے بعد رسوم ادا کی جائے گی مگر جب سبت کے بعد
قبر پر آئے تو اسے خالی پایا۔

اس واقعہ کے بعد مسیح ساریوں سے ملے تو انہوں نے خیال
کیا کہ ہم "دوح" کو دیکھ رہے ہیں۔ لیکن جب آپ نے اپنا زخم جو رونما

سپاہی کے بھالے سے لگا تھا جب آپ صلیب پر تھے دکھایا اور ان کے ساتھ بیٹھ کر رعلی اور مچھلی کھائی تو وہ آپ کی پیش گوئی دوبارہ امد ثانی کا مطلب سمجھ گئے (مقدس متی ۱۲) مقدس مرقس ۱۶، مقدس یوحنا ۱۱، مقدس یوحنا ۱۲) آپ نے سوار یوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ میری وہ باتیں جو میں نے تم سے اس وقت کہی تھیں جو تمہارے ساتھ تھا کہ ضرور ہے کہ جتنی باتیں موسیٰ کی توراہ اور صحف انبیاء اور زبور میں میری بابت لکھی ہیں پوری ہوں، اس نے ان کا ذہن کھولا کہ صحیفوں کو سمجھیں اور ان سے کہا کہ یوں لکھا ہے کہ مسیح دکھائے گا اور تیسرے دن مردوں میں سے اُٹھے گا۔

اس وقت آپ کا ایک سواہی ہوتا "موجود نہ تھا۔ سوار یوں نے اسے کہا کہ ہم ربی (یہودی امام کو ربی کہتے ہیں) سے ملے ہیں تو اس نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ جب تک میں اپنی آنکھوں سے نہ دیکھوں گا اور پسلی کے زخم کو چھو کر اطمینان نہ کر لوں گا ہرگز یقین نہیں کر سکتا۔ مسیح کو سواریاں نے بھی اطلاع دی کہ موتا ایسا اور ایسا کہا ہے آپ اس سے بھی ملے اور کہا "موتا اچھی طرح مجھے دیکھ لے اور میری پسلی کے زخم کا بھی معائنہ کر لے" موتا نے کہا کہ ربی معاف فرما میں ایمان لایا۔ آپ نے کہا کہ "موتا تو مجھے دیکھ کر ایمان لایا۔ مبارک ہے وہ قوم (اہل اسلام) جو بن دیکھے ایمان لائیں گے کہ میں مصلوب اور مقتول نہیں ہوا۔ مقدس یوحنا ۱۲) یہ ہے مفہوم آیہ "وان من اهل الکتاب الا لیومنن بہ قبل موته۔"

ہم نے یہ واقعہ کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے تاکہ مسیح کی

آمد ثانی کا مفہوم واضح تر ہو جائے۔ یہی آمد ثانی تھی جس کو آپ کے معاصرین نے بچپن خود مشاہدہ کر لیا۔ یہی جو موت کی طرح یقین کرتے ہیں کہ مسیح صلیب پر فوت ہوا۔ تو ان کو موت کی طرح ایمان لانا چاہئے کہ آپ مردوں میں مردہ سمجھ کر رکھے گئے مگر فوت نہ ہوئے تھے اور اس سے بڑھ کر اور کیا شہادت ہو سکتی ہے کہ آپ "دوبارہ" حواریوں سے ملے اور ان میں چالیس دن رہے اور کھاتے پیتے رہے۔ یہی آمد ثانی ہے جو ہو چکی اب آمد ثالث کا انتظار بے فائدہ ہے۔

ارشاد قرآن حکیم ہے کہ :-

وما محمد الا رسول
قد خلت من قبله
المرسل افان مات
او قتل انقلبتم على اعقابكم
ومن ينقلب على عقبيه
فلن يضرا الله شيئا
وسيجزي الله الشاكرين

اور محمد ایک معزز رسول ہے، تحقیق اس سے پہلے بھی رسول تھے (جو فوت ہو چکے ہیں، اگر یہ طبعی موت سے مر جائے (جو یقینی امر ہے) یا مارا جائے (جس کا امکان ہے) تو کیا تم الٹے پاؤں (اسلام سے) پھر جاؤ گے، اور جو بھی پھرے گا تو وہ (دین) اللہ کا تو کچھ بگاڑ نہیں سکتا خود ہی گھاٹے میں رہے گا، اور جو شکر گزار بندے ہیں اللہ جلدی ہی ان کو جزاء بخیر دے گا۔

۴

یہ وہ آیات ہیں جو صدیق اکبر نے آنحضرت کی وفات پر اصحاب رسول اللہ کو مخاطب کر کے پڑھیں اور کہا کہ اگر تم محمد کے پرستار ہو تو دیکھ لو کہ وہ فوت ہو گئے ہیں اور اگر تم اللہ کو پوجتے ہو۔ تو وہ کی القیوم ہے۔

عارفِ رومیؒ لکھتا ہے کہ

عشق ہر مردہ نباشد پائیدار
عشق را بر حی و بر قیوم دار
زانکہ عشق مردگان پائیدہ نیست
زانکہ مردہ سوئے ما آئندہ نیست
عشق آن زندہ گزیر کو باقی است
وہ شراب جانفزایت ساقی است

مرنے والوں سے عشق پائیدار نہیں ہوتا
عشق اس سے لگا جو حی القیوم ہے
اسلئے کہ مرنے والوں سے عشق دیر پائیدار نہیں ہوتا
اور اسلئے کہ مرنیوالے ہماری طرف دوبارہ نہیں آتے
عشق کیلئے اسکو منتخب کرو جو باقی رہنے والا ہے
وہ جانفزا شراب پلانیا والا ساقی ہے۔

ہرچیز عشقِ فدائے احسن است
گر شکر خوردوں بود جان کھن است

اللہ تعالیٰ کا عشق احسن ہے اس کے سوا
کسی اور کا عشق اگر شکر کی طرح میٹھا ہو تو
بھی جان کنی موت ہے۔

نیز ارشاد قرآن ہے کہ

ان ہی الا اسماء سمیتوا
انتم و اباؤکم ما انزل
اللہ بہا من سلطان

بات یہ ہے کہ یہ تو صرف نام ہی نام ہیں
جو تم تے اور تمہارے بڑوں نے رکھ
لیے ہیں اس کی کوئی دلیل اللہ کی طرف سے
نازل نہیں ہوئی۔ یہ تو صرف ظن کی لور اس
چیز کی پیروی کرتے ہیں جس کی خواہش
ان کا نفس کرتا ہے۔

تلاویہ (۳۶)

جب ہم کسی بشری شخصیت سے وابستہ ہو کر اس کی موت کے بعد
اسے زندہ یقین کرتے ہیں اور اس کی آمد ثانی کے منتظر رہتے ہیں۔
یا کم از کم اس کے نام ہی کو زندہ کہتے ہوئے اس سے وابستہ ہو جاتے

ہیں تو ہم نادانستہ اسے الوہیت کا درجہ دیتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ انبیاء و مرسل اور اولیاء اللہ مقدس ہستیاں تھیں اور ہیں لیکن واجب احترام سے تجاوز کرنا انتہائی مذموم ہے۔
الرشاد قرآن ہے کہ

وَمَا كَانُ لِبَشَرٍ أَنْ يُوتِيَ
اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ
وَالنَّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا
عِبَادًا لِي مِنْ دُونِ اللَّهِ
وَلَكِنْ كُونُوا رَبَّانِيِّينَ بِمَا
كُنْتُمْ تُعَدِّمُونَ الْكُتُبَ وَبِمَا
كُنْتُمْ تُتَدَسِّسُونَ وَالْيَا مِرْكُمْ
أَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلَائِكَةَ وَالنَّبِيِّينَ
أَرْبَابًا وَيَا مِرْكُمْ بِالْكَفْرِ بَعْدَ
إِذْ أَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ﴿۱۳۱﴾

کسی آدمی کے لائق نہیں کہ اللہ تو دعلم کتاب لعد حکومت اور نبوت عطا فرمائے تو وہ لوگوں کو کہے کہ اللہ کو پھوڑ کر میرے بندے ہو جاؤ لیکن وہ کہے گا تو یہی کہ اللہ والے ہو جاؤ اور یہی کچھ تم کتاب میں پڑھتے ہو اور یہی درس تو جدید دیتے ہو، وہ یہ حکم نہیں کرے گا کہ ملائکہ اور نبیوں کو ارباب بناؤ۔ کیا بعد اس کے تم اسلام قبول کر چکے ہو تمہیں کفر کا حکم دے گا؟

لیکن یہ عقیدت ہی کا کرشمہ ہے کہ انبیاء و مرسل اور اولیاء اللہ نے تو بشری ناموں سے وابستگی سے منع کیا مگر قبضین نے اپنے آپ کو والیت ہی کر لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ناموں سے اپنے لیے ایک خاص امتیاز پیدا کر لیا۔ اور ایک دوسرے کو کافر کہنے لگا۔ انبیاء اور اولیاء تو اس لیے آئے کہ لوگوں کو محبوب حقیقی کا عاشق بنائیں مگر لوگ اپنی کو مقصود بالذات سمجھ کر اٹھتے بیٹھتے اور ہر حالت میں اپنی کے ذکر و خیر میں لگ گئے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دجال اور یاجوج و ماجوج کے بارہ میں بھی کچھ مختصر باتیں لکھی جائیں کیونکہ ان کے حالات کے بغیر ہندویت کی تاریخ مکمل نہیں ہوئی۔ ہندویت کا ظہور قرب قیامت کے آثار میں سے ہے۔ اسی طرح دجال اور یاجوج و ماجوج کا خروج بھی اسی منہج کا ہے۔

دجال

عام عقیدہ نصاریٰ اور اہل اسلام کا ہے کہ کسی زمانہ میں "دجال" آئے گا اور تمام کرہ ارض پر پھر جائے گا۔ وہ غیر معمولی قوت کا مالک ہو گا۔ اس کے ساتھ جنت کی نعمتیں اور عذاب و دوزخ ہو گا۔ اپنے قلعین کو نعمتوں سے بہرہ ور کرے گا۔ اور منکرین کو عذاب دے گا۔ چالیس دن کا دور دورہ رہے گا۔ پہلا دن ایک سال کی مدت کے برابر ہو گا۔ "دجال" کا قصہ طویل ہے اور اس سے ہر ایک شخص کم و بیش واقف ہے۔ "دجال" کو حضرت عیسیٰ نازل ہو کر مہدی کی مصیبت میں قتل کریں گے۔ اس کے بعد یاجوج و ماجوج کا خروج ہو گا۔ آثار قیامت میں سے مسیح کا نزول مہدی کا ظہور، دجال کی حکومت اور یاجوج و ماجوج کا خروج ہے۔

میری ذاتی تحقیق یہ ہے کہ ان روایات میں جو بطور پیش گوئی بیان کی گئی ہیں صداقت ضرور ہے۔ مقدس یوحنا سہاری اپنے مکتوب دوم میں لکھتے ہیں کہ "ہم میں جو یہ روایت مشہور ہے کہ دجال آئے گا وہی ہے یوحنا مسیح (حضرت عیسیٰ) کو بشر تسلیم نہیں کرتا۔" فاضل

ریٹان فرانسیسی ادیب و مورخ "پولوس" کے حالات میں لکھتا ہے کہ مقدس یوحنا کا اشارہ پولوس کی طرف ہے جس نے مسیح کو الوہیت کا درجہ دیا۔

فاضل زینان نے "تاریخ کلیسا مسیحی" لکھی ہے اور اسی کے ضمن میں حواریان مسیح اور پولوس کے حالات قلم بند کئے ہیں۔ جہاں تک ہمارے موضوع کا تعلق ہے ملخص حسب ذیل ہے۔

یہ شخصیت جس کا یہودی نام "ساڈل" اور رومی نام "پال" ہے معلوم نہیں اس کی اصل قومیت کیا تھی۔ اعمال الرسل (باب ۱) میں مذکور ہے کہ پولوس یہودیوں کے ایک مجمع کو مخاطب کرتے ہوئے تقریر کر رہا تھا مجمع سخت مشتعل ہو گیا رومی سپاہی اور صوبہ دار نے امن قائم کیا۔ پولوس کو پکڑ کر قلعہ میں لے گئے تو قلعہ کے سردار نے اسے کوڑے مارنے کا حکم دیا۔ پولوس نے صوبہ دار سے جو پاس کھڑا تھا یونانی میں کہا کہ کیا تیرے واسطے زیبا ہے کہ ایک رومی کو کوڑوں سے پٹوائے۔ صوبہ دار نے سردار سے کہا کہ یہ تو رومی ہے۔ سردار نے پولوس سے دریافت کیا جب جواب اثبات میں دیا تو سردار نے کہا کہ میں نے تو بہت نقد دے کر رومی شہری حقوق حاصل کیے ہیں، پولوس نے کہا میں تو پیدائشی رومی ہوں، اپنے ایک مکتوب (۲۔ رومیوں) میں لکھتا ہے کہ میں ابراہیم کی نسل سے بنی اسرائیل قوم سے قیدی بنیہین سے ہوں۔

ایک اور مکتوب (۱۔ کرنتھیوں ۹) میں لکھتا ہے کہ میں نے باوجود اس کے کہ سب سے آزاد ہوں اپنے آپ کو سب کا غلام بنایا تاکہ

میں بہتوں کو کھینچ لاؤں، میں یہودیوں میں یہودی تھا تاکہ میں یہودیوں کو کھینچ لاؤں، شریعت فالوں میں شریعت والا تھا تاکہ شریعت والوں کو کھینچ لاؤں، اور بے شریعت لوگوں میں بے شریعت تاکہ بے شریعت کو کھینچ لاؤں کمزوروں میں کمزور سے تھا تاکہ کمزوروں کو کھینچ لاؤں، میں سب آدمیوں میں سب کچھ بنا تاکہ ہر ایک طرح سے سب کو کھینچ لاؤں جو شخص ہر ایک سوانگ بھرتا جانتا ہے اس کی نسبت کوئی کیا کہہ سکتا ہے کہ وہ کیا ہے اور کیا چاہتا ہے،

اتنا تو یہ وثوق کیا جا سکتا ہے کہ اس نے نہ تو حضرت مسیحؑ کو دیکھا تھا اور نہ سواریان مسیحؑ کی صحبت میں رہا۔ اس کا اپنی دعوے ضرور ہے کہ میں نے مسیح کو خواب میں دیکھا اور اس نے مجھے بحیثیت رسول غیر بنی اسرائیل میں تبلیغ کے لیے مامور کیا۔ سواریان مسیحؑ غیر بنی اسرائیل میں تبلیغ جائز نہیں سمجھتے تھے یہود اور سواریان مسیح کو یہ بھی شکایت تھی کہ پولوس یہ بھی کہتا کہ موسوی شریعت منسوخ ہو چکی ہے، ایمان نجات کافی ہے، اور یہ ایمان مسیحؑ پر لانا چاہئے اور بس، اعمال جیسا کہ شریعت موسوی میں مذکور ہیں ان کی پابندی ضروری نہیں، ختنہ جو بنی اسرائیل کا قومی نشان ہے بے فائدہ ہے۔ دل کا ختنہ چاہئے۔ یہ تمام باتیں اعمال الرسل ۲/۱۱ اور اس کے اپنے مکتوبات و ترغیبتوں وغیرہ میں بہت مفصل مذکور ہیں۔

پولوس کا ابتدائی زمانہ متبعین مسیحؑ کی انتہائی مخالفت میں گزرا۔ لیکن یک لخت اس پر تبدیلی واقع ہوئی۔ اس کا اپنا بیان ہے کہ میں دمشق کی طرف سوار آ رہا تھا کہ راستہ میں ایک لور چمکا اور میں بیہوش

ہو کر گھوڑے سے گرا۔ اس نور سے میں نے ایک آواز سنی کہ ساڈل ساڈل
 تو مجھے کیوں سساتا ہے، میں نے پوچھا خداوند تو کون ہے تو جواب
 ملا کہ میں مسیح ہوں۔ اب اس نے یہ مشہور کیا کہ وہ دشمن نقاب زمزم
 دوست بلکہ خود مسیح کے نام پر قربان ہونے کو تیار ہوں۔ سواریاں مسیح
 اس کے چکے میں آئے امد یہ بھی سمجھ گیا کہ ان پر جادو نہیں چل سکتا۔
 دور معدی رہنے لگا۔ مگر اپنا کام جاری رکھا۔ اس نے اپنے مقبیلوں
 میں ایک لورا انجیل پیش کی جو اس کے مکتوبات میں مذکور ہے۔ امد
 یہ بھی کہا کہ جو اس انجیل کے سوا کسی اور انجیل کو ماننے کا مرد و اذلی ہے۔
 ایسے عقائد و یہ شریعت موسوی جس کے تابع خود مسیح اور
 سواری تھے ایسے نہ تھے سواریوں امد اس میں اتفاق کی کوئی صورت
 نہ تھی۔ وہ اپنے مکتوبات میں سواریاں مسیح کو ریاکاروں کی جماعت کہتا
 ہے اور سواری اسے دجال اور ضال کہتے ہیں۔ مقدس یعقوب اپنے
 مکتوب (۱۳) میں پولوس پر تعرض کرتا ہے کہ اگر کوئی کہے کہ میں
 ایماندار ہوں امد عمل کرتا ہو تو کیا فائدہ کیا ایسا ایمان اسے بچا
 سکتا ہے، اگر کوئی بھائی یا بہن کے پاس کپڑے نہ ہوں اور روزینہ
 کی روٹی میری نہ ہو امد تم میں سے کوئی یہ کہے کہ سلامت جا اور گرم
 امد سیر نہ پر تم اسے وہ چیزیں نہ دو جس کی اسے ضرورت
 ہے تو تمہارے کہنے کا کیا فائدہ اسی طرح ایمان بھی اگر عمل کے ساتھ
 نہ ہو تو اکیلا ہو کے مردہ ہے۔ لیکن شاید کوئی کہے کہ ایمان تجھ
 میں ہے اور میرے پاس اعمال بھلا تو اپنا ایمان بغیر اپنے عمل کے
 مجھ پر ظاہر کر اور میں اپنے ایمان کو اپنے اعمال سے تجھ پر ظاہر

کرتا ہوں۔ تو ایمان لاتا ہے کہ خدا ایک ہے، اچھا کرتا ہے۔ شیاطین بھی یہی مانتے اور تہر تہرتے ہیں۔ اے نئے آدمی کب تجھ کو معلوم ہوگا کہ ایمان بے عمل مردہ ہے۔"

پولوس کا استدلال یہ تھا کہ ابراہیم ایمان سے راستباز ٹھہرایا گیا۔ پیدائش کا مقدس یعقوب جو اب دیتے ہیں کہ ایمان کے ساتھ جب اپنے بیٹے کو قربان گاہ پر چڑھایا تو ایمان نے اس کے اعمال کے ساتھ کام کیا اور اعمال سے ایمان کامل ہوا۔

غرض سواریوں اور پولوس میں بعد المشرقین تھا۔ سواری اپنے آپ کو مسیحی نہیں کہتے تھے، "انوان" اور "مومنین" کہتے۔ مسیحیت " (

Christianity) پولوس کی اختراع ہے۔ فاضل ریان لکھتا ہے کہ اس وقت تک یہود و سواری جدا نہ تھے بلکہ رومی بھی سواریوں کے عقائد کے لحاظ سے ایک فرقہ ہی سمجھتے تھے مگر پولوس کو خوب سوچھی، اس نے اپنے متبعین کو "مسیحی" سے موسوم کیا۔ اور اس نام نے مسیحیت کو یہود سے بالکل علیحدہ کر دیا۔ یہ تاریخی واقعہ ہے اور اس کی تصدیق سٹوداہل صلیب بھی کرتے ہیں کہ یورپ اور دیگر ممالک میں بھی مسیحیت جو پولوس کی اختراع تھی (پولوس کرپینٹی) شائع ہوئی۔ اور

یہی وہ دجالی مذہب ہے جو کرہ ارض کے طول و عرض میں پہلے یورپ اور پھر انگلستان اور امریکہ نے پھیلایا۔ سواری گوشہ گناہی میں ختم ہو گئے اور ان کے ساتھ اصل دین بھی گیا۔

بقول مقدس یوحنا سواری پولوس دجال ہے۔ اس کی ٹانگی کا

مخنی پوپ کے بعد انگلستان کے ادا کیا۔ "دجال" کا مادہ ہے "جل" معنی

فریب و مکرو و حیلہ اور "دجال" بہت بڑا فریبی، مکار، جلدیو، انگلستان کی سیاسیات میں (DIPLOMACY) یہ وجالیہ اتنی نمایاں اور واضح ہے کہ اس پر بحث تحصیل حاصل ہے۔ حکیم محمد حسن ترکمانی امر وہولی نے شرح قصص الحکم (تصنیف شیخ اکبر علی الدین ابن عربی) کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ "تخرد جبال" سے مراد "ریل" ہے، ہمارے ایک ہمعصر نے بھی یہی کچھ مراد لی ہے۔

غرض وجالیہ کرہ عرض کے طویل و عرض میں خوب شائع ہوئی۔ اور اب بظاہر روز و زوال ہے۔ رہا یاجوج اور ماجوج کا خروج، اس کا مذکورہ قرآن میں بھی ہے۔ صفت انبیاء و حزقی ریل باب ۱۲۸ میں مذکور ہے کہ "لو خداوند کا کلام مجھ کو پہنچا اور اس نے کہا کہ اے آدم زاد تو یاجوج کے مقابل ہو جو ماجوج کی سر زمین کا ہے اور روس (ریشیا) اور مسک (ماسکو) اور تو بال (ٹوبالسک) کا سردار ہے اپنا منکر" ان آیات سے واضح ہوتا ہے "یوج" یا "یاجوج" موجودہ سویٹ روس ہے۔ اسفار موسیٰ (کتاب پیدائش باب) میں حضرت نوح کے بیٹوں سام اور حام اور یافث کی اولاد میں سے یافث کے قبائل ججر اور یاجوج اور میڈیا اور یونان اور تو بل اور مسک اور تیراس اور ان کی شاخوں کا مذکور ہے۔ ام سامیرہ عیلام اور سور اور ارنگند اور بود اور امام اور ان کی نسلیں بیان کی گئی ہیں۔ یافث کی اولاد یورپ اور یورپ اور چین اور تار و ترک وغیرہ ہیں اور انہی پر یاجوج و ماجوج کا اطلاق ہوتا ہے۔

"حزقی ایل" ایرانی شہنشاہ تیغور کے ہمعصر ہیں جس نے بابل کو مغر

کیا اور بنی اسرائیل کو بابلوں کی اسیری سے آزاد کرنے کے بعد پھر سے
 ارض فلسطین میں بسایا۔ حزقی ایل بنی کی پیش گوئی اپنی قوم بنی اسرائیل
 کے تعلقات سے وابستہ ہے، اسفار موسیٰ ۴ کی پانچویں کتاب المثنائی
 میں حضرت موسیٰ سے بنی اسرائیل کو پیش از وقت
 آگاہ کر دیا تھا کہ تم دو دفعہ شریعت کے احکام کی خلاف ورزی کی پاداش
 میں عذاب الہی میں مبتلا ہو گے۔ پہلی دفعہ اسیری کے مصائب میں گرفتار
 ہو گے۔ تم توبہ کرو گے اور تو خداوند خدا تمہارے دن پھر دے گا۔ بعد
 پھر سے ارض مجبود (فلسطین) میں آباد ہو گے۔ یہ پیش گوئی اس وقت
 پوری ہوئی جب بخت نصر بابل بادشاہ ان کو اسیر کر کے بابل میں لے
 گیا۔ ستر سال اسیر رہنے سنائی ایل بنی انہی ایام میں بابل میں مبعوث
 ہوئے۔ دوسری پیش گوئی شاہ میں پوری ہوئی جبکہ رومیوں نے ان کو
 ارض مجبود سے بالکل بے دخل کر دیا۔ اور یہ کہ ارض پر آوارہ ہوئے۔
 توراہ المثنائی ۱۸ میں حضرت موسیٰ ۴ اس کے بعد ان کو چارہ کار بھی
 بتاتے ہیں کہ تم میری مانند ایک نبی (آنحضرت) تیرے بھائیوں (بنی
 اسماعیل) سے مبعوث ہو گا۔ تم اس کی طرف رجوع کرو گے تو پھر سے
 نازلہ بخش ایام آئیں گے، مگر بنی اسرائیل نے آنحضرت ۴ کی دعوت
 قبول نہ کی۔

قرآن (سورہ بنی اسرائیل اور دیگر آیات) میں بحوالہ توراہ ان
 پیش گوئیوں کا مذکور ہے۔ توراہ میں یہ بھی مذکور ہے کہ اس آوارہ
 گردی میں کیا کیا آفات ارضی و سماوی بنی اسرائیل پر نازل ہوں گی۔
 اس کے بعد ارشاد ہے کہ

تیری زندگی تیری نظر میں بے ٹھکانے ہو جائے گی اور
 اور تو رات اور دن ڈر رہے گا اور تجھ کو اپنی زندگی پر
 کچھ بھروسہ نہ ہوگا۔ اپنے دل کے خوف سے جسے تو
 کھائے گا اور ان چیزوں سے جنہیں تیری آنکھیں دیکھیں
 گی، صبح کو تو کہے گا کہ اے کاش کہ شام ہوتی اور شام
 کو کہے گا کہ اے کاش کہ صبح ہوتی۔ اور خداوند تجھ کو
 اس راہ (ارض فلسطین) سے جس کی بابت میں نے تجھے
 کہا کہ تو پھر نہ دیکھے گا، کشتیوں پر مصر کو پھر لے جائے گا
 اور تم وہاں غلام اور لونڈی ہونے کے لیے اپنے دشمنوں
 کے ہاتھ بھیجے جاؤ گے اور کوئی تمہیں مول نہ لے گا۔

(الثانی ۱۲۹)

قرآن عظیم میں بھی اس پیش گوئی کی تصدیق کی گئی ہے کہ فاذا جاء وعد
 الاخرة جئنا بكم لنفعا (۱۲۹) جب آخری وعدہ کا وقت آئے گا تو ہم تم
 کو یہاں لپیٹ کر لے آئیں گے۔ توراہ میں نہیں بتایا گیا کہ وہ وقت کب
 آئے گا جب یہ پیش گوئی پوری ہوگی لیکن قرآن میں اس کی وضاحت کی
 گئی ہے۔ ارشاد ہے

وجرام علی تریة
 افلکنہا انہم لایس جعون
 حتی اذا فتحت یاجوج و
 ماجوج و ہم من کل
 مدب ینسلون واقترب
 اور وہ ہر ایک بلندی سے دوڑتے ہوئے
 اور اس باعظمت لہتی دیرو قلم کے پہننے
 والوں پر سلام کہ پھر سے اس کی طرف مراجعت
 کریں جن کو ہم تباہ کر چکے ہیں۔ اس وقت
 تک کہ یاجوج و ماجوج کھول دئے جائیں

آئیں گے۔ سمجھئے وعدہ کا وقت قریب آگیا۔
 اور ان لوگوں دیہودا کی آنکھیں پھٹھی کی پڑھی
 رہ گئیں جو اس وقت کے منکر تھے کہیں گے
 کہ اے دائے ہم اس وقت سے غافل ہی
 رہے بلکہ ہم ہی ظالم تھے۔ اب پچھتائے
 سے کیا ہوتا ہے، تم اور جن کو تم اللہ کو
 چھوڑ کر پوجتے رہے جہنم کے ایندھن ہیں
 جس میں تم کو وارد ہوتا ہے۔

الرعد الحق فاذا هي شاخته
 ايسار الذين كفروا يويلنا
 قد كنا في غفلة من هذا
 بل كنا ظالمين - انکم وما
 تعبدون من دون الله
 حسب جهنم انتم لها
 واردون (۱۶)

نیز ارشاد ہے کہ

ان يا جوج وما جوج
 مفسدون في الارض ۱۶۶
 ۱۶۶ وان وعد ربنا
 حقا، وتركنا بعضهم يوءئذ
 يمجج في بعض، ونفخ في
 الصور فجمعنهم جمعاً و
 عرفنا جهنم يوءئذ للكافرين
 عر ضار الخين كانت اعينهم
 في خطاهن ذكوى وكانوا لا
 يستطيعون سماعاً (۱۶)

تحقیق یا جوج و ما جوج کرہ ارض پر مفسد
 ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ اور میرے ہمدرد گارگادہ
 سچا ہے، اور ہم ان (یا جوج و جوج)
 کو ایک دوسرے میں اس دن موج
 مارتے ہوئے پھوڑ دیں گے اور صور
 پھونکا جائے گا تو ان کو ہم کما حقہ جمع
 کریں گے اور جہنم سامنے لائی جائے
 منکروں کے لیے اس دن، جو ہماری
 یاد دہانی سے غفلت برتتے رہے
 اور جو انتباہ پر کان نہیں دھرتے تھے۔

آیات مذکورہ بالا میں جس وعدہ کا ذکر ہے اس کا ایک حصہ
 ہمارے زمانہ میں پورا ہو چکا ہے۔ ۱۹۱۱ء میں پہلی دفعہ یا جوج و ما جوج

کا آئنا سامنا ہوا۔ ان کو "اتحادی" اور "محوری" موسوم کیا گیا۔ اس جنگ کے خاتمہ پر اعلان بالفور ہوا کہ یہود کو ان کے گھر (فلسطین) میں بسایا جائے گا۔ یہ اعلان اتحادیوں کے ایک رکن رکیں برطانیہ کی طرف سے ہوا جو وہاں بھی ہے۔ یورپ بالخصوص روس میں یہود پر عرصہ حیات تنگ تھا مگر دینی مفاد نقل مکانی کی اجازت نہیں دیا۔ پھر بھی یہود ۱۸۲۵ء میں بارہ ہزار فلسطین میں آباد ہو چکے تھے ۱۸۸۲ء میں ان کی تعداد دو گنی ہو گئی ۱۸۹۵ء میں ان کی تعداد سینتالیس ہزار ہو گئی۔ لیکن وہ حقیر اقلیت میں تھے اعلان بالفور کے بعد ان کی تعداد پچاسی ہزار کے قریب ہو گئی۔ ۱۹۲۰ء سے ۱۹۳۶ء تک وہ لاکھ اسی ہزار یہودی فلسطین میں آئے۔ اب ان کی کل تعداد چار لاکھ چار ہزار کے قریب ہو گئی۔ یہ تیس فیصدی آبادی کا حصہ تھے کہ دوسری جنگ عظیم پھر یا ہوج و ماہوج میں شروع ہو گئی۔ "حصہ" نے ان کو اس طرف دھکیلا اور جہاں جہاں اس نے پیش قدمی کی یہود بھاگ کر فلسطین میں آئے۔ اس کے بعد جب آئیٹلو امریکن "بلاک" کی مدد سے ان کے خدا کا گھر سلطنت کا بن گیا تو ایسا بے پناہ کشش تھی ان کو کرہ ارض کے ہر ایک حصہ سے کھینچا۔ ۱۹۲۶ء کے بعد ایک لاکھ چھیاسٹھ ہزار اور آگے اب ان کی آبادی تراسی فیصدی ہو گئی اور یہ سلسلہ جاری رہے گا جب تک پورا نہ ہو۔

یہ دو جنگیں اگرچہ عظیم کہی جاتی ہیں مگر اس ہولناک جنگ کا پیش خیمہ ہی تھیں جو متوقع ہے اور جس کے لیے یا ہوج و ماہوج ہر ممکن قوت

پنی اپنی جگہ فراہم کر رہے ہیں۔ اسی متوقع جنگ کی خبر قرآن عظیم نے دی ہے اور اسی جنگ کے دوران میں یہود کے حق میں توراہ کی وہ پیش گوئی بری ہوگی کہ ان کو مصر میں جہاں سے ان کا خروج ہوا تھا۔ جہازوں پر لایا جائے گا اور غلام اور لونڈی کی طرح فروخت کئے جائیں گے مگر کوئی خریدار نہ ہوگا اور اس واقعہ کے ساتھ یہود کی قومیت ختم ہو جائے گی۔

ان اوراق میں ہم نے یہودیت اور مدعیان یہودیت کے حالات بیان کئے ہیں۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ بعض احادیث میں جس مہدی اور عیسیٰ کی آمد کا مذکور ہے اس کا زمانہ ان واقعات کے ظہور سے وابستہ ہے۔ ان جہدوں میں سے ایک بھی ایسا نہیں ہوا جس پر ان احادیث کا اطلاق ہو جو دجال اور یاجوج ماجوج کے خروج کے بارہ میں ہیں ان احادیث میں خصوصیت سے مذکور ہے کہ ان کی جنگ یہود سے ہوگی۔

توراہ کی پیش گوئی میں "مصر" کا خاص طور پر ذکر ہے۔ اہل مصر ہی نے ابتدا سے یہود کا مقابلہ کیا۔ اگرچہ اس وقت اینگلو امریکن بلاک کی خفیہ سازش اور امداد کی وجہ سے یہودی کامیاب ہو رہے ہیں مگر متوقع جنگ کے شروع یا دوران یا بعد میں نہیں کہا جاسکتا کہ کیا حالات ہوں گے حسب پیش گوئی توراہ مصر ہی غالب آئے گا۔ جو اتحاد عرب میں نمایاں حصہ لے رہا ہے۔

اس جنگ کے ہولناک تباہ کن اثرات میں تو کچھ شک و شبہ نہیں جو کہہ ارض کی اقوام کو لپیٹ میں لے گی۔ لیکن قرآن میں مذکور ہے۔

ان الذین صبت لہم
 من الحسنی اولئک عنہا بعدون
 لایسمعون حسیسہا و ہم فی
 ما اشدت انفسہم خلدون
 لایستغنونہم الفزع الاکبر

۱۳

تحقیق وہ لوگ کہ ان سے ہمارا نیک و عظیم
 پہلے ہی ہو چکا ہے وہ اس سے دور
 ہی رکھے جائیں گے۔ اس کی بنک بھی
 ان تک نہ پہنچے گی اور وہ من عالی ہمیشہ
 کریں گے ان کو دلوگوں کی ہیج پکار پر
 اس میں شامل ہوں گے جو نزع عظیم
 ہوگی کوئی افسوس نہ ہوگا۔

اللہ ہی کو معلوم ہے کہ یہ خوش قسمت لوگ کون ہیں جو متوقع حوب
 عظیم سے دور ہی رہیں گے۔ اور کون کون بد قسمت ہیں جو اس میں شامل
 ہوں گے۔

سلطان محمد بن قاسم

حرفِ مطلب

سلطان محمود غزنوی کے حالات بعض تاریخوں اور تذکروں میں مذکور ہیں۔ لیکن بعض واقعات جو سلطان کے دور حکومت میں رونما ہوئے ان میں سے بعض کی تعبیر مورخین نے غلط کی اور بعض کے اسباب اور حقیقت پر ان کو اطلاع نہ ہوئی۔ ان اوراق میں صرف اس مقصد کو مد نظر رکھتے ہوئے ہم نے واقعات اور ان کی اصلیت نمایاں کی ہے۔ عموماً مورخین کسی روایتی واقعہ کو نقل کرتے رہے اور کبھی اس کی تحقیق نہ کی کہ یہ معلوم کریں کہ یہ واقعہ بلینہ صحیح بھی ہے کہ نہیں اگر صحیح ہے تو کیا اسی صورت میں رونما ہوا جس میں روایت ہو رہا ہے! ہم نے کوشش کی ہے کہ واقعات کو ان کی اصلی صورت میں پیش کریں اور ان کا پس منظر بھی قارئین کرام کے سامنے لائیں۔ سلطان محمود کی سیرت اور جہات بیان کرتے ہوئے ہمارے مورخین نے اس حد تک توجہ نہ دی کہ

سلطان کے دل میں جذبہ جہاد فی سبیل اللہ بڑی حد تک
 کار فرما تھا کہ اس نے ہندوستان پر سترہ حملے کئے۔ لیکن
 واقعات جو قلم بند کئے ہیں اس سے یہ نتیجہ جو بالکل
 صحیح ہے اخذ نہ کیا کہ خود رایان اور راجگان ہند نے
 سلطان کو دعوت جہاد دی، یہ واقعہ کہ سلطان نے اشاعت
 اسلام کا راستہ ہندوستان میں کھول دیا اور اکثر ہندو
 حلقہ بگوش اسلام ہوئے صحیح ہے لیکن ان اسباب کو
 مؤرخین نے نظر اہمال کر دیا جو اشاعت اسلام کا موجب ہیں۔
 فردوسی کا قصہ ہم نے ذرا تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے
 ان احوال کے مطالعہ کے بعد کسی کمی باتیں قارئین کو معلوم
 ہو جائیں گی جو اب تک پوشیدہ رہیں۔

صواعق مہربان

جہاندار محمود شاہ بزرگ
چو کوک لب از شیر مادر بشت
بآبش خوراند بھی میش و گرگ
بگہوارہ محمود گوید نخت

دزدی طوسی
کہ وقف کرد برو کردگار عز و جلال
ایں ملت و ملت بدو گرفتہ جلال
خدایگان خراسان و آفتاب کمال
بیمین دولت بد دولت بدو نموده ہنر

حکایت سفر مولانا بھی دانی
اگر زوجہ فریدوں گذشت بے کشتی
ہم درست بود تا درست نیز بود
انال پس کہ در وہم را بند پایاب
مولانا شد و دورہ و دلست قلعہ کشاد
پلاو بیت کہ ہاشاں کشادہ سوخت ہم
ز قلعہ ماند کہ نکشاد و ز پر کہ نزد

وگر ندانی " تاج الضوح پیش آور
یہ شاہنامہ برائے بر حکایت ست سیر
تو تا درست ندانی مکن سخن باور
و ناں پس کہ براو یاد بنود عبر
کہ ہریکی را صد بند بود چوں خیر
ببر باد ہم تو دہائے خاکستر
دہ قریب، کہ نکشف و ز گردن کافر

* * * * *

یگسرید بھی حق بہ تیغ حق گستر
 بہاد گنگ بکند بہسار تا بنبر
 خود آمدہ و نکرده است نعتش اد بگر
 اناں سپس کہ یدو بود ہندرامغفر
 بلا مش اندر زہر کشندہ کرد شکر
 زگرد ایثاں گیتی سیاہ و روزا عنبر
 نہیب رود بلا نعل اہرمن منکر
 چنانکہ بود در اقلیم ہندواں سرور

برزم رام بھی کرد شاہ شیراں را
 نہ آنکہ جائگہ حج ہندو اں بوئے
 بتے کہ گفتند این است باس دیو بزرگ
 سرش بغزنی افگند بر در میدان
 شنیدہ کہ چہ کرد لو برزم با جیپال
 زمین و شکر او موج و سیر دریا بود
 ہم شدہ دل و دانش حسام روئیں تن
 بملہ صدو دو پیل تا ملد گرفت

دعای الشرا حکیم عنقریٰ

خرنج عقیدت

علامہ اقبال سلطان محمود غزنوی کے مزار پر

نیزہ از دل نالہ لائے اختیار
 آں دیار و کاخ و کو دریا نہایت
 گنبدے در طرف او چرخ بریں
 آنکہ چوں کودک لب از کوثر پشت
 برق سوناں تیغ بے زہنہاراد
 زیر گردوں آیت اللہ را تیس
 شوخی تکرم مرا از من ربود
 رخ نبود از سینہ ام آں آفتاب
 مہر گردوں از بلاشش در رکوع
 وار ہمیدم از جہاں چشم و گوش
 شہر غزنین یک بہشت رنگ دیو
 قصر ہائے او قطار اندر قطار
 نکتہ سیخ طوس را دیدم بزم

آہ! آں شہرے کہ این جا بود یارا
 آں شکوہ و خال دخرافانہ ایت
 تربت سلطان محمود است این
 گفت در گہوارہ نام او نخست
 دشت لودر لہر زندہ یلعناراد
 قدیباں قرآن سرا برتر بتش
 تا نبودم در جہاں دیروز زود
 پرو گسیہا از فروغش بے حجاب
 از شاعش دوش می گرد و طلوع
 فاش چوں امروز دیدم صبح دوش
 آبجوا نغمہ نواں در کاخ و کو
 آسماں با قبر ہائش ہم کنار
 لشکر محمود را دیدم بر رم

روح سیر عالم اسرار کرد تا مرا شوریدہ بیدار کرد
 آن ہمہ مشاقی و سوز و مہر در در سخن چوں اندلبے پروا بصور
 تخم اشکے اندراں ویرانہ کاشت گفتگو با خدائے خویش داشت
 تا نمودم بے خبر از راز او
 سوختم از گرمی آواز او

دیس چہ باید کرد انے اقوام شرق

چند تاریخی حقائق

تمام محققین کا اس ناقابل انکار حقیقت پر اتفاق ہے کہ ہر ایک زمانہ کے ذہنی اور خارجی تاثرات ہر ایک شخصیت کے اعمال میں کار فرما ہوتے ہیں جو اس ماحول میں پرورش پاتا ہے، بلاشبہ لیکن شخصیتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جن کے ذہنی درجات فطرۃً اپنے زمانہ کے عام فہم سے اعلیٰ و ارفع ہوتے ہیں، اگر وہ بہ تقاضا فطرت اپنی قوم یا غیر اقوم کو اپنے ذہن کی بلندی پر لانے کی کوشش بھی کریں تو اسی صورت میں کامیاب ہو سکتی ہیں کہ اس ماحول اور اس کے تقاضا کو مد نظر رکھیں جس میں وہ خود اور ان کی قوم زندگی بسر کر رہے ہیں، بقول ہمدیش پنسرہ جو مصلح یہ چاہتا ہے کہ اپنے زمانہ کے نظام معاشرت کی کسی خوابی کی اصلاح اس عجلت کے ساتھ کرنے کی کوشش کرے کہ سب کچھ اس کی اپنی زندگی میں مکمل ہو جائے وہ ایک اصلاح کی جگہ سو معاشرتی خوابیاں نادرستہ پیدا کر دیتا ہے۔ مصلح اعظم وہی ہے جو اصلاح کی ذراغ بیل لگا دے اور تعمیر کا کام بتدریج آئندہ نسلوں پر چھوڑ دے۔

ہم ان واقعات کا تذکرہ کر رہے ہیں جو آج سے ایک ہزار سال پیشتر وسط ایشیا اور ہندوستان میں رونما ہوئے۔ اور اپنے زمانہ کے ترقی یافتہ ذہن سے ان کا مشاہدہ کرنے ہیں، اور ان شخصیتوں کے بارہ میں نیز جو اس گزشتہ زمانہ میں اہم تاریخی حصر لیتی رہیں انتہائی نامستول رائے قائم کرتے ہیں، اس لیے تاریخی واقعات قلم بند کرتے ہوئے ایسی صورت میں پیش نہیں کرتے جیسی کہ وہ فی الحقیقت تھی بلکہ اپنے ہی ذہنی تصورات پر بحث کرتے ہیں جو کبھی فیصلہ شہود پر نہیں آئے، ہر ایک محقق مورخ کا فرض اولین ہے کہ خالی الذہن ہو کر اول اس زمانہ کے ذہنی اور خارجی حالات کا مشاہدہ کرے جنہیں وہ قلم بند کرنا چاہتا ہے اور اچھی طرح ذہن نشین کر لے کہ اگر وہ خود اس ماحول میں اپنی موجودہ ترقی یافتہ ذہنیت کا بھی مالک ہوتا تو اس سے زیادہ کامیاب کے ساتھ کچھ نہ کر سکتا جو وہ ان ممتاز شخصیتوں کو گزشتہ زمانہ میں کرتے دیکھ رہا ہے، اور شاید اتنا بھی نہ کر سکتا جو کچھ انہوں نے کیا۔ اس انتباہ کے بعد ہم تازمیں کرام کو سلطان محمود غزنوی اور اس کے کارناموں سے روشناس کرتے ہیں، وہ نقشہ جو اس وقت دنیا و اسلام اور غیر مسلم ہندوستان کا تھا پیش نظر رکھیں۔ اسی کے طول و عرض میں سلطان کو نقل و حرکت کرتا دیکھیں، یہی زمین بھی آسمان بھی لیل و نہار، یہی پہاڑ، یہی دریا، یہی صحرا، اس وقت بھی تھے جو اب بھی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ان ایام میں راستے دشوار گزار تھے، اور سفر کی سہولت جو ہمیں آج میسر ہے ان ایام میں نہ تھی، اور وہ ذرائع سفر جو الی ذہنی ارتقاء نے اختراع کیے ہیں اس

زمانہ میں تھے، تاریخ یورپ میں عینی بال لین ہل ایک نینتی عرب
 شہزادگی مارچ دیلعام کو بہت بڑا حیرت انگیز کار نامہ سمجھا گیا ہے، اس
 نے سپانین سے "پرنیز" کے سلسلہ کوہ کو اپنی فوج کے ساتھ طے کر کے
 "انکی" پر حملہ کیا تھا۔ "پولین بونا پارٹ" اس کو "فرسٹ جنرل" کہتا
 ہے، مورخ گبن "اپنی تاریخ عروج و زوال رومہ الکبریٰ کے اسباب
 بیان کرتے ہوئے سلطان محمود کی نسبت لکھتا ہے کہ اس سلطان ہیر
 کی بلغاروں کے سامنے عینی بال کی یلغار بیچ ہے،

مقدونیا فاتح یونان کے ایک شہزادہ سکندر کے نام کو اتنا اچھا
 گیا ہے اور اس پر پیگنڈہ کا اثر نہ صرف ہمارے ترقی یافتہ ذہن
 پر بلکہ اس کی وفات کے بعد ایشیائی اقوام پر اس حد تک ہوا کہ
 ملک الشرا منظمی گنوی کو اس کے سوا اور کوئی شخصیت نظر نہ آئی
 کہ اپنی خداداد بلندی فکر کے اظہار کا موضوع بنایا، سکندر نامہ بری و بحری
 لکھا، اس پر معاصرین نے حاشیہ آرائی کی اور آج تک درسی نصاب تعلیم
 میں شامل رہا۔ سکندر اعظم کی لڑائیاں صرف ایرانی حکومت تک محدود
 رہیں، بلاشبہ اس کی فتوحات پر اہل یورپ جتنا فخر کریں بجا ہے۔
 لیکن تیمور گورگان اور سلطان محمود کا وہ کیا مقابلہ کر سکتا ہے۔ اول الذکر نے
 بحیرہ روم اور بحیرہ چین تک فتوحات کا سلسلہ قائم کر دیا۔ اور سلطان
 محمود نے ایران و ترکستان و بلوچستان اور افغانستان اور ہندوستان کو
 عند اللہ سکندر اعظم تو ایک ہیرو ہے جسے یورپ بار بار پیش
 کرتا ہے۔ لہذا تاریخ اسلام میں سینکڑوں ہیں۔
 اول یورپ یا مخصوص برطانیہ کے سیاسی تدبیر کا یہ تقاضہ ہمیشہ رہا

کہ مسلمان اپنے اباؤ اجداد اور مشاہیر کی روایات بھول جائیں اور ان کی جگہ ان کے مشاہیر کی حکایات اذہر کریں اور یورپ کا ذہنی تفوق یقین کی حد تک تسلیم کریں، یہ صیح ہے کہ آج وہ دنیا اسلام پر اپنے ذہنی تفوق کی وجہ سے پھلے ہوئے ہیں، اس حقیقت کا انکار نہیں ہو سکتا، لیکن جیسا کہ وہ ہمارے ذہن نشین کرنا چاہتے ہیں کہ وہ ہمیشہ سے ایسے ہی تھے اور علی الدوام ایسے ہی رہیں گے صیح نہیں، ابھی تو چند صدیاں ہی گزری ہیں کہ یورپ جہالت کی تیر و تار گھاؤں میں گھرا ہوا تھا، ہسپانیہ میں مسلمانوں نے ایک ہزار سال تک مشعلِ مسلم روشن رکھی اور ان جاہلوں کو ظلمت سے نکال کر نور میں لائے اور کسے معلوم ہے کہ ایک صدی کے بعد ان کی گت کیا بنے گی۔ "ہرکرا پنچ روز نوبت اوست"۔

بلاشبہ ہماری ذہنیت حکمت خوردہ ہے۔ لیکن اگر ہم اپنی روایات کو زندہ رکھیں اور زندہ قومیں اور وہ قومیں جو زندہ رہنا چاہتی ہیں۔ اپنی روایات زندہ رکھتی ہیں۔ البتہ مردہ قومیں افسانے تراشتی ہیں۔ لیکن ہم تو صیح واقعات بیان کر رہے ہیں۔ ہمارا مقصد واضح ہے کہ ان مشاہیر کی زندگی ہمارے لیے ایک نمونہ ہے، اور مذہب اور افراد اقوام کسی نمونہ ہی کو پیش نظر رکھتی ہیں۔

ایک روایت جو اکثر مشاہیر اسلام میں نظر آئے گی یہ ہے کہ یا تو غلام تھے یا غلاموں کی اولاد تھے یا کنیز کے دادے تھے۔ مسلمانوں میں غلام کا مفہوم وہ نہیں جو غیر مسلم اقوام کی معاشرتی زندگی میں پایا جاتا ہے مسلمانوں میں فاجحین اور سلاطین اور بلند پایہ علماء و حکماء وغیرہ

اور اہل دین و تقویٰ اکثر غلام تھے۔ لیکن غیر مسلم اقوام میں ان کی مثال نہیں ملتی۔ ہندوستان میں شودر ہزار ہا سال سے شودری ہے، یونانی فلسفی افلاطون اور ارسطو غلاموں کو وہ شہری تھی نہیں دیتے جو یونانیوں کو حاصل تھے۔ "رومن لاء بھی غلاموں کے حق میں اتنا ہی سخت ہے جتنا منو کا" دھرم شاسترہ

غلامی نہ تو اسلام کی محدثات سے ہے اور نہ اسلام اس کا حامی ہے۔ ہر ایک قوم کے معاشرتی نظام کا جزو و لا ینفک غلامی تھی، ہم بیان کر چکے ہیں کہ معاشرتی نظام کی کوئی بھی خرابی یک لخت اصلاح پذیر نہیں ہوتی۔ اصلاح بتدریج اور معتدل طریق پر ہی ممکن ہے۔ ہر برٹ پسنر نے جہاں اس اصل اصول پر بحث کی ہے مثلاً غلامی ہی کو پیش کیا ہے کہ برٹش گورنمنٹ نے لاکھوں پونڈ اس کار خیر پر اس نیت اور ارادہ سے صرف کئے کہ غلامی کا فوراً انسداد ہو جائے۔ لیکن جلدی ہی معلوم ہو گیا کہ یہ غلط اقدام تھا آخر پادریوں کے ذریعہ حکمت اور نوعت نہ صحت کی سوچھی، مسلمانوں نے ہدایات قرآن کے تحت معتدل روش اختیار کی "تعدیل بہر امر کمال عرفاست" بلاشبہ مسلمان لونڈی اور غلام خرید کرتے مگر ان کو ممکن اعلیٰ تعلیم و تربیت سے بہرہ ور ہونے کا موقع دیتے یہی وجہ ہے کہ تاریخ اسلام میں غلامی کو شاہی کے درجہ تک ترقی کا موقع ملتا رہا۔

قرآن میں غلام کے لیے لفظ "عبد" اور "عبدیت" اور "عبودیت" اسلام میں مخلوق کی طرف سے اللہ تعالیٰ کا خاص حق ہے۔ غیر مسلم اقوام نے یہ حق اپنے لیے محفوظ کر رکھا تھا۔ اور اپنے آپ کو دیوتاؤں کی اولاد اور

خدا زادے تصور کرتے، اور ہمسایہ غیر اقوام کو پیچھے اور راکشش اور
اس بھی قبیح ناموں سے یاد کرتے۔ اسلام نے اسے بزرگ عظیم ناقابل
معافی قرار دیا ہے۔ اس لیے عبد کا مفہوم جیسا کہ نامسلمانوں کی لذت
میں ہے اسلام میں نہیں اور نہ ہونا چاہیے۔ قرآن لفظ "ما ملکت ایمانہم"
یعنی زبردست استعمال ہوا اور ان کو ابھار کر آزاد قوموں کی سطح پر لانا
ہر ایک مسلمان کا اعلیٰ فریضہ ہے۔

تاریخ اسلام کا آغاز آنحضرت کی بعثت سے ہوتا ہے۔ آنحضرت
کی وفات کے بعد خلفاء قریش نے عرب و شام و ایران و ترکستان و افغانستان
و وادی سندھ بشمول ملتان ایک طرف اور تمام شمالی افریقہ اور ہسپانیہ
فرانس تک دوسری طرف زیر حکومت خلافت اسلامیہ لے لیا۔ یہ تمام
ممالک آج تک مسلمانوں کے قبضہ میں ہیں۔ ان میں سے اکثر ممالک
پر ان کی اپنی حکومت بھی ہے اور یہاں خالص مسلم آبادی بھی ہے۔ ان
فتوحات کا اول سہرا خلافت راشدہ پر اور ان کے بعد بنو امیہ کے
سر ہے۔ خلافت راشدہ کے دور میں صرف فتوحات کا سلسلہ
کم و بیش جاری رہا۔ لیکن اسلام اور عربی زبان کی اشاعت اموی خلافت
میں ہوئی۔ ایک انگریز مورخ لکھتا ہے کہ بنو امیہ کی خلافت کا مقصد
تو صرف یہی دو امور تھے، ان کی خلافت کے خاتمہ پر دونوں اسی حد تک
اگر ٹھہر گئے جہاں انہوں نے چھوڑا تھا۔

بنو امیہ کے جانشین بنو عباس ہوئے۔ لیکن بنو امیہ کی طرح خالص
عربی حکومت نہ تھی، اس میں ایرانی اور ترکی بھی عنصر شامل ہو گیا اور رفتہ رفتہ
یہی غالب آ گیا۔ جن ایام کا ہم مذکرہ لکھ رہے ہیں اس پرانا شاہان بنو عباس

کو غیر عرب مسلمان ہی کہتے اور سنی خلافت قریش میں محدود سمجھتے، مگر
 خلفاء ابو عباس میں اول آٹھ تاجداروں کے بعد کوئی بھی الوالعزم پیدا
 نہ ہوا۔ دنیا اسلام پر غیر عرب سلاطین کا قبضہ تھا بلکہ یہ سلاطین خلیفہ اور
 خلافت کے بھی سرپرست تھے، لفظ "سلطان" اپنی خلفاء عباسیہ کی
 اصطلاح اختراع کردہ تھی۔ "سلطان" کا خطاب اور لقب اس کو عطا
 فرماتے جو ان کی طرف سے کسی حصہ ملک کا فرمانروا نامزد ہوتا۔ جسے
 ہم آج نائب السلطنت کہتے ہیں یہی کہہ "سلطان" کا مفہوم تھا، اگرچہ
 رفتہ رفتہ یہ خود مختار ہوتے گئے مگر جب تک خلافت عباسیہ قائم رہی
 ایک مرکزی حکومت سے وابستہ رہے یہ وائسگی برائے نام ہی تھی۔

آل بوریہ بغداد میں تخت خلافت پر متمکن تھا اور آل بوریہ خلیفہ اور خلافت کی سرپرست
 جس زمانہ کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس وقت ۳۳۳ھ میں عباسی خلیفہ المنکفی

تھیں اپنا شجرہ نسب ساسانی شہنشاہ بہرام گور سے ملاتے تھے غالباً اسیرونی کی تحقیق صحیح ہے
 کہ یہ بہرام گور کی اولاد تونہ تھے مگر اس وقت برسر اقتدار تھے ماد اور آدمی راجہ کے چچا اور
 شجاع بوریہ قزوین کے نواح میں ایک رئیس کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کے
 تین بیٹے تھے علی اور حسن اور احمد حالی طبرستان کے ہاں یہ اور اس کے
 تینوں بیٹے ملازم ہو گئے۔ ولایت خراساں پر ایک دو مہرے کے
 بعد قابض ہوئے اور یہ بھی اس طرح منتقل ہوتے رہے۔ نواح
 ہمدان میں علی کو ایک چھوٹے سے علاقہ کا ناظم مقرر کیا گیا۔ اس
 نے اپنے دونوں بھائیوں کو بھی اپنے پاس بلا لیا۔ رفتہ رفتہ اتنی
 طاقت بہم پہنچالی کہ علی نے فارس اور حسن نے رے اور احمد نے عراق
 اپنی ولایت میں شامل کر لیا۔ اس کے بعد علی نے اپنی خود مختاری کا

اعلان کر دیا۔ اور اصفہان پر قابض ہو گیا دونوں بھائیوں کو ان صوبہ جات کا عالی مقرر کیا جو وہ پہلے ہی مسخر کر چکے تھے، احمد عراق کے اکثر حصہ پر چھایا ہوا تھا تھوڑے عرصہ میں "اصواز" اور "واسط" بھی لے لئے اور ^{۱۲۱۶} ۱۲۱۶ء میں بغداد پر بھی تسلط جمایا۔ اب خلافت اور خلیفہ دونوں اس کی سرپرستی میں آگئے۔ خلیفہ نے علی کو عماد الدولہ اور حسن کو روشن الدولہ اور احمد کو مفر الدولہ کا خطاب عطا فرمایا۔ اس زمانہ میں حسن المناطیب بہ روشن الدولہ کا بیٹا عضد الدولہ بڑا صاحبِ اقبال گذرا ہے۔ اس کے بھائی موید الدولہ اصفہان کا اور محرز الدولہ ہمدان کا والی تھا۔ عضد الدولہ بغداد میں خلافت کا سرپرست رہا ان کا مذہب شیعہ اثنا عشریہ تھا۔ پہلی دفعہ بغداد میں عاشورہ محرم میں مجالس عزاداری منعقد ہوئیں اور عورتیں جلوس کی صورت میں سینہ کوبی کرتی ہوئیں نکلیں اور بنو امیہ پر نامِ ندامت کی گئی تھی۔ بغداد میں ایک ہیجان برپا ہو گیا۔ اکثریت اور خود خلیفہ سنی تھا۔ خلیفہ کی بے بسی کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ دم بخود ہو کر رہ گیا مگر اہل بغداد کا جو ش بڑھ رہا تھا۔ آخر بعض اکابر مدینہ میں آگئے اور عضد الدولہ نے اتنا تسلیم کیا کہ امیر معاویہ کا نام حذف کیا جائے، وہ بھی اس لیے کہ امیر آخر ایک صحابی اور کاتبِ نبوی تھا۔ بات صرف اتنی تھی کہ مسلمان اس وقت تک باوجود اختلاف عقاید صحابہ کا احترام کرتے چلے آ رہے تھے۔ بنو عباس کو خواہ بنو امیہ سے کتنی ہی دشمنی تھی مگر وہ بھی صحابہ کے حق میں کبھی کوئی ناشائستہ کلمہ سننا پسند نہ کرتے تھے، اور نہ آج تک کسی کو جرات ہوئی۔ مگر اسی خانہ جنگی کی وجہ سے حکومت قریش کے ہاتھ سے نکل چکی تھی اور وہ

بالکل بے بس تھے۔

شمالی افریقہ میں بنو فاطمہ نے اپنی خلافت قائم کر لی تھی اور آخر
 مصر پر ان کا پرچم لہرانے لگا۔ اور یہ تمام علاقہ بالکل خلافت خباہت سے
 منقطع ہو گیا۔ بنو فاطمہ کا اول خلیفہ عبید اللہ المہدی تھا، عند الدولہ نے
 اسے لکھا کہ پہلے اپنا حسب سبب مبینہ تو ثابت کرو پھر دعویٰ خلافت
 کرنا۔ یاد رہے کہ بیہان علی امام جعفر صادق کی ذات کے بعد دو فرقوں
 میں بٹ گئے۔ ایک تو آپ کے بڑے بیٹے اسماعیل اور آپ کی اولاد
 کو جائز وارث امامت سمجھا اور دوسرا جو بعد میں اثنا عشریہ کہلایا اس
 بنا پر منکر تھا کہ اسماعیل کو امام جعفر صادق نے اپنی زندگی میں عاق کر دیا
 تھا۔ اور اسماعیل آپ کی زندگی ہی میں فوت ہو گیا تھا۔ یہ لوگ جو اب اپنے
 آپ کو بنو فاطمہ کہتے تھے دراصل میموں قذاح کی اولاد تھے۔ ہم نے اپنی
 کتاب مذاہب اسلام میں ان فرقوں کے عقاید وغیرہ پر کافی بحث کی
 ہے اس مقام پر صرف ان واقعات کا سوال اس لیے دے رہے ہیں
 کہ سلطان محمود کو ان لوگوں کے داعیوں قرمطیوں سے بھی نپٹنا پڑا۔ اہل
 سنت والجماعت شیعہ اثنا عشریہ کو "زندیق" اس لیے کہتے کہ بظاہر تو
 مسلمان ہیں مگر ان کے دل میں ترند لوستا رچا ہوا ہے۔ لفظ "زندیق"
 مشتق ہے "ژند" سے جو پارسیوں کی مقدس کتاب "لاستا" کی زبان ہے
 لہذا ظنی باطنیوں کو "ملاحدہ" اس لیے کہتے کہ قرآن کی آیات کی تفسیر
 جو کچھ کرتے ایجاد تھا۔ غرض ان ایام میں فرقہ بندی کے بعد فرائض تفرقہ
 پیدا ہو چکا تھا۔

آل سامان سامان اثرات بلخ میں سے ایک شخص اپنا سلسلہ نسب
 چوبہ میں سے ملاتا تھا۔ عباسی المامون ابن ہارون رشید
 اس وقت خراساں کا والی تھا کہ سامان مشرف باسلام ہوا۔ اس کے بڑے
 بیٹے اسد کے چار بیٹے ابو محمد نوح اور ابو نصر احمد اور ابو العباس یحییٰ
 اور ابو الفضل ایسا کہتے۔ جب ماموں تخت خلافت پر متمکن ہو گیا تو نوح
 کو سمرقند اور احمد کو فرغانہ اور یحییٰ کو شاش اور تاشقند اور ایسا کو ہرات
 کا والی مقرر کیا۔ یہ چاروں صوبہ خراساں کے تحت تھے والی خراساں
 عثمان بن غیاث تھا۔ ^{۶۸۱۹ھ} میں فوت ہوا تو جانشین اس کا بیٹا ابو الحسن نصر
 ہوا۔ اس نے بخارا کو بھی لے لیا اور اپنے بھائی ابو ابراہیم اسماعیل کی تفویض
 میں دے دیا۔ دوسرے سال عباسی خلیفہ مہمّد نے یہ تمام علاقہ بحیثیت
 سلطان اس کی سلطنت قرار دی۔ اسماعیل ^{۲۹۵ھ} میں فوت ہو گیا، اس
 کا بیٹا ابو نصر احمد جانشین ہوا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا ابو الحسن نصر آٹھ
 سال کی عمر میں تخت نشین ہوا۔ آل بویہ سے اس کا جنگ و جدل جاری
 رہا۔ اس کا بیٹا ابو محمد نوح اس کا جانشین ہوا تو آل سامان کی حکومت
 میں ضعف آچکا تھا۔ رے اور طبرستان اور ہرجان ایک ایک کر کے ہاتھ
 سے نکل گئے۔ نوح ^{۳۲۳ھ} میں فوت ہو گیا، اس کا بیٹا ابو الفوارس
 عبدالملک جانشین ہوا، کوشش تو بہت کی کہ کوئی مولیٰ سعادت پھر بحال
 ہو مگر ^{۳۵۱ھ} میں اس کا انتقال ہو گیا۔ کھیلتے ہوئے گھوڑے سے
 گر کر ہو گیا۔ اس کا بھائی ابو صالح منصور جانشین ہوا۔ اسی کے دور
 حکومت میں ایشیائی غزنی لوہبست میں خود مختار حکومت قائم کر لی
 ایشیائی کی فوج متعینہ خراساں کا افسر تھا۔ منصور ^{۳۶۵ھ} میں مر گیا۔

اس کا بیٹا ابوالقاسم نوح جانشین ہوا۔ اس کی تمام عمر امرا سے لڑنے بھگڑنے گدڑی صرف ایک بے گنہگار نے ہی ٹھک خواری مدت العمر ادا کیا۔

گدڑی کے بل بوتے پر اس کی ساکھ بھی رہی۔

سرکش باغی و امرا کے سرغنہ قائم ابو علی بھوری تھے۔ جو کاشغر کے

حاکم بغراخان سے ساز باز کر رہے تھے۔ بغراخان نے ایک دفع نوح

کو حکمت دے کر بخارا بھی لے لیا تھا۔ مگر یہاں زیادہ عرصہ ناموافقیت

آب و ہوا کے باعث ٹہرنہ سکا۔ اس کے جانے کے بعد نوح نے پھر

بخارا پر قبضہ کر لیا۔ نوح 286 ھ میں فوت ہوا۔ اس کا بیٹا ابوالقاسم

منصور جانشین ہوا۔ یہ سلطان محمود کا ہم عصر ہے۔

الپتگین کی ولادت 288 ھ میں واقع ہوئی۔ بحیثیت

علامہ احمد بن اسماعیل سامانی کے ہاتھ پڑا۔ اس نے اپنی

فوج میں بھرتی کیا۔ رفتہ رفتہ ایک دستہ کا افسر مقرر ہوا۔ خدا داد

قابلیت کے جوہر کھلتے گئے تو صاحب الحجاب کے منصب پر فائز ہوا

نوح کی وفات کے بعد نورو سال عبدالملک اس کے زیر اثر رہا۔ امیر

نوح کے بلخ کی صوبہ داری عنایت کی مگر اس نے انکار کیا تو افواج متعینہ

خراسان کا سپہ سالار مقرر کیا۔ عبدالملک کی وفات کے بعد امرا میں

تنازعہ اس بات پر ہوا کہ مرحوم کے بعد کس کو تخت پر بٹھایا جائے

الپتگین عبدالملک کے پیشے کے حق میں تھا مگر افراد نے منصور کو منتخب کیا۔

الپتگین کو یہ انتخاب ناگوار گذرا۔ خراسان سے فوج کے ساتھ بخارا کی

طرف بڑھا۔ لیکن حالات ایسے نامساعد نظر آئے کہ بلخ کی طرف

پسپا ہوا۔ امیر منصور نے اس کے تعاقب میں فوج روانہ کی۔ امیر الپتگین

نے اسے شکست فاش دی مگر مناسب یہی خیال کیا کہ منصور اب جبکہ منداہارت پر ہتھکن ہو چکا ہے اور میں آخر ملازم امیر ہی ہوں اس لیے سر درست دور تر ہی رہنا چاہیے، اس لیے محفوظ مقام غزنی کی طرف آیا۔ یہاں ابو بکر کو یک والی تھا، اسے بے دخل کیا۔ اہل یہاں اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ امیر منصور نے بس ہزار فوج ابو جعفر کے تحت معاذ کی۔ اہلگین نے اسے بھی شکست فاش دی، اب امیر منصور نے بھی مناسب سمجھا کہ اہلگین سے مصالحت ہو جائے۔ چنانچہ اس کے مفتوحہ علاقہ کا والی اسے تسلیم کر لیا۔ اب اہلگین نے بست لور کابل کا کچھ علاقہ بھی فتح کر لیا $\frac{۲۵۲}{۶۹۶۶}$ میں اس کا انتقال ہو گیا۔

ابو اسحاق ابراہیم | اہلگین کا بیٹا ابو اسحاق ابراہیم باپ کے بعد مسند نشین ہوا۔ ابو بکر کو یک جس کو اہلگین نے غزنی کی امارت سے بے دخل کیا تھا اس کا بیٹا ابو علی کو یک غزنی پر حملہ آور ہوا۔ ابراہیم شکست خوردہ بھاگ کر امیر منصور کے پاس پناہ گزین ہوا۔ امیر نے ایک لشکر حراہ ہمراہ کر دیا، اس نے ابو علی کو یک کو شکست دے کر پھر سے غزنی پر قبضہ کر لیا۔ مگر تھوڑے عرصہ بعد $\frac{۲۵۵}{۶۹۶۶}$ میں لا ولد فوت ہوا۔

امیر ملکگین | غزنی میں مد اہل امرا کی حکومت تھی۔ ابراہیم لا ولد ہوا۔ فوت ہوا۔ تو امیر اہلگین کے ایک قلام سلگین کو منتخب کیا۔ یہ شخص امیر اہلگین کی محافظ فوج کا افسر بھی رہ چکا تھا، اس کا انتخاب اس لیے بھی ہوا کہ بظاہر تشریح اہل تقویٰ سب میں ممتاز تھا۔

اور بحیثیت سپاہی بھی گنہگار نہ تھا۔ دس سال حکومت کے بعد
۱۶۶۲ء میں یہ نیک بہادر امیر فوت ہو گیا۔

امیر پرتگیزیوں کا امرانے پرتگیزیوں کو مرحوم امیر سبکتگین کا جائیں منتخب
کیا۔ ابوعلی لویک اور شاہ کابل کی متحدہ فوج نے غزنی
پر حملہ کر دیا۔ پرتگیزیوں نے مقابلہ نہ لایا تو امرانے ایک دوسرے امیر سبکتگین
کو منتخب کیا اس پانچ سو نفوس کے ساتھ دلیرانہ متحدہ فوج پر اس
زور کا حملہ کیا کہ ابوعلی اور شاہ کابل ہزیمت بخوردہ اسیر ہو کر قتل کئے گئے۔
ابو منصور امیر سبکتگین

سبکتگین ۲۶ شہان ۲۶۶ھ میں مسند امارت پر متمکن ہوا۔ اس کی
مسند نشینی کے ساتھ خاندان غزنویہ کا آغاز ہوتا ہے۔
سبکتگین ۲۲۲ھ میں پیدا ہوا۔ ترکستان میں ایک چھوٹے سے
علاقہ میں اس کا باپ "ہوق" نامی سردار خاندان تھا۔ ملحقہ علاقہ کے
ایک سردار نے یہاں ڈاکہ ڈالا۔ بعد ازاں تین سو مرد کو اسیر کر کے لے
گیا۔ ان میں بارہ سالہ سبکتگین بھی تھا۔ بطور لوتھی غلام فروخت
ہوئے تو "نصر جی" نے اسے خرید لیا۔ اس وقت تک یہ تمک خاندان
اسلام سے نا آشنا تھے، "نصر" کے زیر تعلیم و تربیت سبکتگین مشرف
باسلام ہوا۔ تین سال کے عرصہ میں اس نے فن سپاہی سیکھا، نصر
نے اس کو اپنے دوسرے غلاموں کا افسر مقرر کر دیا۔ ۲۲۵ھ میں
سبکتگین نصر کے ساتھ بخارا میں آیا۔ یہاں امیر ایشکین نے خرید لیا۔
کچھ عرصہ میں اس نے اتنا اثر و رسوخ امیر کے ہاں پیدا کر لیا۔ کہ
ایشکین کا صاحبِ اعلیٰ مقرر ہوا۔ بعد امیر نے اپنی دختر اس کے حوالہ کیا۔

میں دی۔ اپنی کی وفات کے بعد بنگلہ طبقہ امرا میں خاص احترام سے دیکھا جاتا اور امیر کے جانشین امرا بھی اس کا واجب احترام کرتے رہے آخر جب فرعون امارت اس کے نام پڑا تو تخت حکومت نے بھی اس کے پاؤں چومے۔

سبکدہ کا پہلا تعادم راجہ جے پال سے ہوا، اس کی راجدہانی لاہور تھی۔

راجگان خاندان پھاٹیہ

اس خاندان کی ابتدا تاریخ حسب ذیل ہے۔

اس خاندان کی حکومت ابتدا میں افغانستان اور تمام پنجاب پر تھی۔ اس کا مورث اعلیٰ "لیا" راجہ کشکا کو شانی کے آخری تاجدار "گنور من" کا وزیر تھا۔ نویں صدی عیسوی کے آخر میں "لیا" راجہ کو برطرف کر کے خود اس وسیع مملکت پر قابض ہو گیا۔ "لیا" فوت ہوا تو پھر سابق راجہ کے خاندان کے فرد "سمند دیوا" نے اپنے آباؤ ملک پر قبضہ کر لیا۔ ۱۰۹۰ء میں کشمیر کے راجہ گوپال درمن نے "سمند دیوا" کو مملکت دے کر لیا، کے بیٹے "تور من" کام لوک، کو پھر تخت سلطنت دلا یا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "لیا" کشمیری پنڈت تھا۔ برہمن ہمیشہ وزارت کے مالک رہے ہیں۔ لہذا گوپال درمن نے بھی اس کی مدد ہی وجہ سے کی، اس خاندان کی آئندہ تاریخ سے بھی اس حقیقت کی تائید ہوتی ہے کہ اس خاندان کا تعلق شروع سے کشمیر کے ساتھ رہا ہے۔ "کام لوک" مر گیا تو اس کا بیٹا "بہیم" جانشین ہوا۔ "بہیم" مشہور رانی کشمیر "دیوا" کا دادا تھا۔ لہذا راجہ کشمیر گنپتا کی زوجہ تھی۔ "بہیم" کے بعد جے پال جانشین ہوا۔ یہ واقعہ ۱۰۹۶ء کا ہے۔ اسی کا تعادم سبکدہ سے ہوا۔

یہ قائدانہ بھاڑیہ کہلاتا ہے۔ ان کی راج دہانی لاہور کا ایک
 حجازہ اب بھی بھائی سے موسوم ہے۔ ان کی حکومت پنجاب سے ملتان
 تک تھی۔ غزنی میں امرا کی حکومت تھی اور ملتان میں کبھی کبھی تخت نشینی کے
 بارہ میں تنازعہ بھی برپا ہوتا، جسے پال حالات کا جائزہ لے رہا تھا۔
 لہ اس انتظار میں تھا کہ اگر حالات سازگار ہوں تو پھر سے اپنے آبائی
 ملک غزنی وغیرہ پر قبضہ کیا جائے۔ جو ایک عرصہ سے مسلم حکومت کے
 تحت آچکا تھا۔ شمالی علاقہ ہاتھ سے نکل گیا تو یہ کمی اس نے جنوبی علاقہ
 کی تیسری پوری کر لی۔ ۱۱۹۱ء میں لاہور کے راجہ بھرت نے خود ہی
 جسے پال کو دعوت بھنگ دی چاہتا تھا۔ کہ پنجاب اور بہلم کا درمیانی علاقہ
 دیا لے لیکن جسے پال کے بیٹے انند پال نے اسے شکست فاش دے
 کر لاہور لے لیا۔ لیکن پھر اسی کو واپس کر دیا۔ راجپوتوں کا عام دستور
 رہا ہے۔ کہ جب کوئی راجہ دشمن کے مقابلہ میں پیٹھ دکھاتا تو اس قابل
 نہ سمجھا جاتا کہ اپنی غمخور قوم پر حکومت کرے۔ اس لیے بھرت تخت و
 تاج سے دست بردار ہو گیا اور اس کا بیٹا چند دت جانشین ہوا
 مگر جسے پال کے مقابلہ میں اسے بھی کامیابی نہ ہوئی۔ یہ تو لڑائی میں
 اسیر ہو گیا مگر اس کے بیٹوں نے بھاگ کر راجہ جالندھر کے ہاں پناہ
 لی، جسے پال نے پراساں تک تمام علاقہ اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔
 اس سے کمی تو پوری ہو گئی مگر سوسلہ اتنا بڑھ گیا کہ پھر سے شمالی علاقہ
 کی تیسری پوری ہو گیا۔ سبکتگین نے راجہ کو دو لڑائیوں میں شکست
 دی اور ملتان تک تمام علاقہ اپنی مملکت میں شامل کر لیا۔
 ۱۱۹۱ء میں سبکتگین کا انتقال ہو گیا۔ اس کا بڑا بیٹا محمود جانشین ہوا۔

ابوت اسلم سلطان محمود غزنوی

محمود کی یہ ولادت ۱۰۰۱ھ کو میر ۲۶۱ھ کی رات کو واقع ہوئی۔ اس کی والدہ رئیس زابلستان کی دختر تھی۔ لہذا ہی نسبت سے محمود کو زابلی بھی کہتے ہیں، زابلستان، لواری غزنی میں بلند لور خواش رود کے درمیانی علاقہ کا نام ہے۔ "شاہنامہ فردوسی" کا ہیرو، رستم بھی زابلی تھا۔ محمود کی تعلیم و تربیت اس نفاذ کے علماء کے تحت ہوئی۔ چنانچہ قرآن بھی حفظ کیا اور علم حدیث اور فقہ پر بھی عبور تھا۔ خود سبکتگین نے "پند نامہ" لکھا تھا۔ جس میں پند و نصائح کے پیرایہ اصول جہا بانی لور جہانداری بیان کئے، یہ بھی محمود کو ازبر تھا، جب کبھی امیر سبکتگین محمود کے احوال عمر میں غزنی سے باہر مہمات ملکی میں مصروف رہتا محمود ہی کو انتظام سلطنت کے لیے غزنی میں چھوڑ جاتا۔ لور ابوعلی کرمانی وزیر کے مشورے پر نو عمر محمود کا بار سلطنت خوش اسلوبی سے چلاتا رہا۔ فن حرب مردجہ میں بھی اسے کامل مہارت تھی لڑکپن ہی میں باپ کے ساتھ "غور" کی مہم میں تھا، عنصری ایک قصیدہ میں کہتا ہے کہ وہ از شجاعت گوئی بگود کی درغور یہ پشت اس پیا زرب بود پیش پید ہجده سال کی عمر تھی کہ ۱۰۰۹ھ میں سبکتگین کے ہمراہ لغمان کی لڑائی میں راجہ جے پال سے زہد آزما ہوا۔ ۱۰۱۲ھ میں قایق لور ابوعلی سمودی کی متحدہ فوج کے مقابلہ میں سبکتگین کے ساتھ تھا۔ اور وہ قاد مردانگی دی کہ امیر نے "سیف الدولہ" کا خطاب دیا اور خواماں کا دلی مقرر کیا۔

محمود خراساں میں تھا کہ سبکدوشی کا انتقال غزنی میں ہو گیا۔
 چھوٹے بھائی اسماعیل نے تخت و تاج پر قبضہ جمایا۔ محمود نے نا صحابہ
 خط لکھا کہ بھائی کاروبار سلطنت تم سے نہ چلے گا۔ مناسب ہے
 کہ تم یہ بادگراں جو برداشت نہیں کر سکتے اپنے کندھوں پر نہ رکھو
 ایک تو تم تاجدار، گاہد ہو اور دوسرے ہمارے خاندان کے بدخواہ
 بھی تمہارے گرد و پیش موجود ہیں جو بظاہر تمہارے ہوا خواہ بنے
 ہوئے ہیں۔ اگر تم ان کے مشورہ پر چلے تو سلطنت ہمارے خاندان
 کے ہاتھ سے نکل جائے گی۔ میں تمہیں محروم الارث نہیں کرتا۔ خراساں
 کی حکومت حاضر ہے! مگر اسماعیل نے اس نیک مشورہ کو قبول نہ
 کیا۔ محمود لشکر کے ساتھ ہرات پر آیا اور پھر ایک دفعہ لکھا کہ خراساں
 لہ بلخ میں سے کوئی ایک ملک لے لو اور غزنی میرے لیے چھوڑ دو
 یہ درخواست بھی مسترد ہو گئی۔ ہرات پر اس کا پھوٹا بھائی ابوالمنظرف
 عالی نسبت « اور چچا » یغزاجوق « والی ہرات اور فوج « اپنی اپنی
 فوج کے ساتھ محمود سے ملحق ہو گئے۔ اب یہ متحدہ لشکر غزنی کی
 طرف بڑھا۔ اسماعیل بھی مقابلہ کے لیے بلخ سے آکر آیا۔ محمود نے
 آخری دفعہ پھر کہد بھیجا کہ بھائی خانہ جنگی کا نتیجہ جیسا کچھ ہوا کرتا ہے
 تم پر بھی واضح ہے اس لیے میری درخواست مصالحت قبول کر دو۔
 اسماعیل یہ سمجھ رہا تھا کہ محمود جو بار بار مصالحت کی درخواست کر رہا ہے
 اپنی کمزوری محسوس کر رہا ہے۔ اس لیے یہ بھی ٹھکرا دی۔ آخر سبب
 نام و پیام اور دلائل عقلیہ سے کام نہ بنا تو دونوں برہان قاطع یعنی
 عوار پر آئے۔

بیچ لاکھ ۲۸۸ روپے میں نواح غزنی میں مغلوں فوجوں کا تصادم ہوا۔
 تاریخ ۱۹۹۸ء
 فتح پرچم محمودی پر لہرائی۔ غزنی محمود کے قبضہ میں آگیا۔ اسماعیل نے قلعہ بند ہو
 کر مقابلہ کی ٹھانی مگر گرد نواح کا تمام علاقہ محمود کے تصرف میں تھا اس
 لیے عاجز ہو کر اطاعت قبول کر لی۔ آنچہ وانا کند کند نادان۔ ایک
 بعد از ہزار رسوائی۔ محمود نے براورانہ محبت کے تقاضے کو نہ پھوڑا۔ بعد
 بھائی کے آرام و آسائش کا ہر ایک ممکن سامان جہیا کر دیا۔ مگر اسماعیل کے
 حواس غمہ کچھ ایسے منتل ہو چکے تھے کہ ایک امیر نوشتین سے سازش
 کی کہ محمود کو ٹھکانے لگا دیا جائے۔ محمود کو بروقت اطلاع ہو گئی۔
 امیر تو قتل ہوا۔ اسماعیل کو ابوالحارث کی حساست میں جرحیاں میں دکھا،
 یہاں اسماعیل نے بقیہ ایم تہنگی امن و آرام سے بسر کیے۔

اس خانہ جنگی کا فائدہ اٹھانے کے لیے ایک طرف خراساں و افغانستان
 درے کے والیان جو اب تک ویسے بیٹھے تھے اور دوسری طرف
 ہندو شاہی جس کی راجدھانی لاہور تھی کھڑے ہو گئے۔ حقیقت یہ
 ہے کہ یہ جسے سلطان مورخین "ہندو شاہی" سے موسوم کرتے ہیں ان
 جنگجو اقوام کے مقابلہ میں کچھ حیثیت نہ رکھتی تھیں جن کو سلطان محمود
 نے مسلسل لڑائیوں کے بعد تہرہ کیا۔ چنانچہ اس حقیقت کی طرف فرضی
 شاعر اپنے قصیدہ میں اشارہ کرتا ہے۔

خداوند نام دہائی و کورازیم شمشیرش

بلاں جانید کا ندگور شاں خوشتر مکاں باشد

شاہ دجے پال، لود رائے تندر رائے (قنوج) لود کوراس کی توار کے
 خوف سے ایسی جگہ بناہ گزین ہیں کہ قبر ہی کو محفوظ ترین مقام سمجھتے ہیں۔

زجنگ شاہ و جنگ رائے نندا نام کے جوید کے کز جنگھا اور اقمینہ جنگ خان باشر
 یہ محمود شاہ دسے پال اور رائے نندا کی لڑائیوں کو کس لیے
 کوئی قابل فخر بات سمجھ سکتا ہے کہ خاں ترکستان کے جنگ کو بھی کچھ اہمیت
 نہیں دیتا حالانکہ یہ نسبتاً بہت عظیم الشان ہے۔
 لہذا یہ بھی حقیقت ہے کہ سلطان اپنے باپ کی طرح پنجاب یا اردو
 سندھ اپنی مملکت میں شامل کرنا نہیں چاہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بار بار
 کامیاب معرکہ آرائی کے بعد بھی جے پال اور اس کے بعد اتند پال کو صرف
 تادان جنگ د قدیوالے کو چھوڑ دیا۔ اور ان کے ملک میں مداخلت نہ کی۔
 سلطان محمود صرف اتنا ہی چاہتا تھا کہ ممالک اسلام ترکستان اور ایران
 اس کے قبضہ میں رہیں۔ اور ان پر تسلط قائم رکھنے کے لیے اس کو اس
 سے کہیں بڑھ چڑھ کر زحمت اٹھانی پڑی جو ہندوستان پر شاہ سلاطین
 میں برداشت کی۔ لہذا پچ تو یہ ہے کہ اس کا جوہر شجاعت ترکستان
 اور ایران کی جہات میں ہی نمایاں ہے۔ مگر راجگان لاہور پے در پے
 شکست کے بعد بھی ہمیشہ دعوت جنگ دیتے رہے اور اگر لڑائی
 صرف ان کے اور سلطان محمود کے درمیان محدود رہتی تو یقیناً سلطان
 محمود ہندوستان کی طرف رخ نہ کرتا، لیکن راجگان لاہور نے جب دیکھا
 کہ وہ اپنا آبائی ملک نرائے سندھ اکیلے لڑ کر نہیں لے سکتے تو
 راجگان راجپوتانہ کو متنبہ کیا کہ آج ہم بے بس ہیں تو یہ سیلاب جو
 سندھ کی طرف سے بڑھ رہا ہے تم سب کو گنگا اور جھنا تک بہا لے
 جائے گا۔ اور اس لیے دھرم کے نام پر یہ بھی ترغیب دی کہ متحدہ ہو کر
 ہماری مدد کرو۔ چنانچہ ان تمام راجاؤں نے مدد دی۔

سلطان محمود تخت نشینی سے ایک سال بعد ۲۸۹ھ تک پاور رگاب
 رہا۔ اس کی سلطنت کی حدود جانب غرب اصفہان کے شہر ہمدان اور
 جانب بلخ اور کوہ ہندوکش اور جانب جنوب مشرق تمام پنجاب اور
 بھنگڑہ تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اس کی ترک تازی کا ٹھکانہ و آگرہ گجرات تک اور
 ایمان کے صوبہ جات میں مسلسل جاری رہی، ان میں سے ہم چند ایک
 معرکوں کے حالات بالاختصار بیان کرتے ہیں۔

مغورہ ایک پہاڑی سلسلہ میں واقع ہے۔ ہرات کے
غورستان مشرق اور جنوب مشرق سے لیکر غورستان اور خیرجان

کے جنوب تک یہ سلسلہ کوہ چلا گیا ہے۔ اور بنام غورستان موسوم ہے
 اس کے بیرونی حصہ پر مسلمان فاتحین بہت عرصہ پیشتر قابض ہو چکے
 تھے۔ لیکن اندرونی دشوار گزار سنگلاخ راستوں پر ابھی تک ان کے قدم
 آگے نہ بڑھے۔ سلطان محمود کے والد امیر سبکتگن نے اسے اپنی سلطنت
 میں ملانا چاہا مگر اس کا اقتدار مشرقی غور تک رہا، ابن سوری کا حکم
 مندیش نے امیر کی اطاعت بلائے نام تسلیم کر لی۔ امیر کی وفات کے
 بعد اس نے وہی آبائی پیشہ رہزنی اختیار کیا اور تجارتی قافلوں کو لوٹتا
 رہا۔ طوقہ صوبہ جات کے حالیان کبھی کبھی اس پر چڑھائی کرتے مگر یہ
 پہاڑوں میں پناہ لیا رہا۔ اس پر سلطان محمود بذات خود غور
 کی طرف بڑھا۔ انتوتامش عالی یلرت بعد ارسلان جاذیب عالی طوس
 کے براہل لشکر کا تعادم ایل غور سے ہوا۔ انتوتامش پسپا ہو رہا
 تھا۔ کہ سلطان محمود پہنچ گیا۔ چند بھڑپوں کے بعد غوری تتر بتر ہو گئے
 ان کا مدد مقام آہنگراں تھا۔ سلطان اس طرف بڑھ رہا تھا کہ ابن سوری

کلامنا سامنا ہو گیا۔ ابن سوری نے سلطان کے ماتہ میں پہاڑیوں میں
 مضبوط مورچہ بننے کی ہوتی تھی۔ اس کے تحت اس وقت دس ہزار
 کی بحیثیت تھی۔ اگرچہ سلطان نے پے در پے سخت حملے کیے مگر غوری
 کو مورچوں سے یا ہرنہ لاسکا۔ سلطان ایک سپاہیانہ چال چلا۔ سلطان
 فوج کا وہ صدر جو دشمن کے مورچوں کے سامنے تھا بھاگ کھڑا ہوا۔
 دشمن فتح کے نشہ میں سرشار مورچوں سے باہر نکل کر تعاقب کرتا ہوا
 بہت دور میدان میں بڑھ آیا۔ اس وقت سلطانی فوج پٹی لہ غوریوں
 کو زخم میں لے لیا۔ ابن سوری لہ اکثر غوری سردار اسیر ہو گئے۔ سلطان
 نے "مندیشہ" ابن سوری کے بیٹے ابو علی" کو دے دیا اور ابن سوری
 غوری سرداروں کو غزنی میں قید رکھا، ابن سوری کو اس شکست کا
 صدمہ ہوا کہ قیسری میں مر گیا۔

اسی وقت تک سلطان کا قبضہ مشرقی غور تک محدود تھا۔ لیکن
 ارادہ کر چکا تھا کہ تمام ملک سلطنت غزنی میں شامل کیا جائے۔
 سلطان جنوب مشرقی علاقہ تک بڑھا اور "خواہن" کے چند قلعوں
 تغیر کے بعد غزنی کی طرف لوٹ آیا۔ سلطنت کے دیگر حصوں کی طرف
 سلطان کی توجہ رہی اس لیے اس ہم کو ناتمام چھوڑنا پڑا۔ چند سال بعد
 سلطان نے اپنے بیٹے مسعود کو غور کا شمال مغربی صدر مسخر کرنے
 لیے بھیجا۔ خواہن میں سلطان کا نائب "ابوالحسن خلیف" بھی مسعود
 ملحق ہو گیا۔ مسعود بہری رود کے کنارہ کے ساتھ ساتھ کوچ کرتا ہوا
 میں چند پہاڑی قلعے مسخر کئے اور صدر مقام "تب" کے اندر داخل ہوا۔
 تب کی تغیر کے بعد مسعود "تور" پر بڑھا۔ لہ اسے بھی مسخر کر لیا۔

طرح غور کا اکثر حصہ سلطنت غزنی میں شامل ہو گیا۔ اس وقت تک
اسلام غور کے اندرونی حصہ میں شائع نہ ہوا تھا۔ اب اہل غور اس کے
انغوش میں جوق حد جوق آنے لگے۔

”نور“ پشتو زبان میں مہارشی علاقہ کو کہتے ہیں۔

سلطان کے زمانہ میں یہ لوگ بت پرست تھے

فتح لور و قیرات

لور لور قیرات دو دریا موجودہ کافرستان میں بہتے ہیں، اس علاقہ میں
لوگوں کا عام مذہب بدعت کی منح شدہ صورت تھی۔ اور ساکی سنہاید
کی پوجا کرتے تھے۔ سلطان نے پہلے اس وادی میں راستہ صاف کیا۔
قیرات کے حاکم نے اطاعت اختیار کی اور ساتھ ہی اسلام بھی قبول کیا۔ اس
کی رعایا بھی مسلمان ہو گئی۔ سلطان نے اس کی حکومت برقرار رکھی۔ وادی لور
کے لوگوں نے مقابلہ کیا۔ سلطان کے ایک فوجی افسر علی بن اہل ارسلان
نے ان کو نیچا دکھایا۔ سلطان نے چند علماء کو اس علاقہ میں اشاعت
اسلام اور لوگوں کی تعلیم و تربیت پر مامور کیا۔ اس کار خیر کی تکمیل ہمارے
زمانہ میں امیر عبدالرحمن ہامی کابل نے کی۔

رے کا حاکم آل بویہ میں سے

غزالدولہ تھا۔ اس کا انتقال

تیمور لے و ہمدان و صفہان

۶۹۹ھ میں ہو گیا اس کا بیٹا محمد الدولہ نو سال کا لڑکا تھا۔ جانشین تو
بھی بیٹا والدہ کی سرپرستی میں ہوا۔ جب محمد الدولہ سن بلوغ کو پہنچا تو والدہ
”سعیدہ“ کی سرپرستی ناگوار گئی۔ مگر والدہ بھی حکومت سے دست بردار
ہونا نہ چاہتی تھی۔ کشمکش شروع ہوئی تو محمد الدولہ کو بھگنا پڑا۔ ۱۹
۶۱۰۲۸ھ میں سعیدہ کا انتقال ہو گیا۔ محمد الدولہ اگرچہ اب ہر طرح سے آزاد تھا۔

مگر یہ علم دوست واقع ہوا تھا اور اتنا نرم طبع تھا کہ سپاہ پر قابو نہ رہا۔
 بعد یہ خود سر ہو گئی۔ اور مجدد الدولہ کو بھی اپنی خیر نظر نہ آئی۔ سلطان محمود
 کی امداد طلب کی۔ جب سلطانی فوج حاجب علی کے تحت رے پر بڑھی تو
 غالباً سپاہ سے ڈر کر مجدد الدولہ نے ارادہ بدل لیا اور خود مقابلہ کے لیے نکل
 آیا۔ لیکن جب علی سے آما سامنا ہوا تو گھوڑے سے اتر کر علی کے
 پاس بغرض اطاعت آیا۔ علی نے اسے غزنی بھیج دیا۔ یہاں واجب احترام
 کیا گیا۔ بقیہ عمر اسائن سے بسر کی۔

ہم بیان کر چکے ہیں کہ آل بویہ کا مذہب شیعہ اثنا عشریہ تھا۔
 اصغیان بلکہ ایران کے طول و عرض میں ان کے علاوہ معتزلہ اور قرمطیوں کی
 کثرت تھی۔ معتزلہ تو زیادہ تر امن پسند فلسفی تھے۔ صرف خلیفہ ہاموں رشید
 کے عہد میں ان کی بن آئی کیونکہ خلیفہ نے مذہب الاعتزال اختیار کر لیا
 تھا۔ لہذا یہ راج دھرم ہو گیا۔ اہل سنت و الجماعت پر سختی شروع ہو گئی۔
 ہامعقول بحث کا موضوع مسئلہ خلق قرآن تھا۔ امام احمد بن حنبل تک کو
 کوڑے لگوائے گئے قرمطی بنو قاطمہ کے داعی تھے۔ بنو قاطمہ تو امام کھلائے
 لہذا یہ "سیدہ" چنانچہ ناصر خسرو علوی اپنے سفر نامہ میں لکھتا ہے کہ بحرن
 پر ان کا تسلط ہے اور سب اپنے آپ کو "سیدہ" کہتے ہیں۔ ہر قصاب
 کی دوکان پر گائے، بھیڑ بکری، سور کا گوشت ہوتا ہے یہ خریدار کی مرضی
 ہے جو بھی پسند کرے لے لے۔ یعنی ان میں حلال حرام کی تمیز نہیں رہی،
 اس فرقہ کو "باطنی" بھی کہتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ قرآن کا ایک ظاہر
 اور ایک باطن اور باطن اصل ہے اور باطن کی تفسیر جو کچھ کرتے ہیں محض
 الحاد ہے۔ اس لیے اہل سنت و الجماعت انکو ملاحظہ کہتے ہیں۔ تصوف

کی اڑنے کو ان لوگوں نے اکثر طحڑاۓ عقائد کی اشاعت کی۔ یہ اتنا زور پکڑ گئے تھے کہ صحیح کے تمام راستے بند کر دیئے تھے۔ خاص مکہ معظمہ پر حج کے ایام میں حد کیا حاجیوں کو تہ تیغ بدلیخ کیا اور لاشیں زمزم میں ڈال دیں۔ ہجر اسود اکھاڑ کر لے گئے۔ جب فاطمی خلیفہ علیہ اللہ المہدی نے سرزنشی کی تو واپس کیا۔

اب کہ سلطان محمود نے اصفہان مسخر کر لیا تو ان قرمطیوں کی خوب خبر لی۔ اکثر مارے گئے اور اکثر اسیری کی حالت میں خراساں لائے گئے اور یہاں قتل کئے گئے۔ ان کی کتابیں جو بھی دستیاب ہوئیں جلائی گئیں۔ سلطان نے رے میں چند ماہ قیام کیا۔ تمام طحڑاۓ علاقہ کے والیان نے اطاعت اختیار کی مگر ابراہیم بن مرزبان و طمی نے مقابلہ کی ٹھان لی۔ یہ شخص "سالار" کے لقب سے مشہور ہے۔ زنجان اور امیر اور مہر جہاں "اور شہر نور" کا حاکم تھا۔ سالار کا حریف اس کا اپنا قریبی مرزبان بن حسن تھا۔ اور اس وقت سلطان محمود کے ہمراہ تھا۔ مرزبان نے بعض و طمی سرداروں سے بھی ساز باز کر رکھی تھی۔ سلطان کی مدد سے قزوین پر قابض ہو گیا۔ سلطان تو غزنی کی طرف لوٹ گیا سالار کو موقع ملا تھا آیا۔ مرزبان کو شکست دے کر پھر قزوین پر قبضہ کر لیا۔ ^{۱۰۰۰} سلطان نے اپنے بیٹے مسعود کو ایک لشکر جراد کے ساتھ روانہ کیا کہ تمام علاقہ جو آل بویہ کے تحت تھا مسخر کر کے سلطنت غزنی شامل کیا جائے۔ مسعود نے سالار کو شکست دے کر اسیر کر لیا۔ سالار کے بیٹے نے اطاعت قبول کی، اب مسعود رے کی طرف بڑھا "علاء الدولہ بن کوبہ" کسریٰ کی طرف بھاگ گیا علاء الدولہ نے اپنے عزیز جلال الدولہ کے ذریعہ عباسی خلیفہ کی سفارش روئے کار

لایا کہ اصفہان میں بطور نائب السلطنت رہتے دیا جائے۔ سفارش منظر ہو گئی اس عرصہ میں سلطان محمود کا انتقال غزنی میں ہو گیا اور مسعود کو غزنی کی طرف واپس لوٹنا پڑا۔

راجہ جے پال بھائی پٹیا ہم بیان کر چکے ہیں کہ سلطان محمود کی توجہ کا جذبہ اصفہان اور خراساں اور ترکمان

لہذا بدوچستان محمود کا رہا اور حقیقت یہ ہے کہ اس کے والد کی معرفت بھی اسی سمت معرکہ آرائی میں رہتی اس لیے خاندان بھائی پٹیا کے راجہ جے پال کو دریا سندھ کے پار کا علاقہ مستحکم کرنے کا حوصلہ ہوا۔ اگرچہ دو دفعہ اس نے سبکتگین کے مقابلہ میں شکست کھائی مگر اس کا اثر اس پر کچھ نہ ہوا۔ ۹۸۶ء میں محمود نے لمخان مسخر کر لیا۔ ۹۸۶ء میں راجہ جے پال اور سبکتگین کے درمیان لڑائی ہوئی تھی۔ لمخان اس وقت راجہ کی سلطنت میں شامل تھا۔ لمخان کا فرستان اور کابل کے درمیان جانب شمال واقع ہوا۔ اس لڑائی میں قدرت نے سبکتگین کی مدد کی، مدد نے ہندوستانوں سے وہ کام کیا جو امیر کی تلوار سے نہ ہوتا۔ بے چارے ٹھٹھ کر رہ گئے۔ راجہ نے امیر سے صلح کر لی اور لوٹ آیا۔ سلطان محمود نے لمخان کو لے لیا تو راجہ لاؤر لشکر کے ساتھ دریا سندھ کو عبور کر کے بڑھا، "دیبند" پر محمود نے پیش قدمی روک دی "دیبند" سندھ کے مغربی کنارہ پر پٹور کے شمال مشرق اور کابل کے مشرق میں واقع ہے۔ کہیں اپنی تاریخ راجہ ترگین میں اسے "اودیبند" لکھا ہے اس کا موجودہ نام "ہند" ہے۔

محمود غزنی سے ہندو ہزار سوار اور مجاہدین کے ساتھ جو دور دور

سے بغرض جہادنی بسیل اللہ غزنی میں جمع ہوئے پشاور تک بڑھ آیا۔ اور
 یہاں خیمے گاڑ دیئے۔ راجہ جے پال کے ہمراہ بارہ ہزار گھوڑے بڑھے۔ اور
 بیس ہزار پیادے اور تین سو جنگی ہاتھی تھے۔ وہ بھی محمود کے سامنے اتر
 پڑا۔ دونوں فوجوں کا تصادم ۱۰ اکتوبر ۱۰۰۱ء میں ہوا۔ لڑائی سخت خوریز
 تھی۔ تک ساروں کے لیے درپے حملوں کی تاب ہندوستانی نہ لائے
 پانچ ہزار تو میدان جنگ میں کھیت رہے، بقیہ التیف بھاگ کھڑے
 ہوئے۔ خود جے پال اور اس کے پندرہ بیٹے اور پوتے اسیر ہو گئے۔
 جے پال نے دو لاکھ پچاس ہزار دینار لہہ پچاس ہاتھی دینے کا وعدہ
 کیا لہہ گلو خلائی کرائی۔ سلطان نے اس کا ایک بیٹا لہہ ایک پوتا بطور
 یرغمال رکھ لیا کہ زر قدیر کی ادائیگی پر ان کو بھی پھوڑا جائے گا۔

دہلی یا ہمدراہ راجگان بھاٹیہ کی راج و ہائی تھی۔ سلطان اس
 فتح کے بعد اس طرف بڑھا اور گردو ادراج کا علاقہ مسخر کر کے غزنی کو لوٹ گیا۔
 اس مقام پر یہ تاریخی واقعہ اور اس کی حقیقت اچھی
مسئلہ چھوٹ طرح ذہن نشین کرنی چاہئے جس کا تعلق مسئلہ چھوٹ
 سے ہے۔ اکثر مؤرخین نے اسی واقعہ سے ٹھوکر کھالی ہے اور اس کو ایک
 ہی رنگ میں پیش کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس شکست کے بعد جے پال
 نے خود کشی کی اور زردہ گنی کی بھینٹ چڑھو گیا۔ بظاہر قیاس ہوتا ہے
 کہ شکست کی تلامت غمخور راجپوت راجہ برواشت نے اس کا مگر حقیقت
 یہ نہیں۔ وہ دفعہ شکست تو وہ پہلے بھی سبکتگین کے مقابلہ میں کھا چکا
 تھا۔ بات اصل میں یہ ہے کہ ہندوں میں ذاتوں کا امتیاز خاص شے
 ہے اور اس کی بندھن اتنی سخت ہے کہ اعلیٰ ذات کا دھرم چھتری لہہ

اس سے ادنیٰ ولیث کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا نہیں کھاتا۔ لہذا مسلمان تو ہندوؤں کے نزدیک بیچہ اور لاکشش تھے۔ ان کی قید میں رہ کر کوئی ہندو ہندو نہیں رہ سکتا تھا۔ اس لیے جب کبھی سلاطین اسلام کا مقابلہ کسی ہندو راجہ سے ہوا اور وہ تاب مقابلہ نہ لایا تو وہ پہلے ہی سمجھ چکا تھا کہ اگر ایسر ہوا تو ہندو برادری سے خارج تصور ہوگا۔ اس لیے وہ اور اس کا خاندان زن و مرد جان پر کھیل جاتے۔ اس کو وہ اپنی اصطلاح میں "جوہر" کہتے، اہ اگر زندہ رہنا پسند کرتا تو با تو بھاگ کر جان بچاتا اور اگر ایسر ہوتا تو اسلام قبول کرتا۔ ہندوؤں میں ابتدائی دور سلاطین اسلام میں اشاعت اسلام کی ایک یہ بھی وجہ ہے۔ جب برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان کے اکثر حصہ پر چھا گئی تو مسیحی مشنری بھی تبلیغ دین کے لیے کلکتہ میں مہر گری دکھانے لگے مگر کچھ کامیابی نہ ہوئی۔ انہیں چھوٹ کا راز معلوم تھا۔ ایک دن کچھ اکابر بنگالیوں کو کھانے پر مدعو کیا اور یہ ذہن نشین کرایا کہ کھانا برہمن ہی کے ہاتھ کا پکا ہوگا۔ برہمن کے ہاتھ سے ہر ایک ذات کا آدمی کھانا کھا سکتا ہے، حقیقت بھی یہی تھی کہ چند برہمن فرضی یا حقیقی عیسائی مذہب میں داخل ہو چکے تھے۔ اور ان کی ظاہری شکل و صورت سے بھی شبہ کی گنجائش نہ تھی، صیافیت کے بعد غالباً یہ حال نہ کھلتا مگر پادریوں نے خود ہی تشہیر کیا کہ اتنے اکابر نے عیسائیوں کا کھانا کھا یا ہے۔ انہیں فوراً برادری سے خارج کیا گیا۔ اب ان کو اس کے صوا چارہ کار نہ تھا۔ کہ مسیحی مذہب قبول کیا۔ اور کئی چٹری اور مگر جی اہ گھوش خاندان مسحت کی انخوش میں آ گئے۔

اندر پال | راجہ بے پال کے بعد اس کا بیٹا اند پال جانشین ہوا۔

ہم بیان کر چکے ہیں بنو فاطمہ کے وادی قرمطی حسب فتویٰ علماء اسلام بعد از محمد
 قرار پانچکے تھے، اور یہ کہ یہ نہ صرف الحاد جامعہ مسلمانی میں شائع کرے
 تھے بلکہ ہر وہ مسلمان جو بنو فاطمہ کا طرفدار نہ تھا ان کے نزدیک واجب القتل
 تھا۔ انہوں نے ایک عرصہ تک دنیا و اسلام میں قتل و غارت کا بازار گرم
 رکھا۔ محمد بن قاسم نے وادی سندھ ملتان تک فتح کی۔ اور ملتان تک علاقہ
 اب خلافت عباسیہ کے تحت تھا۔ لیکن یہ حکومت برائے نام ہی تھی۔ سلطان
 محمود کے عہد میں ملتان قرمطیوں کا گڑھ تھا۔ یہاں اس وقت ان کا حاکم
 ابوالفتح واؤد تھا۔ سلطان محمود حسب ایما خلیفہ عباسی بعد علماء اسلام ان کا
 قلع فتح کرنا چاہتا تھا اس لیے ۳۹۶ھ میں اس کا ارادہ ملتان پر لشکر کشی
 کا ہوا۔ وہاں سندھ پشاور کے قریب سمجور ہو سکتا تھا۔ اس لیے راجہ
 انند پال سے اجازت طلب کی کہ میری فوج کو اپنے ملک سے گزرنے
 دیں۔ انند پال واؤد سے ساز باز کر رہا تھا۔ اس لیے انکار کیا اور
 پشاور کی طرف لشکر کشی کی کہ سلطانی فوج کی پیش قدمی یہاں روک دی
 جائے۔ سلطان نے شکست فاش دی اور دریاہ پنجاب تک تعاقب کیا۔
 انند پال تو کشمیر کی پہاڑیوں میں پناہ گزین ہوا سلطان ملتان کی طرف
 بڑھا گیا۔ انند پال نے تلخ تجربہ کے بعد محسوس کیا کہ اکیلا سلطان کا مقابلہ
 نہیں کر سکتا۔ اس لیے ہندوستان کے راجوں سے امداد طلب کی راجگان
 اجین اور گوالیار اور کالجز اور قنوج اور اجمیر نے انند پال کی مدد اپنی
 اپنی سپاہ سے کی، یہ متحدہ عسکری قوت مدین پال پسر راجہ انند پال کے
 تحت پشاور کی طرف بڑھی، ہندو شاہی کی پورشش کی اطلاع سلطان
 کو ہوئی تو ۲۹ ربیع الثانی ۳۹۹ھ کو غزنی سے کوچ کرتا ہوا دریاہ سندھ کو

عبور کیا اور ہند کے بالمقابل اندھ پال کی فوج سے ٹکری۔ ہندو جان توڑ کر لڑے۔ تمام دن معرکہ کارزار گرم رہا۔ آفتاب غروب ہونے کو تھا کہ سلطان کے محافظ دستہ نے اس زور کا حملہ کیا کہ ہند سپاہ پسا ہوتے ہوئے منتشر ہو گئی۔ میدان سلطان کے ہاتھ رہا۔ سلطان تعاقب کرتا ہوا قلعہ "نگرکوٹ" تک بڑھ آیا۔ یہ قلعہ کانگرہ کے قریب میں واقع تھا۔ اور دریائے گنگا نے اسے گھیرے میں لیا ہوا تھا۔ یہ درحقیقت قلعہ تھا۔ مندھ تھا۔ تین دن محاصرہ کے بعد قلعہ سر ہو گیا۔ مندھ کی دولت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ مال غنیمت میں سات کروڑ درہم مسکوہ اور ستر ہزار من چاندی سونا اور بیش قیمت موتی اور جواہرات اور دیا اور حیرت کے تھان مسلمانوں کے ہاتھ لگے۔

اس مقام پر یہ حقیقت بھی اچھی طرح دل نشین کرنی چاہئے کہ سلطان محمود کا حملہ کسی نہ کسی مندھ پر ہی ہوا۔ اس کی خاص وجہ ہے۔ مندھوں میں جتنا مال و دولت جمع تھا وہ کسی راجہ کے خزانہ میں بھی نہ تھا۔ جو بھی بیش قیمت شے کسی راجہ کے ہاتھ لگتی بتوں کی مندر کرتا۔ حد ہے کہ راجے اپنی لڑکیاں بھی مندھ کی خدمت کے لیے پڑھا پڑھا پڑھاتے۔ سلطان محمود نے نہ کسی مندھ کو مسمار کیا اور نہ کوئی بت سوائے سومناٹھ توڑا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ عیبت کام ہے۔ ایک مندھ اور ایک بت کی جگہ بے شمار مندھ بن سکتے ہیں، کیونکہ ہر ایک ہندو کا گھر بت کدہ تھا۔ ابھی تک سلطان کا یہ ارادہ بھی نہ تھا کہ ہندو شاہی کے کسی حصہ ملک کو اپنی سلطنت میں شامل کر لے لیکن جب اس نے دیکھا کہ ہمایہ راجہ نہ چین سے بیٹھا ہے اور نہ چین لینے دیتا ہے اور ہندوستان کے ہندو

راجے بھی دعوت جنگ دے چکے ہیں تو سندھ تک تمام علاقہ اپنے قبضہ تصرف میں لے لیا۔ اگر راجگان بھاڑیں لڑائی نہ چھیڑتے تو غالباً دیوار سندھ دونوں ملکوں کی مستقل حدود قائم رہتی۔ سندھ کے پار عموماً ہندو بدھ مت کے پیرو تھے۔ اور جیسا کہ ہم بیان کر آئے ہیں، پھولتہ کی وجہ سے تمام ہندو آبادی برادری سے خارج ہو چکی تھی اور ان میں اسلام سرعوت سے پھیل رہا تھا۔ سلطان نے ان کو اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ اور علماء اسلام ان کی تعلیم و تربیت میں مشغول ہو گئے۔

انندپال مرگیا تو اس کا بیٹا ترلوچن پال، باپ کی جگہ بیٹھا۔ ترلوچن پال غالباً انندپال کے آخری ایام کی طرح امن سے گزار دیتا مگر اس کا بیٹا بہیم پال جو ٹڈر (سبے خوف) کے لقب سے مشہور ہے شوریدہ سر فاقع ہوا تھا اس نے سلطان سے ایک دفعہ دو دو ہاتھ کرنے کی ٹھان لی۔ بہیم پال اس وقت کوہ نمک کے قلعہ "ننڈا" میں حملہ کی تیاری میں مصروف تھا۔ یہ قلعہ اس سلسلہ کوہ کی ایک شمالی چوٹی پر واقع تھا۔ پہاڑیوں کے شمالی اطراف میں مضبوط مورچہ بندی کے بعد جنگی ہاتھیوں کی قطار سجائے خود ایک سکندر تھی۔ سلطان کو اس حملہ کی اطلاع ہوئی تو اس طرف بڑھا۔ چند روز معرکہ آرائی رہی مگر مورچہ بندی اتنی مضبوط تھی کہ پلے در پلے حملوں کا اثر کچھ نہ ہوا۔ سلطان دو دن تک پیچھے ہٹتا ہوا کھلے میدان میں آ گیا۔ بہیم پال نے خیال کیا کہ دشمن شکست خورہ پیچھے ہٹ رہا ہے اس لیے دیرانہ آگے بڑھتا ہوا مورچے پھوڑ دئے۔ اب کھلے میدان میں دونوں فوجوں کا تصادم ہوا۔ سلطان بھی چاہتا تھا۔ ہندو فوج ترکی تیر اندازوں کے سامنے ٹھہرنے لگی۔ بہیم پال کو بھی اپنی خلطی کا احساس ہوا۔ اس نے

ہاتھوں کے ملنے کیا اور سلطانی سپاہ پر پہاڑوں دیا لیکن ترکی تیراندازوں نے ہاتھوں
 کی آنکھوں کو ہفت بنایا ہندو سپاہ کے ہاؤں اکٹر گئے اور بہیم پال قلعہ نندانہ میں
 محصور ہو گیا۔ یہ قلعہ بھی ایک مندر بھی تھا۔ یعنی اپنی تاریخ "مینی" میں
 لکھتا ہے کہ اس میں "بدھ" کا ایک عظیم الشان بت تھا۔ محمد ناظم سلطان محمود کے سوانح
 The Life and Times of Sultan Mahmud
 میں لکھی کی تردید کرتے ہوئے لکھتا
 ہے کہ اس کو بت "اود بدھ" سے مقابلہ ہوا ہے مگر اس سے یہ نہیں لکھا کہ اتنا بڑا بت
 آخر کس دیوتا کا تھا۔ غنی سلطان محمود کا ہم عصر مورخ ہے اور اس نے صحیح
 لکھا ہے کہ یہ ہاتھ بدھ ہی کا بت تھا، شمالی پنجاب میں بدھ مت کا زور
 صدیوں تک رہا ہے اور ان کے "سوپا" کے آثار اب بھی یہاں موجود ہیں۔
 اور یہ تمام مندر انہی لوگوں کے تعمیر کردہ تھے۔ ہاتھ بدھ اور اس مت کے
 بزرگوں کے چھوٹے بڑے بت ان مندروں میں تھے جن کی پوجا ہوتی۔ ایرانی
 حکومت پنجاب پر سکندر اعظم کے حملہ تک رہی، انہوں نے جب بدھوں کی
 مورتیاں دیکھیں اور ان کو کہا گیا کہ یہ بدھ کی مورتیاں ہیں تو اپنی زبان میں
 "بدھ" کو بت "کہا۔ دراصل ہندی "بدھ" اور فارسی "بت" ایک ہی لفظ
 ہے فرق صرف لب و لہجہ کا ہے۔ رفتہ رفتہ فارسی زبان کے لفظ "بت"
 کا اطلاق ہر ایک مورتی پر ہو گیا۔ معنی میں اور وسعت ہوئی تو ہر ایک
 غیر خدا جو منظر الوہیت تصور ہوتی بت بن گئی۔ اصطلاح تصوف
 میں پیر پرتی، رسول پرتی بت پرتی سے تعبیر ہوتی ہے خسرو کہتا ہے
 غنی کی گوید کہ خسرو بت پرتی کی کند آدے آدے کی کند باغلق عالم کارنیت
 بہیم پال نے دیکھا کہ مقابلے سود سے چلنے سے کھسک گیا اور
 اپنے والد نزلوچن پال سے جلا ملا۔ یہاں ترلوچن پال افواج کشمیر کے

ساتھ جہلم کے شمال میں پہاڑی علاقہ میں پڑا تھا۔ سپہ سالار افواج کشمیر
 تنگا تھا۔ نندانہ کی تسخیر کے بعد سلطان اوسر متوجہ ہوا۔ پنڈت کلہن نے
 راج ترنگنی میں اس معرکہ کا حال لکھا ہے۔ وہ سلطانی فوج کو "تروکشا"
 (ترکی کہتا ہے اور سلطان کو بہیر دامیرا کے نام سے یاد کرتا ہے) پہلے
 ہی حملہ میں تنگا اور ترلوچن بھاگ گئے۔ اب شمالی پنجاب میں کوئی مقابل
 حریف نہ رہا، چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے سردار تحائف کے ساتھ سلطان
 کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مطیع ہو گئے۔ بلکہ اسلام بھی قبول کیا۔
 سلطان نے جا بجا مسجدیں تعمیر کیں اور ان کے ساتھ مدد سے اود مکتب کھول دیئے۔
 ترلوچن اور اس کا بیٹا بہیم اب شوالک کی پہاڑیوں میں پناہ گزین
 ہوئے۔ چند رائے ٹھرا کی بیٹی سے بہیم کا عقد نکاح ہوا تو پہاڑی راہوں
 کی امداد بھی حاصل ہو گئی۔ لیکن سلطان نے بھی اب مصمم ارادہ کر لیا کہ پنجاب
 میں ہندو شاہی کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کیا جائے۔ اس کی وجہ ایک یہ
 بھی ہوئی کہ یہاں اسلام مسرت سے پھیل رہا تھا اور نو مسلم رعایا کو
 ہندو شاہی کے رحم و کرم پر چھوڑنا نامناسب تھا۔ جب سلطان نے پہاڑی
 راجہ چند رائے کو اطاعت کا پیغام دیا اور فوج کے ساتھ اس طرف
 بڑھا تو رائے اور بہیم پال جو اس کے پاس ہی تھا بھاگ گئے۔ وہ خوف
 زدہ تھے کہ اگر اسیر ہوئے تو یا تو خودکشی کرنی پڑے گی یا اسلام قبول
 کرنا ہوگا۔ ترلوچن کا لہجر کے راجہ کے ہاں امداد کے لیے جا رہا تھا۔ کچھ
 سپاہ ساتھ تھی۔ لیکن یہاں بھی سلطانی سپاہ نے پیچھا نہ چھوڑا تو راجہ
 نے قنوج کی طرف رخ کیا۔ سلطانی سپاہ تعاقب میں تھی۔ دربارِ رحمت
 (لام گنگا) نے سلطانی سپاہ کی پیش قدمی کو دیکھ کر دہلی سے گارہ پر

دشمن کی فوج راستہ روکے کھڑی تھی۔ سلطان سیپاہ تیروں کی بارش میں
 دریا عبور کر گئی دریا کے دوسری طرف ترلوچن نے جم کر مقابلہ کیا مگر شکست
 کھائی رزخ مخروہ جان بچا کر نکل گیا۔ مگر راستہ میں ^{۱۲۱۲} _{۱۱۲۱} میں اس کے
 ایک سپاہی نے اس کا کام تمام کر دیا۔ لہذا اس کے ساتھ پنجاب میں
 ہندو شاہی کا خاتمہ ہو گیا۔ سلطان نے یہ ملک سلطنت غزنی میں شامل
 کر لیا۔ سلطان محمود پہلا مسلمان بادشاہ پنجاب ہے۔ خاندان غزنیہ کے
 بعد یہ ملک ہمیشہ سلاطین اسلام کے تحت چہا راہو رنجیت شاہ تک رہا
 اس کے بعد انگریزوں کی عملداری میں آیا۔ اب پھر اس کا نصف حصہ
 پاکستان کا ایک صوبہ ہے۔

خاندان بھاٹیہ کے اکثر افراد کشمیر میں پناہ گزین ہوئے۔ اس
 کے بعد ان میں سے کسی نے پنجاب کا رخ نہ کیا۔ لہذا امن سے زندگی
 بسر کرتے رہے۔ لفظ "بھاٹ" کشمیری زبان میں "بٹ" ہے اور
 افغانستان میں ان کو "بٹنی خیل" کہتے ہیں۔ محمد جلال الدین اکبر منلیہ شہنشاہ
 کا درباری رتن راہو بیربل بھی بھاٹ تھا۔ بلکہ ابتدا میں ہر ایک بھٹی
 بھی بھاٹ تھا کیونکہ برہمن کے ہاتھ کا کھانا ہر ایک ہندو کھا تا ہے۔
 پنجاب میں بھٹی راجپوت عموماً مسلمان ہیں، ہندو لور مسلم اقلیت پیدا کرنے
 کے لیے بھاٹ تو ہندو اور بھٹی مسلمان کہلائے۔ یہ سب مار سوت
 برہمن ہیں۔ راہو لور راجپوت ان کو اس لیے کہتے کہ یہ راہو بھی تھے لہذا
 ان کے خاندان کے افراد جو بھی ان سے وابستہ تھا راجپوت کہلا یا۔
 راجپوت عموماً وہ غیر آریا اقوام ہیں کہ جو ہندوستان میں باہر سے فاتحانہ انداز
 میں آئے لہذا یہاں ان کی حکومت بنی پھرتی نسل قریب قریب ختم ہو گئی

زور بہنوں نے اپنا دینی اقتدار اور دنیوی مفاد برقرار رکھنے کے لیے ان اقوام کو تشدد کیا اور راجپوت ایک لڑائی ہو جاتی، بنا دی۔ ان میں سے گنی کڈ، کے راجپوت مشہور ہیں، انہی کی مدد سے برہمنوں نے بدھ اور جین مت کو نیچا دکھایا اور مسلمانوں سے انہی کا مقابلہ ہوتا رہا۔

ابوالفتح داؤد بن نصر قرمطی قرامطہ کا مختصر حال ہم بیان کر چکے ہیں۔ ملتان محمد بن قاسم نے اموی خلیفہ

عبدالملک کے عہد میں مسخر کیا۔ یہاں مسلمانوں کی آمدورفت انہی ایام میں شروع ہو گئی تھی۔ لیکن جب اموی حکومت ایشیا میں ختم ہو گئی تو جانشین عباسی خلافت کا تعلق بھی ملتان سے منقطع ہو گیا۔ ابو قاسم کے داعیان نے ملتان کو اپنا مرکزی مقام دعوت بنایا۔ لہذا اس جگہ اپنی حکومت قائم کر لی۔ حکم ملتان سبکتگین کے وقت سے ابو الفتح داؤد بن نصر قرمطی تھا۔ فقہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ کس لئے سلطان محمود ان کا قلع فتح کرنا چاہتا تھا۔ سیدھا اور صاف راستہ ملتان کی طرف پنجاب سے گزرتا مگر انڈیا پال نے سلطانی فوج کو گزرنے کی اجازت نہ دی تو اول سلطان کو اسی سے نپٹنا پڑا۔

انڈیا پال کو شکرت ہوئی تو راستہ صاف ہو گیا، سلطان نے ملتان محاصرہ میں لے لیا تو چند روز بعد ابو الفتح نے ہتھیار رکھ دیے۔ اسے قید کر کے غزنی بھیج دیا اور قرمطیوں کو جو بھی ملا نہ تیغ بدریغ کیا۔ اس قتل عام میں سلطان خود بھی شریک تھا۔ جو بچا کشمیر میں پناہ گزین ہوا یا ادھر ادھر جہاں بیگ سامنے رو پو ش ہو گیا۔

مگر جب سلطان نے اپنی مملکت کے طفل و عرص میں فرمان جاری کر دیا کہ قرمطی جہاں ملے مارا جائے مگر یہ لوگ جانتے تھے کہ کس طرح زندہ

یہی رہ سکتے ہیں اور اپنا کام بھی کر سکتے ہیں۔

سومناکھا ہم بیان کر چکے ہیں کہ انڈیا میں بھائی نے راجگان اور
 وغیرہ سے امداد طلب کی اور ان کی متحدہ فوج نے

سلطان کا مقابلہ کیا۔ چونکہ وہ خود ہی دعوت جنگ دے چکے تھے اور

یہ سلطان جب پنجاب کی جہات سے فارغ ہوا تو ان کی طرف توجہ کی

ان جنگوں کے حالات بیان کرنا ہمارا مقصود نہیں، مختصر یہ کہ تھانیر اور

متبر اور قنوج اور گوالیار اور کالنجر غرض تمام مقامات ایک ایک کر کے

سلطان نے مسخر کر لیے، چونکہ سلطان کی توجہ کا مرکز ہمیشہ کوئی نہ کوئی

ہندو "تیرتھ" ہی رہا اور کسی دیوتانے اپنے پوجاریوں کی مدد نہ کی

اس لیے شیو مت کے پوجاری اپنا تفوق بھاننے کے لیے کہتے کہ شیو جی

ہمارا ج ان سب دیوتاؤں سے ناراض تھے اس لیے تو پیچھے اور اکثر

غالب آئے اور ان دیوتاؤں کے پوجاری مغلوب ہو گئے۔

ہندوستان میں سب سے بڑا مندر کا ٹھکانا دارا گجرات میں سومناکھا

تھانیر سومناکھا کے معنی چاند ہیں۔ ہفتہ میں ایک دن "سوم وار" (

MONDAY) میں بھی یہی لفظ ہے، روایت ہے کہ چند دیوتا

کچھ بے اعتدالی ایک رشی کی زوہر محترمہ کے ساتھ ہوئی۔ اس گناہ کبیرہ کی

پاداش میں وہ عذاب کے متن میں آیا اور اس سے نجات حاصل کرنے

کے لیے اس نے شیو جی کی پوجا شروع کی۔ شیو جی کی مورتی "لنگا" ہے

یہ مورتی اس نے سمندر کے کنارہ نصب کی۔ سمندر کے پانی کے آثار اور

پڑھاؤ کا تعلق چاند کی کشش سے وابستہ ہے، لوگوں کے ذہن لٹین

عقیدہ کیا گیا کہ چند دیوتا شیوجی کی خدمت میں لگا ہوا ہے اور اس کی مورتی کے اشتنان کی خدمت اس کے ذمہ ہے، یہ وہ مقام ہے جہاں سومنا تھہ (آٹھ ماہ) کا مندر تعمیر ہوا۔ علاوہ ازیں شیوجی کے بارہ میں اودھویات بھی مشہور ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ شیوجی کوہ ہمالیہ میں رہائش رکھتے ہیں۔ لوگ گنگا دیوی آپ کے سر سے نکلی۔ اس لیے سومنا تھہ کی مورتی کو روزانہ اشتنان کے لیے دریا گنگا کے پانی کی بھی ضرورت تھی۔ اس کا انتظام یہ کیا گیا تھا دریا کا پانی غسل کے لیے روزانہ یہاں پہنچ جاتا۔

بعض حضرات کی جدت طبع کی داد دینی چاہئے کہ مکہ والوں کی دیوی "مات" کو مشابہت لفظی کی وجہ سے بھی "سومنا تھہ" تصور کیا ہے۔ مجھے ان افہام کی اصلیت دریافت کرنے کے لیے یونانی اور مصری اودھویات (MYTHOLOGY) کا مطالعہ بہ نظر غائر کرنا پڑا۔ یہ ایک مستقل موضوع ہے اور میں نے اس پر طبعیہ بحث کی ہے۔ اس مقام پر اتنا واضح کرنا کافی ہوگا کہ کعبۃ اللہ حضرت ابراہیم اور آپ کے پہلوئے حضرت اسماعیل کا تیار کردہ ہے۔ اور یہ معبد پہلا گھر ہے جو اہل توحید کی عبادت گاہ قرار پایا۔ اور اس کی تعمیر کا مقصد جیسا کہ قرآن میں واضح کیا گیا ہے۔ ذات ابراہیم کو اہنام پرستی سے دور رکھنا تھا۔ یہ "دادی غیر ذی ندرع" ہے حضرت ابراہیم کی رہائش مستقل شام میں تھی جسے توراہ میں "دنئی جنت" کہا گیا ہے۔ لیکن شام میں بت پرستی کا بازار گرم تھا۔ اور اسی اہنام پرستی سے بیزاری کی وجہ سے حضرت ابراہیم نے عراق سے ہجرت کی تھی۔ آپ کی بالغ نظری کا یہ تقاضا تھا کہ اس ویرانہ میں یہ معبد تعمیر کیا

اہل مکہ عرصہ تک بت دیت پرستی سے واقف نہ تھے، لیکن وادی خیر ذی
 ندرع کے رہنے والوں کا ذریعہ معاش تجارت تھا۔ شام اور مصر اور یمن
 میں ان کے تجارتی قافلوں کی آمدورفت جاری رہی، شام میں وہ لوگوں کو
 آسودہ حال دیکھتے تو دیر عداوت کرتے۔ وہ کہتے کہ سب کچھ ان دیوتاؤں
 کے صدقے مل رہا ہے اور یہ برکت اور فراخالی جو تم دیکھ رہے ہو
 اسی مولیٰ پوجا کا اثر ہے۔ یہ خود تو بت تراش نہ تھے ان سے خرید کر
 لائے جو ان کے خاندانی بت کی حیثیت سے ان کے گھروں میں رہتے۔
 لیکن ان میں سے اگر کوئی زیادہ آسودہ حال ہو جاتا تو اس کا خاندانی
 بت قبائلی، صم، بن جانا۔ ارض مجاز میں چند ہی گنتی کے بت تھے جن کو
 قبائلی حیثیت حاصل ہوئی۔ ان کا کوئی قومی بت نہ تھا۔ اور تمام بت ان کے
 خرید کردہ تھے۔ ان میں سے بھل کی روایات بہت کچھ یونانی دیوتا آپولو
 سے ملتی جلتی ہیں اور یقیناً بھل اسی کا معرب ہے۔ لات
 یونانی دیوی، لیٹو (LETO) ہے جو آپولو کی والدہ ہے۔

”شیو“ کا مذکور ویدوں میں نہیں اور نہ آریا ہندو ویدوں کے زمانہ
 میں اس دیوتا سے واقف تھے۔ آثار قدیمہ جو ”موہن جدارو“ واقع وادی
 سندھ سے برآمد ہوئے ہیں ان میں سے شیو کی صورتی بھی ہے، اس
 لیے یہ تسلیم کرنا چاہئے کہ پنجاب (برہمادرت) میں آریوں کے داخلہ سے
 پیشتر یہاں کے باشندوں میں شیو پوجا رائج تھی۔ لیکن دیاور قوم جو وادی
 سندھ میں حکمران تھی۔ اس کی اصلیت کا سراغ مصر اور شام اور عراق میں
 ملتا ہے۔ ہم نے اپنی کتاب تاریخ پنجاب میں اس موضوع پر مفصل بحث
 کی ہے۔ بلکہ ہندوستان کا مشہور خاندان اپتنا صل میں مصری قبیلہ ہے۔

اس لیے ہمیں شیو پوجا کا سراغ شام اور مصری میں تلاش کرنا چاہیے۔ مورخ
ہیرڈوٹس اور دیگر مورخین یونان یونانی دیوتا "بکیس یا ڈائی ٹوسی ایس"
کے وہی حالات بیان کرتے ہیں جو "شیو" کی روایات میں پائے جاتے ہیں۔
لیکن "بکیس کو بھی وہ عظمت ہومر کی نظموں میں حاصل نہیں جو بعد میں اس
کے پوجاریوں نے اسے دی، ہومر اور ویدوں کے مندروں کا زمانہ قریب تر
ہے، اس یونانی دیوتا کی نسبت یہ روایت ہے کہ عالم وحشت میں یہ
مصر اور شام اور ایران میں گیا اور ہندوستان میں کئی سال رہا۔ اس کی
مورتی بھی لنگا ہے۔ حقیقت یہ ہے یونانیوں نے یہ خاص پوجا مصریوں
ہی سے سیکھی، ہیرڈوٹس مصر کے حالات بیان کرتے ہوئے ایک
خاص تیوہار کا ذکر کرتا ہے جو بالکل ہندوستان کے تیوہار "ھولی"
کے مشابہ ہے۔ لوگ کشتیوں میں دریائے نیل پر سے گزرتے ہوئے
جب کسی بستی کے قریب آتے تو زن و مرد پہلے ہی ان کے منتظر
ہوتے، طرفین نشہ میں پور پہلے ہی بھر کر ایک دوسرے کو مغلطات
جو بھی ان کی لغت میں تھے سنا تے پھر اہل کشتی کنارہ پر اتر آتے اور ننگے
ناپتے، جس میں کنارہ کے لوگ بھی اس رقص عریاں میں حصہ لیتے۔
"شیو جی" کی خاص سواری کا بیل "ندی" مصریوں کا بقرہ ہے
جس کی پوجا مصر میں عام تھی، مصری دیوتا "اوسیرس" کو جو اس کے
بھائی "شیط" نے قتل کیا تو دیوتا کی زوجہ "آئی س" نے شام کے کنارہ
پر اپنے مقتول خاوند کی لاش پائی۔ اس کے ہر ایک عضو کو ایک خاص
جانور کی مورتی میں رکھا اور عضو خاص کو بیل کی صورت دی اور خود گائے
کا روپ دھارا، مصر میں گائے بیل کی پوجا ایسی ہی تھی جیسا کہ آج بھی ہندوستان

میں قدیم الایام سے چلی آتی ہے، یہ اشارات نجم و تقسیم کے لیے کافی ہیں۔
 کسی وقت ہندوستان میں شیو پوجا اتنی عام تھی کہ آخر میں اس
 نے "عام مارگ" کی صورت اختیار کی انتہائی بے حیائی کی کوئی صورت
 ایسی نہیں ہو اس کے پوجاریوں کے عقاید کے مطابق اعلیٰ ثواب نہ ہو۔
 آج بھی اس کی پوجا عام ہے۔ عوام کا کیا مذکور ہے۔ مشہور کانگریسی لیڈر
 بال گنگا دہرتک "جنٹو" سے ایک لنگا باندھ کر ہر وقت اپنے جسم
 کے ساتھ رکھتا۔ اس کے پوجاریوں نے "شیو پوجا" کے دقائق اور حقائق
 بیان کرتے ہوئے وہ وہ فلسفیانہ موٹنگا فیاں کی ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا
 ہے کہ یہی ایک دیوتا قابل پرستش ہے باقی اس کے سامنے ہیچ ہیں۔
 مودھین نے سونما تھ کے مندر کے بارہ میں بہت کچھ لکھا ہے۔ دس
 ہزار دیہات کی آمدنی اس کے لیے وقف تھی۔ ایک ہزار برہمن مندر میں
 شب و روز اس کے گن گاتے تین سو موسیقی دان اور قاصد عورتیں اس
 کے حضور میں گانے بجانے میں مصروف رہتی، تین سو خدمت گار
 زائرین کے آرام و آسائش پر مامور تھے، راجے اپنی لڑکیاں بھی مندر یا مندر
 کے پوجاریوں کی خدمت کے لیے دان کرتے۔ اس مندر کی دولت کا
 اندازہ نہیں ہو سکتا تھا۔ زرد بواہرات کا انبار تہ خانوں میں لگا ہوا تھا۔
 مندر سمندر کے کنارہ پر واقع تھا۔ بحر کا پانی اس کی بلند دیواروں سے
 ٹکراتا۔ عمارت سادہ قلعہ نما تھی۔ سقف کو چھپن ستون سہارا دیتے تھے
 کہتے ہیں کہ ستونوں کی نگری افریقہ سے وہ آمد کی گئی تھی۔ مندر اہرام
 مصر کے نمونہ پر تعمیر کیا گیا تھا۔ ہندوستان کے نام مندر مصری اہرام کی طرح
 مخروطی شکل کے ہیں۔ کلاس سونے کا تھا۔ آفتاب کی کرنیں اس پر پڑتی تو

میلوں تک ایک شطہ نظر آتا تھا۔ جس کی چمک آنکھوں میں خیرگی پیدا
لتی تھی۔

ان ایام میں غزنی سے سو مہینے تک سلطان محمود کی یورش بجائے
خود ایک حیرت انگیز کارنامہ ہے جس کی نسبت کہیں لکھا ہے کہ "طینی پال"
کی یلغار کوہ پریمیز پر پہنچا ہے اس راستہ میں جو مقامات فلان سے
سو مہینے تک پڑے تو ہمسفر شاعر فرحی اپنے قصیدہ میں اس طرح بیان
کرتا ہے۔

سلطان کے راستہ میں جو بھی بلند دیواریں
قلعوں کو احاطہ ڈالے تھیں مسمار اور
بنیاد سے اکیر کر رکھ دیں۔

سب سے پہلے "لا در" کا قلعہ تھا
جس کے برج اور مورچے سے لوہا اور
سنگ مرمر لکڑیاں ہوتے نیچے اس
طرح گر رہے تھے جیسے پہاڑوں سے پتھر
تھیل لگے اور قلعہ دونوں مضبوط اور
اب قلعہ شیراز کی طرح گرج رہے تھے،
لڑاکے باہی دست بدست اور پشت
پشت ایک دوسرے کی مدد کے لیے
صاف آتا تھے نقل و حرکت میں
رفتار و جی مگر کارزار میں تیز
تھے۔

بہاں راہ اندر چنناں سھار ہائے بزرگ
خراب کرد و بکند اصل ہر بیک ازین ویر

نخست "لاوردہ" کردوئی برج و بارہ اور
چو کوہ کوہ فرود بخت آسن و مرمر

سھار لو قوی و بارہ سھار قوی
سھاریاں ہمر برماں شیر شرزہ ز
مبارزانی ہمدست و لشکی ہم پشت
و ننگ پیشہ بغزو شتاب کار یگر

چو "چکودر" کہ صد و تہائی گوہر یافت
بکہ پایہ آن شہریار شیر شک

چکوٹہ کو ہے چونانکہ از بلندی او
سارگان را تو گوی فرو دارست سفر

چو نہر والہ کہ اندر دیار ہند بہیم
بہ نہر والہ ہی کرد بہر شاہ مہتر

دو لیت پیل و کما بیش صد ہزار سوار
نو ہزار پیادہ مبارز و صمد

ہمیشہ رائے بہیم اندر مقیم و نعیم
نشہ امین و دل پر نشاط و تازہ دتر

چو مندھیر کہ مندھیر جو صغی بود
چنانکہ خریا شدے اندر و در چشم نگر

در سر مقام "چکودر" راستہ میں آیا کہ
یہاں جو اہرات سے بھرے ہوئے

صندوق شیر شکار سلطان نے اس

پہاڑی کے دامن میں پائے

اس پہاڑ کی بلندی کا منظر میں کیا

بتاؤں تو دیکھ کر کہے گا کہ آسمانی ستارے

اس کے نیچے قرار پائے ہوئے ہیں

اس دچکودر کے آگے نہر والہ تھا

اس کا راجہ بہیم دیگر راجگان ہند

پر اس کی وجہ سے فخر کرتا تھا۔

اس کی عظمت و شان کو ہند میں کوئی

شہر لور راجہ نہ پہنچ سکا۔

نہر والہ راجہ بہیم کے پاس دو سو ہزار

لہہ ایک لاکھ سوار کم و بیش اور نو

ہزار پیدل فوج ہر ایک سپاہی جنگجو

اور صف شکن تھا۔

رائے بہیم نہر والہ میں داد عشرت دے

رہا تھا اور خوش و خرم امن کی زندگی

مزنے سے بیٹھا بسر کرتا۔

درائے کو نیچا دکھانے کے بعد سلطان

مندھیر کی طرف بڑھا، یہ ایک حوض کا

مندھیر کی طرف بڑھا، یہ ایک حوض کا

عام ہے جسے دیکھ دیکھ کر انہیں
خیرہ ہوئی جاتی تھیں۔

اس تالاب کی نسبت کیا کہوں جہاں
تک غور کرتا ہوں اتنا ہی اس کی
اصلی صفت جس کا یہ مستحق ہے بیان
نہیں کر سکتا۔

یہ اتنا کثودہ تھا کہ کاریگروں نے
اپنے فن کا کمال یہ دکھایا تھا کہ ہزار
بتخانہ اس کے اندر تعمیر کیا ہوا تھا۔
داس کی تعمیر کے بعد سلطان ایلول دائرہ
پر بڑھا جو سفید دیو کی طرح راستہ میں
سراٹھائے ہوئے منظر آتا تھا۔

اس کے ایک کنارہ پر مضبوط قلعہ
لود شہر تھا اور شہر میں بت پرستوں
کا جم غفیر جمع تھا۔

لڑائی میں کشت و خون اور بت خانوں
کو آگ لگا کر خاک کے برابر کر دیا جیسا
کہ داس لود تھا نیسکی لڑائیوں میں
بت خانوں کا حال ہوا تھا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زرخئی اس مہم میں سلطانی فوج کے ساتھ تھا
وہ ان مقامات کے حالات چھٹم وید بیان کرتا ہے۔ ملتان لود سونتا کے

چگونہ سوئی چنانکہ ہرچہ اندیشم
لمی توام گفتن سفاکش اندر غور

زرخ پینا سوئی بعد ہزار عمل
ہزار بت کدہ خرد کردہ سوئی اند

وگر سو دیو لوارہ کہ ہم سو دیو سفید
بید بود برا فرشته میاں گدر

یہ صحار قوی بر کراں و شہر درد
زبت پرستاں گرو آمدہ یکے محشر

بکشف مردم دبت خانہا بکد و سوخت
چنانکہ بتکدہ دارنی و تھا عیسر

درمیانی راستہ میں وہ پانچ مقامات کا بالخصوص ذکر کرتا ہے۔ گودہرو
 جیلپیر کے شمال کی مغربی جانب دس میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ سلطان
 محمود نے حملہ کے وقت بھائی یا دوراہر راج کرنا تھا۔ پالن پور کے شمال
 میں سترہ میل کے فاصلہ پر "چکودور" واقع ہے۔ جسے آج "پٹن" کہتے
 ہیں نہروالہ سے موسوم تھا۔ یہ احاطہ بھٹی کے ضلع احمد آباد میں واقع
 ہے۔ پٹن سے اٹھارہ میل جنوب "مندھیر" ہے۔ اس شہر کے
 اب کنڈرہ کی باقی ہیں اور اس کے آثار سے اتنا پتہ چلتا ہے کہ کسی وقت
 بارونق و ضلع شہر تھا۔ یہاں ایک بہت بڑا تالاب بھی ہے اس کے اندر
 وہ بت خانے چھوٹے بڑے تھے جس کا ذکر فری کرنا ہے موجودہ دل ولہ
 کی اصل "دیول واڑہ" ہے۔ "ادنا" اور جزیرہ "دیو" کے درمیان سونا تھا
 چالیس میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔

سلطان محمد اول ذوالقعد ۱۰۲۱ھ کے دن سونا تھ کے سامنے نمودار
 ہوا۔ قلعہ نما مندر کی دیواروں پر اہل قلعہ یا مندر کے محافظ اس طرح کھڑے
 دیکھ رہے تھے گویا یہ ایک تماشہ ہے، قلعہ کی نگین دیواریں مندر
 کے کنارہ پر دھار کے ساتھ مہراٹھائے ہوئے تھیں۔ سلطان کی یورش
 کا علم گرد و گواہ کے راجگان کو بھی ہو چکا تھا اس لیے اپنی اپنی سپاہ کے
 ساتھ مندر کی حفاظت کے لیے جمع ہو چکے تھے اگرچہ پوجاری کہہ رہے
 تھے کہ "سو ایشور" لیچوں کو اس جگہ لایا ہے کہ آج تک جتنے مندروں
 پر حملہ کیا اور دیوتاؤں کی مورتیوں کی بے حرمتی کی اس کو مجموعی سزا دی جائے
 مگر قلعہ دار بھی چھوڑ چکا تھا۔ چلکے سے ایک جزیرہ میں پناہ گزین ہو
 اور سلطان کی فوج تک یہاں نہ آیا۔ مگر گور راجے اور ان کی سپاہ

سلطان محمود کی لشکر کشی کے حالات بیان کرنا ہمارا مقصد نہ تھا۔ ہم نے چند سوراخوں کا ذکر کیا ہے تاکہ یہ تذکرہ اس عنوان کے تحت خالی نہ رہے۔ ہم نے شاہیر اسلام میں سے چند شخصیتوں کا انتخاب کیا ہے اور یہ ایسی ہستیاں ہیں جنہوں نے کچھ کام کر کے دکھایا۔ اور عالم انسانی کی ذہنی اور مادی ترقی کو تقویت دی یا انقلاب پیدا کیا۔ ان میں سے سلطان محمود ایک ہے۔ یہ کہنا کچھ مبالغہ نہیں اور بے جا بھی نہیں کہ ہندوستان میں دس کروڑ نفوس مسلمان نہ ہوتے اگر سلطان اشاعت اسلام کے لیے راستہ صاف نہ کرتا۔ اگر سلاطین اسلام جو سلطان کے بعد آئے سلطان کے دل و دماغ کے ادھی ہوتے تو جس طرح افغانستان اور وادی سندھ اور بلوچستان میں خالص مسلم آبادی ہے اسی طرح ہندوستان میں بھی بہت تھوڑے عرصہ میں منظر آتی۔ اور اگر یہ نہ بھی ہوتا تو پنجاب کی طرح اکثریت ضرور ہوتی۔ حقیقت یہ ہے کہ بعد میں جو بھی سلاطین ہونے بالخصوص شاہان خاندان مغلیہ ان کے دربار میں نہ صرف اشاعت اسلام رک گئی بلکہ اس میں ضعف بھی آیا۔ ہندوستان میں پنجاب پہلا ملک ہے جس کو سلطان نے اپنی مملکت میں شامل کیا۔ ہم بیان کر آئے کہ ہندو کیوں اسلام قبول کرتے گئے مسدہ چھوٹے نے ان کو بخود بخود اسلام کے انخوش میں ڈال دیا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ زیادہ تر آریا ہند نہ تھے اکثر وہ تو میں تھیں جو ہندوستان میں فاتحانہ انداز سے زمانہ نامعلوم سے داخل ہوئی رہیں۔ ان میں مصری اور شاہی اور عراقی اور ایرانی اور تورانی اور مثل اور ترک بھی تھے۔ مگر برہمن کے زیر اثر اچھے تھے۔ برہمنوں نے ان کو کبھی نہ برہمن اور نہ پھرتی اور نہ ویش میں جگہ دی اور

تہ اپنی کسی اُریائی ذات میں شامل کیا۔ البتہ ان کی ایک نئی جاتی، راجپوت
 اختراع کی، تیسری دیر یہ ہے کہ پنجاب میں بدھ مت کا زیادہ زور رہا
 ہے۔ ان کے مذہب کا اصل اصول، اہمنا پر مودھرا ہے، یعنی کسی
 کو آزار نہ دینا ہی اعلیٰ دھرم ہے۔ چنانچہ خلافت امویہ کے تختِ جب
 مسلمان وادی سندھ اور ترکستان کی طرف بڑھے تو ان لوگوں نے کہیں
 مقابلہ نہیں کیا۔ برہمن ان کو پہلے ہی ہندو دھرم سے خارج کر چکا تھا۔
 بلکہ اپنی غیر اُریا راجپوتوں کی مدد سے ہندوستان میں ان کا قلع قمع
 بھی کر چکا تھا۔ اسلام کی مہر پرستی ان کے لیے نعمتِ غیر مترقبہ تھی۔ اس
 لیے بعض انگریز مورخین کا یہ الزام کہ ہندوستان میں اسلام بزمِ شمشیر پھیلایا
 گیا محض ایک سیاسی مقصد کی تکمیل کے لیے تراشا گیا۔ دیں ایک ایسی
 شے ہے کہ کبھی بزورِ شمشیر نہیں پھیل سکتا۔ اور ویسے بھی اصولاً جنہری
 ایمان و عمل اللہ کے ہاں مقبول نہیں۔ سلطان محمود پر یہ الزام کہ وہ محض
 سرکش راجوں اور راجپوتوں کو بزورِ شمشیر اسلام کا غلام بنانا چاہتا تھا۔
 غلط ہے۔

دوسرا الزام سلطان پر بخل کا ہے، فرشتہ اپنی ناسخ
 میں سلطان محمود کے تذکرہ کے ضمن میں لکھتا ہے

کہ یہ الزام بالکل بے بنیاد ہے۔ اس سلطان والا شان سے بخل
 کو منسوب کرنا عزیزاں دوزگار کی بے انصافی ہے۔ بلاشبہ وہ زرد
 تھا اور خزانہ بھی اس کے پاس جمع رہا تھا لیکن فتحِ بلاد میں دل کھول
 کر خرچ کرتا، کتابِ مقالات ابونصر مشکائی اور مجلدات ابوالفضل کی متفقہ
 شہادت ہے کہ اس قدر علماء و فضلاء اور سپاہِ (مجاہدین) اس کے

دربار میں بھیج ہوتے تھے اور اس کے سونے جو اور مادہ احسان سے
 بہرہ مند ہوتے کہ ایسے عمائد کسی اور بادشاہ کو کم نصیب ہوئے اور
 نہ ہوں گے، اہل نظر سمجھ سکتے ہیں کہ یہ امر بدوں درم و دینار میں نہیں
 ہوتا۔ اہل حیثیت اور وضعداروں کو دوست رکھتا اور مورد العاف فرماتا۔
 العاف کے علاوہ وظائف سالانہ بھی مقرر کیے ہوتے تھے، حد پیزیں
 سلطان کے بخل کی تشہیر کا موجب ہوئیں۔ ایک قصہ فردوسی کا اور
 دوسرے تو انگریزوں سے لے سبب زر بزور لینا۔ فرشتے نے ان
 دونوں باتوں کی تردید نہیں کی۔ اس لیے اس کے زمانہ تک بلکہ
 ہمارے زمانہ تک جو بھی قصے سلطان بلکہ دشمنان دین نے گھڑے
 اور ان کو منظم و نثر میں شہرت دی تاریخی واقعات کی حیثیت اختیار
 کر چکے تھے، ہم ایک تاریخی واقعہ قرمطیوں کا بیان کر چکے ہیں کہ ان
 کے ظلم و ستم اور قتل و غارت سے دنیا اسلام میں اس حد تک ہیجان
 پیدا کر دیا تھا کہ سوز و خفا بنو فاطمہ جن کے یہ داعی تھے ہیج اٹھے
 بلکہ ایک خلیفہ نے تو یہ اعلان بھی کر دیا تھا کہ قرمطی جہاں ملے مارا
 جائے۔ یہی کام سلطان محمود نے کیا، ملتان میں قرمطیوں کے سونے
 سے ہاتھ اس حد تک رہ گئے کہ لڑائی کے بعد قبضہ شمشیر ہاتھ سے
 جلانہ ہوتا تھا۔ پانی گرم کر کے سونے بار بار دھویا گیا تب ہاتھوں
 کی نسین نرم پڑیں۔ سلطان نے بھی یہی اعلان کر دیا تھا۔
 کہ قرمطی جہاں بھی ملے مارا جائے اور جس حال میں
 ملے مارا جائے۔ سلطان کی زندگی تو یہ لوگ دبے

رہے۔ لیکن جب سلطنت غزنویہ کو زوال آگیا۔ تو ان لوگوں نے سلطان
 کے متعلق افسانے گھڑنے شروع کیے۔ یہ حقیقت بھی دل نشین کرنی چاہیے
 کہ بنو ناطر اسماعیلیہ اور شیعیان علی اثنا عشریہ کے عقاید دربارہ استحقاق خلافت
 ایک ہی ہیں۔ وہ یہ ہے کہ خلافت کا حق بنو ناطر کا ہے، چونکہ سلطان
 محمود سی تھا اس لیے دونوں فرقوں کے نزدیک اس کی حیثیت ایک جیسی تھی۔
 ایک قریبی سلطان کے بھائی کی جو کرتا ہے کہ

تبودش ز فضل و سخاوت شرف نگہ داشتے قد بانِ صدف

خزائن بے داشت پر از گہر دلے ناں شد منے بہرہ مد

فردوسی کے متعلق یہ احسانہ مشہور ہے کہ سلطان نے خود اس کو
 "شاہنامہ" کی تصنیف پر مامور کیا اور وعدہ یہ تھا کہ فی شعر ایک اشرفی دوں گا
 بے چارہ شاعر تیس برس شاہنامہ لکھتے لکھتے بوڑھا ہو گیا جب کتاب پائیگیل
 کو پہنچی تو وعدہ سے پھر گیا اور اشرفی کی جگہ ایک روپیہ فی شعر دینے لگا۔
 فردوسی نے یہ صلہ ٹھکرا دیا۔ شاہنامہ کے اشعار کل ساٹھ ہزار ہیں، ساٹھ
 ہزار روپیہ فردوسی کی نظروں میں نہ بچا، ایک انگریز مورخ لکھتا ہے کہ
 "ٹنسن نے دو مجلدات میں "پیرا ڈائس نوٹس اور ریگینڈہ کبھی اس رقم
 سے نصیب لینے پر رضامند تھا۔ سلطان کی وفات ۲۳ ربیع الثانی ۲۲ اپریل
 ۱۱۱۷ء میں واقع ہوئی، مدت سلطنت بتیس برس تھی، اگر فردوسی شاہنامہ
 تیس برس تک لکھا رہا تو ظاہر ہے کہ سلطان کی تخت نشینی کو پانچ برس
 گزرے تھے کہ شاہنامہ کی فرمائش کی، حالانکہ پہلے پانچ سال تو اس کو
 آہائی مملکت کے اندرونی غرضتوں سے فرصت نہ ملی۔ اور اس کی شہرت
 ابھی غزنی کے پہاڑوں سے باہر دور تک نہ پھیلی تھی۔ مورخین نے سلطان محمود

کے درباری شاعروں میں جہاں ملک الشعراء حکیم عنصری اور منوچہر بلخی،
غفاری رازی اور عسجدی مروی اور فرخی کا نام بنام ذکر کیا ہے، فردوسی
بلکہ اس کے استاد اموی طوسی کو درباری شعرا میں شمار نہیں کیا۔ اموی اور
فرخی دونوں عنصری کے شاگرد تھے،

تاریخ ادب شاہنامہ کی فاضلی شہادت سے ثابت ہوتا ہے کہ فردوسی
کے استاد اموی طوسی کے چار ہزار ابیات اور وقیفی کے ایک ہزار ابیات
شاہنامہ میں شامل ہیں۔ اس موضوع پر میرا ایک مقالہ ماہنامہ ایٹیا (انترسرا)
میں زیر ادارت حکیم محمد فیروز الدین طغرائی ۱۹۰۵ء میں شائع ہوا۔ دوبارہ
میری مقالہ ماہنامہ تہذیب الاخلاق (مطبع وکیل انترسرا) زیر ادارت مولوی
عبداللہ نعمانی ۱۹۰۹ء میں اور پھر کتابی صورت میں زیر عنوان مشاہیر اسلام
۱۳۳۶ء میں شائع ہوا۔ میرے ایک جمعہ نے میری تحقیق کو اپنایا اور
اپنے نام پر شہرت دی، خلا بختے فوت ہو چکا ہے۔ اس مقالہ کا اقتباس
ہم ذیل میں درج کرتے ہیں، یہ قطعی داخلی شہادت شاہنامہ کی ہے۔
فردوسی کی زبانی سنئے کہ وہ شاہنامہ کی تصنیف کے بارہ میں کیا کہتا ہے۔
فردوسی کہتا ہے کہ

من امین نامہ فرخ گو فرم بہ قال
تہ دیدم ہر فر از بختہ شنہ
بھی رنج بر دم بہ بسیار سال
بگاہ کیاں برد خشنہ

فردوسی جب کئی سالوں کی کاوش کے بعد نثر شاہنامہ لکھ چکا تو اس نے
دیکھا کہ شاہان ایران کے تحت کیانی خاندان کے تحت کا کوئی وارث نظر نہیں
آتا، شاہنامہ میں اپنی شاہان ایران کا تذکرہ ہے، اور اگر ان کی نسل میں
سے کوئی وارث تحت و تاج ہوتا تو فردوسی کو اس کی محنت اور حسن عقیدت

کا صلہ خاطر خواہ ملتا روایت تو یہ ہے کہ فردوسی تیس سال کے طویل عرصہ تک شاہنامہ لکھتا رہا۔ مگر وہ خود کہتا ہے کہ

سخن مانگہا شتم سال بیست بدلاں تا سزا فارا میں گنج کیت

اس شعر کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ میں شاہنامہ ختم کر چکا تھا تو بیس سال تک اس تلاش میں رہا کہ اس گنج شاہگاہ کا خریدار کون ہو سکتا ہے، تخت کیاں تو خالی نظر آیا۔ اس لئے کسی اور قدر داں جو ہر شناس کی جستجو کی، دوسرا مطلب یہ ہے کہ بیس سال تک لکھتا رہا،

ایک اور مقام پر کہتا ہے کہ

بہیں گفتم این نامہ را چند گاہ مہاں بند کیواں و خد شیبواہ

فردوسی شاہنامہ مسلسل بیس یا تیس سال تک نہیں لکھتا رہا۔ دینیوی کام لکھ بھی تھے، کبھی کبھی جب فرصت ملی لکھتا رہا۔ اگر شاہنامہ کے ایبات آٹھ ہزار شعر ہوں تو تیس سال کے عرصہ میں روزانہ پانچ ایبات ہوتے ہیں۔ ایبات وہ بھی ٹھنوی میں جس کے منامین سپدے بھی قصص کی صورت میں مشہور تھے اور پانچ یا آٹھ روزانہ لکھنا کون سی بڑی بات ہے فردوسی بہت پایہ کا شاعر ہے۔ اس کو پیغمبر سخن کہتے ہیں۔

سہ کس بہ سخن پیغمبر انشد بہر چہند کہ لانی بعدی

ایباب و قصیدہ و غزل را فردوسی و الوری و سلمی

فردوسی کے نادان دوستوں نے ایک ایسا اختراع کیا ہے جس میں ذرا بھی معقولیت نہیں اور اس کو اہلی پایہ سے گرا دیا ہے۔ وہ ایک کرایہ کا ٹھورہ جاتا ہے کہ انعام و اکرام کی طمع پر روزانہ پانچ یا آٹھ ایبات انتہائی ذہنی کاوش کے بعد تیس سال تک لکھتا رہا۔ یعنی اس میں آمد و

ہی ہے آمد نہیں۔ ان ایبات سے واضح ہوتا ہے کہ جو کچھ اس نے
 لکھا، تقاضائے طبیعت ہی لکھا اور زمین و آسماں میں کوئی نہیں جانتا
 تھا کہ وہ کس فعل میں لگا ہوا۔ اگر سلطان کی فرمائش پر لکھتا تو کم از کم اس
 کے ہم عصر شعرا کو معلوم ہوتا۔ خاتم شاہنامہ پر فردوسی کہتا ہے کہ سے
 ہجرت شدہ ہنخ ہشا و بار کہ گفتم من این نامہ شاہوار۔

یعنی شاہنامہ میں نے شاہنامہ لکھ کر ختم کیا۔ اگر بیس سال میں لکھا
 تو اس کا آغاز ۲۸۳ھ میں ہوتا ہے سلطان محمود کے والد امیر تامر الدین
 سلجوقی کا انتقال ماہ شعبان ۲۸۳ھ میں ہوا۔ ظاہر ہے کہ سلطان
 کی تخت نشینی ۲۸۴ھ یعنی اٹھارہ سال پہلے شاہنامہ لکھ چکا تھا۔
 ایک سال تو سلطان کو اپنے بھائی اسماعیل سے تنازعہ وراثت میں
 گزارا۔ دو مہینے سال اور اندرونی غرضوں نے فرصت نہ دی۔ غرض بیس
 سال کا عرصہ رہا جاتا ہے اور بیس سال ہی میں فردوسی شاہنامہ لکھ کر
 ختم کر چکا تھا۔ یہ حساب تو ہم نے بہ تعلق تخت نشینی سلطان محمود لگایا ہے
 بیس سال ہی فرض کر لو۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ تخت نشینی سے بہت
 عرصہ پیشتر شاہنامہ لکھ چکا تھا۔ مگر سخن را نگہداشت تا سال بسیت و
 وہ بیس سال اس تلاش میں رہا کہ یہ نامہ شاہوار کہاں اور کس
 قدر حال کے حضور پیش کرے۔

جب سلطان محمود کی شہرت کیخبر ایران و توران و ہندوستان کے
 شمالی بلاد کی وجہ سے دنیا و اسلام میں پھیل گئی اور عباسی خلیفہ نے اس کو
 "یمین الدولہ امین اللہ" کے لقب سے افتخار بخشا تو شعرا و عہدہ بھی اس
 کے دربار کی طرف کھینچے گئے۔ فردوسی جس کی تلاش میں تھا وہ اس

وقت سلطان کی واحد شخصیت تھی۔ چنانچہ اس نے شاہنامہ ایک قصیدہ کے ساتھ جو شاہنامہ کی زمیں میں لکھا پیش کیا۔ اس قصیدہ میں وہ ایک خواب کے پیروی میں پہلی دفعہ سلطان کے دربار سے روشناس ہو رہا ہے، فردوسی لکھتا ہے کہ میں نے خواب میں ایک شخص کو تخت پر بیٹھ دیکھا۔ اس کے دونوں جانب سپاہ اساتذہ تھی وہ یافت کیا ہے

کہاں چرخ و ماہ است بیا تاج و گاہ ستارہ است پیش اندیش با سپہ
کہ یہ دربار شاہی ہے یا رفعت و عظمت آسمانی ہے اور یہ تاج پوش تخت
نشین شاہ ہے یا ماہتاب لود یہ سپاہ دور دور صف بستہ ہے یا ستارے
یکے گفت این شاہ روم است ہند ز قنوج تا پیش دربار سند
بایماں و توران و رابندہ امہ ہلکے ایضراں او زعمہ امہ

فردوسی طوس کے گاؤں "شاداب" نامی کا باشندہ تھا۔ ایران و توران میں سلطان محمود کی فتوحات کا حال تو اس نے سن لیا ہوگا مگر سلطان کی جہات ہند کی تفصیل سے واقف نہ تھا۔ دریا و سندھ کے پار سلطان کے مشہور حملہ قنوج کی شہرت بھی دنیا و اسلام میں پھیل چکی تھی۔ اس لیے فردوسی نے بھی خصوصیت سے اس کا ذکر کیا ہے۔

قنوج کے حملہ کے واقعات بالاختصار حسب ذیل ہیں :-
شعبان ۳۹۷ھ میں گنڈاپندل راجہ کالینجر اور ارنجن راجہ گوالیار
اور دیگر ریاستوں کی متحدہ فوج نے راجہ پال راجہ قنوج پر اس لیے حملہ
کر دیا کہ اس نے سلطان کی اطاعت رٹنے مرنے کے بغیر قبول کر لی
تھی اب یہ دھرم سے خارج ہو چکا تھا۔ لڑائی میں راجہ پال مارا گیا۔

سلطان کو اطلاع ہوئی تو ^{۱۱۹}شہر میں قنوج پر لشکر کشی کی۔ جب ہمدرد راجگان کی متحدہ فوج کا جائزہ سلطان نے میدان جنگ میں ایک بلند مقام پر کھڑے ہو کر لیا تو ان کی کثرت جمعیت اور جنگی ہاتھیوں کی قطار اور دیگر ساز و سامان سے کچھ مسحوب ہو گیا۔ فرش خاک پر سر رکھ کر اللہ تعالیٰ کے حضور فتح و نصرت کی دعا کی، اٹھ کر دیکھا کہ ہر اول فوج کا عرب دستہ ابو عبداللہ محمد الطائی کے تحت راجگان کی متحدہ فوج پر حملہ آور ہو رہا ہے۔ لہذا سلطانی فوج کے سوار دشمن کے بائیں دائیں بازو پر ٹوٹ پڑے۔ سلطان دیکھ رہا تھا کہ راجوں کی متحدہ فوج منتشر ہو کر پسا ہو رہی ہے۔ سلطان اس مقام سے اتر کر اپنے محافظ دستہ کو لیے ہوئے دشمن پر حملہ آور ہوا۔ دشمن کے پاؤں اکھڑ ہو گئے۔ اور راجگان نے راہ فرار اختیار کی۔ سلطان نے تعاقب جاری رکھا۔ پہلے گوالیار کے قلعہ کو محاصرہ میں لیا۔ ارجم راجہ گوالیار یہاں پناہ گزیں تھا۔ آخر راجہ نے صلح کا پیغام بھیجا۔ لہذا پیش ہاتھی مندر کیے۔ اس کے بعد سلطان نے کالنجرا کا رخ کیا۔ قلعہ ایک پہاڑی پر واقع تھا۔ اس میں پانچ لاکھ سپاہ اور بیس ہزار مویشی اور پانچ سو ہاتھی موجود تھے۔ سلطان نے اس قلعہ کی ناکہ بندی بھی خاطر خواہ کی۔ راجہ گنٹا نے دیکھا کہ اتنے نفوس کا سامان خورد و نوش ختم ہو رہا ہے تو صلح کی طرح ڈالی۔ مین سو ہاتھی مندر کیے اور آئندہ باج و خراج کا وعدہ کیا۔ اور ایک نظم ہندی سلطان کی مدح میں لکھ کر بھیجی۔ سلطان نے صلح منظور کر لی اور ^{۱۲۳}۱۲۳۱ء کو غزنی واپس آیا۔

اس واقعہ سے اتنا ثابت ہونا ہے کہ جب فردوسی نے قصیدہ پیش کیا اس وقت سلطان ہم قنوج سے فارغ ہو کر غزنی میں موجود

تھا۔ اس لیے شاہنامہ ^{۱۳۰۲ھ} کے بعد پیش ہوا۔ اگر ہم ان نواریں کو
 مد نظر رکھیں تو یہ بات آسانی میں سمجھ میں آسکتی ہے کہ فردوسی نے شاہنامہ
 ختم کرنے کے بعد بیس سال تک محفوظ رکھا جب تنویر کے حملہ کے بعد
 وہ دربار سلطان میں آیا اور شاہنامہ پیش کیا تو خلافت توقع میں الدولہ
 امین الملک پڑھ کر چیں بچیں ہوا۔ اور کہا کہ خدا داد قابلیت کو تم نے گرو
 کے افسانوں پر صرف کیا۔ کیا شاہان اسلام اور خلفاء راشدین کے کارناموں
 میں ہمیں رزمیہ نظم کا موضوع نہیں مل سکتا تھا؟ یہ حماقت صرف
 فردوسی سے سرزد نہیں ہوئی بلکہ ایرانی شعرا کا یہ شیوا رہا ہے کہ وہ فتوحات
 عرب کو ہمیشہ نظر انداز کرتے رہے اور کیانی اور ساسانی شاہان ایران
 کے گن گائے رہے یا اغیار کے مشاہیر کا نام اچھالتے رہے۔ نظامی
 گنوی کو "خدائے سخن" کہتے ہیں اور بلاشبہ اس کا پایہ شعرد شاعری
 بہت بلند ہے، اس نے بھی یونانی "ہیرو" سکندر کو اپنی بے نظیر نظم کا
 موضوع منتخب کیا۔ اسی سے ان کی ذہنیت اور قومی تعصب کا پتہ چل
 سکتا ہے،

فردوسی کے بھی سوا اس ٹھکانے ہو گئے۔ وہ خود ایک قطعہ میں
 کہتا ہے کہ

نخبہ دگ محمد نابی دیاست کلام دیدا کہ آں را کنارہ پیدانیت
 شدم بدیاد غوطہ نغم مدیم در گناہ بخت منست این گناہ دیانیت
 اس کے بعد اس نے "یوسف زلیخا" لکھی، شروع میں لکھتا ہے کہ
 کتعال گراموز جہے لغاست بنن نہ سپم جز ہمیں راہ راست
 اگر زندگی نے کچھ لوہ دن لگا رکھے ہیں تو میں آئندہ راہ راست

سے بھٹک کر کجروی اختیار نہ کروں گا۔

نہ گیرم سخن ہائے بیہودہ بیہج
نہ گیرم بیہودہ گفتن پیسج

کہاں دانتا ہناروغ است پاک
دو صدناں نیز دیک ذرہ خاک

سخن را پایہ نہ وارد زمین
نہ سخنانہ خرد منداں سخن

ہدیں گو نہ سورا بخند و خرد
زمین خود کجای پس و خرد

کہ یک نیمہ از عمر خود کم کنم
جہاں سہ لہ نام رستم کنم

میں آئندہ ایسی بیہودہ گئی سے معزز رہوں گا، جو کچھ میں شاہنامہ

میں لکھ چکا ہوں وہ محض فسانے ہیں ان کی تاریخی حقیقت کچھ بھی نہیں

ایسی نظم اور شعر جس کی بنیاد کچھ نہ ہو اس کو اہل عقل و سخن کی تعریف

میں داخل نہیں کر سکتے۔ یہ وحشت جو مجھ پر سوار رہی ہے اس پر

عقل ہنستی ہے اور مجھ سے ایسی نامعقول حرکات کا سرزد ہونا عقل

کب گوارہ کرتی کہ اپنی عمر سے نصف زندگی تو صرف اس بات پر کروں

کہ ایک رستم کا نام یاد گار زمانہ رہ جائے، مگر فردوسی اپنی شاعری

شاہنامہ کی نظر کو چکا تھا اور یوسف زلیخا اس لیے بھی مقبول نہ ہوئی کہ

اہل ایران کو اس سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

انہی میں مناسب ہے کہ ہم اس بھوہ کا بھی جائزہ لیں جو فردوسی سے

منسوب کی گئی ہے اور سلطان کے خلاف کسی قریبی نے لکھی، کوشش تو

بہت کی گئی ہے کہ فردوسی کی زبان کا چہرہ اتارا جائے اور اس کوشش

میں مصنفت بھوہ فردوسی کے چند اشعار کے سہرا کا بھی مرکب ہوا، شاہنامہ

کے شروع میں حمد و نعت کے بعد فردوسی خلفاء راشدین کی منقبت

میں لکھتا ہے کہ

آنحضرت صاحب وحی تھے، آپ صاحب
امر نہیں بھی تھے آپ نے فرمایا
کہ آفتاب نبوت الوالعزم انبیاء و رسل کے بعد
الوید سے بڑھ کر کسی اور پر مدح و ثناء نہیں ہوا
عمر نے اسلام کو اشکار کیا
جہاں کو باغ و بہار کی طرح آراستہ کیا
ان دونوں خلفاء کے بعد عثمان کی بارگاہ
آئی ہے جو صاحب شرم و عیاد صاحب دین
جو تھا خلیفہ علی رضی اللہ عنہما زہرا و خیرا آنحضرت
کا شوہر ہے کہ اس کا وصف خود

رسول کریم بھی بیان فرماتے ہیں
دارت این سخن قول پیر است
تو گوی در گو شرم بر آواز اوست
آخری اشعار (۶، ۷) جو حضرت علی کی مدح میں شاہنامہ کے متن
میں موجود ہیں، جو بھی بلفظ رکھ دیئے گئے۔ فردوسی اگر بجا اہل حضرت علی
کی شان میں منقبت لکھتا تو اس شان کی لکھتا کہ زمانہ میں یادگار ہوتی
نہ کہ صرف چند ابیات جو پہلے ہی کہہ چکا تھا دہرا دیتا۔

ہجو کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطان محمود نے فردوسی
کو بھی فرمائی تصور کیا اس لیے لکھتا ہے کہ

پیام بر شہر یاراں بود
نہ این نام بر نام محمود گفت

پہر گفت آن خداوند تنزیل دی
خداوند امر و خداوند نبی
کہ خورشید بعد از رسولان مر
(۲) مہتا بید بر کس نہ بود یگر بہ
عمر کرد اسلام را آشکار
(۳) پیار است گیتی چو باغ و بہار
پس از ہر دو بود عثمان گزیر
(۴) خداوند شرم و خداوند دین
چہارم علی بود جفت بتول
(۵) کہ اورا بہ سخنی شاید رسول

۶۔ کہ من شہر علم علی در است
۷۔ گواہی دہم تائیں سخن راز اوست

آخری اشعار (۶، ۷) جو حضرت علی کی مدح میں شاہنامہ کے متن
میں موجود ہیں، جو بھی بلفظ رکھ دیئے گئے۔ فردوسی اگر بجا اہل حضرت علی
کی شان میں منقبت لکھتا تو اس شان کی لکھتا کہ زمانہ میں یادگار ہوتی
نہ کہ صرف چند ابیات جو پہلے ہی کہہ چکا تھا دہرا دیتا۔

جہاں تا یوں تا جداراں بود
کہ فردوسی طوسی پاک جہانت

بنام نبی دعلی گفتم ام گہرائے معنی بے سفتہ ام
 اگر حضرت رسول کریم اعد علی مرتضیٰ کی خدمت میں یہ گبری فنانے
 پیش کرتا تو یقیناً اس کو وہی جواب ملتا جو سلطان محمود نے دیا

ابورسائل محمد بن احمد البیرونی

سلاطین اسلام اول تو خود عالم تھے اور اگر علوم میں زیادہ دخل نہ تھا تو اس میں کچھ کلام نہیں کہ علم و دست ضرور تھے۔ اور ان کے دربار کی زینت زیادہ تر ہر ایک علم و فن کا ماہر ہی تھے وہ جس کسی ایسی ہی شخصیت کا نام سنتے اسے دعوت دیتے، اہل علم و ہنر خود بخود کھینچے چلے آتے۔ ان حضرات میں یہ خوبی بھی تھی کہ نہ صرف اہل سیف تھے بلکہ اہل قلم بھی تھے۔ سلطان محمود کے دربار میں ہر ایک علم و فن کے یگانہ روزگار جمع تھے۔ لہذا اس کی داد و پیش تے ان کو سلطان سے وابستہ کر رکھا تھا۔ شعرا اور ادیب تو بہت تھے لہذا ان کلام سے سلطان کی فتوحات کا تاریخی مواد جمع ہو سکتا ہے لیکن انہوں نے اسے کہ بعض حضرات کی تصانیف کا ہمیں دوسرے ذریعہ سے پتہ تو چلتا ہے مگر آج دنیا اسلام میں مفقود ہیں یہ علمی خزانہ یورپ کے کتب خانوں میں منتقل ہو چکا ہے۔ لہذا اہل یورپ کبھی کوئی کتاب چھاپ دیتے ہیں تو ہمیں بھی اس کا مطالعہ کا موقع ملتا ہے۔ مناسب تو یہ ہے کہ اسلامی حکومتیں کا تب ان ممالک میں بھیجیں جو ان کتب کی نقول حاصل کریں۔ لیکن کسی اسلامی سلطنت کی توجہ اس طرف

ابھی تک مبذول نہیں ہوئی۔

ابوریحان البیرونی کے حالات کا ہمیں بہت کم علم ہے۔ اگر اسکی تصنیفات
 جن میں سے اکثر نہیں ملتیں ہمارے پاس ہوتیں تو اپنی سے اس کے
 سوانح حیات کا بہت کچھ علم ہو سکتا ہے۔ وہ مورخ بھی تھا فارسی تو اس
 کی مادری زبان تھی۔ لہذا ان ایام میں ممالک اسلامیہ میں ہر ایک عربی کا بھی
 عالم تھا۔ اس لیے یہ بھی کوئی بڑی بات نہ تھی۔ وہ سنسکرت کا بھی بہت
 بڑا عالم تھا۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ زبان اس نے کہاں لہا کس سے سیکھی
 ہندوستان میں وہ کئی سال رہا۔ لیکن اس نے سنسکرت ہندوستانی پنڈتوں
 سے ہندوستان میں رہ کر نہیں سیکھی۔ سنسکرت کا علم صرف ہندوستان میں
 محدود تھا لہذا غیر ہندوستان میں اس کی تعلیم دینا ان میں ممنوع تھا۔ لہذا ہر ایسا
 معلوم ہوتا ہے کہ جب سلطان محمود نے پنجاب مسخر کر لیا۔ تو کئی پنڈت
 حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔ اپنی سے بیرونی نے بھی اس کا علم حاصل کیا
 اس کو علم ہیئت سے خاص شغف تھا۔ اگرچہ اسے دیگر علوم پر بھی عبور
 حاصل تھا۔ مگر اس کی مشہرت اسی علم کی وجہ سے ہے۔ اسے معلوم تھا کہ
 علم ہیئت اہل فلسفہ اور ہندوستان میں اہل ہند اپنی آپ ہی نظر تھے۔
 اور ان کے شاہدوں کا مطالعہ سنسکرت کے علم کے ساتھ ہی ممکن تھا
 بیرونی نے غزنی میں رہتے ہوئے سنسکرت سیکھی اور ان شاہدوں
 کا بھی مطالعہ بہ منظر غائر کیا۔ غالباً مکمل کے لیے وہ پھر ہندوستان میں آیا
 وہ خود لکھتا ہے کہ جب اس موضوع پر یہاں کے پنڈتوں سے مکالمہ
 ہوتا اہل بعض اغلاط بھی مخرج دلست سے بتاتا تو وہ سخت
 حیران ہو کر پوچھتے کہ آپ نے یہ علم کس پنڈت سے سیکھا ہے۔

بیرونی خوارزم (جنیوا) کا باشندہ تھا۔ لیکن بعض تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ پہلے واقع وادی سندھ میں ۳۶۳ھ میں پیدا ہوا۔ اگر یہ صحیح ہو تو وہ بسہولت سنسکرت سیکھ سکتا تھا۔ علاوہ ازیں بیرونی سے پیشتر بھی علماء اسلام ایسے گندے ہیں جو سنسکرت کے عالم تھے اور بعض کتابیں سنسکرت سے عربی میں ترجمہ کر چکے تھے جو بیرونی کے زیر مطالعہ رہیں۔ ترجمہ کا کام ایسا ہی شخص کر سکتا ہے جسے دونوں زبانوں پر عبور حاصل ہو۔ لیکن جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں، کئی پنڈت ان ایام میں حلقہ بگوش اسلام ہو چکے تھے۔

معلوم نہیں کہ علم کی تشنگی اسے وادی سندھ سے پنجاب کے دریاؤں کے کناروں اور وادی گنگا اور جمنائیں لے گئی یا اس کے علاوہ کچھ اور سیاسی اغراض بھی تھیں۔ بیرونی ہیئت کے علاوہ جغرافیہ کا بھی عالم تھا اس لیے شمالی ہندوستان کے بعض مشہور شہروں کا جائے وقوع ان کے طول و عرض بلد کے ساتھ لکھا ہے۔ ظاہر ہے کہ سلطان محمود کو ایک ایسے ہی آدمی کی ضرورت تھی۔ جو ان شہروں کا صحیح مقام اور آمد و رفت کے راستے بتائے۔

بیرونی کی تاریخیں تاہم آثار الباقیہ سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کچھ عرصہ عالمی جویان شمس العالی قابوس کے مقررین میں شمار ہوتا تھا۔ لیکن بعد میں آل سامان سے وابستہ ہو گیا۔ بعد اس خاندان کے نویں تاجدار منصور ثانی (۳۸۶ھ) ابن نوح ثانی (۳۹۶ھ) کی سرپرستی میں وہ فراغت سے تحصیل علم میں مشغول رہا لیکن منصور کی شاہی بھی دولت مستعمل تھی۔ امراء و ہبار کی باہمی رقابت اور بعض نمک حراموں کی سازش سے نظام سلطنت

درہم برہم ہو گیا۔ انہوں نے منصور کو معزول کر کے انہیں نکلا دیں اور
 اس کے بھائی عبدالملک کو تخت پر بٹھا دیا۔ یہ امراء کے ہاتھ میں کھڑے پتلا
 تھا۔ سلطان محمود غزنوی سے لڑائی چھیڑ دی محمود نے اسے فکست فاش
 دی۔ یہ واقعہ یاد رکھنا چاہیے کہ آل سامان کے پانچویں تاجدار نوح
 (۲۲۲ھ) کا بیٹا عبدالملک (۲۲۲ھ) تخت نشین ہوا تو اس کی افواج
 کا سہ سالہ اس کا غلام ایتھین تھا۔ عبدالملک فوت ہوا تو امراء دربار
 عبدالملک کے بھائی منصور کے حق میں تھے مگر ایتھین خلافت تھا۔ منصور
 بادشاہ ہوا تو ایتھین کو بھاگنا پڑا اس نے غزنی کے پہاڑوں میں پناہ
 لی۔ اسی کے غلام لہو داماد لہو بانشین سبکتگین نے خاندان غزنویہ کا سنگ
 بنیاد رکھ دیا۔ سلطان محمود اسی کا بیٹا ہے خاندان غزنویہ کو آل سامان کا
 احترام ہمیشہ ملحوظ خاطر رہا جب نوح ثانی اپنے باپ منصور کی وفات
 کے بعد تخت نشین ہوا تو نیک حرم امراء دربار کی سازش کی وجہ سے خراسان
 لہو جرجان اور طبرستان ہاتھ سے نکل گئے حالانکہ تمام علاقہ مادرا لہو
 اس کے قبضہ میں تھا نوح ثانی نے سبکتگین کو مدد کے لیے لکھا و قادار
 غلام نے اس وقت تک خود مختاری کا اعلان نہ کیا تھا اور اپنے آپ
 کو آل سامان کے تخت ہی سمجھتا رہا۔ اس نے اپنے بیٹے محمود کو مدد
 کے لیے بھیجا اس نے دشمنوں کو پے در پے شکست دے کر پھر
 سے نوح کو مادرا لہو کی بادشاہت دلوائی، لیکن نوح ثانی کی تخت نشینی
 پر امراء کی پھر بن آئی۔ وہ سمجھتے تھے کہ سلطان محمود ہی سنگ راہ ہے۔
 لیکن جب لڑائی چھیڑی تو آل سامان کا بھی غامہ ہو گیا اور یہ علاقہ غزنوی
 مملکت میں شامل ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی دیباری علماء حکماء بھی دربار

غزنوی میں منتقل ہو گئے۔ ان میں سے ایک ابوریحان بیرونی تھا۔
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بیرونی غزنی میں کچھ بہت عرصہ نہیں ٹھہرا۔
خود سلطان محمود کا قیام بھی غزنی میں سال بھر میں بمشکل چند ماہ مسلسل رہا
ہوگا۔ وہ پابریکاب ہی نظر آتا ہے۔ اس کے ہمراہ عموماً اہل قلم و سیف
بھی رہتے، بلکہ شعراء و دربار بھی ساتھ رہتے۔ ہر ایک حمد اور فتح کی تقریب
پر قصیدے لکھتے جس میں ان واقعات کا بھی مذکور ہوتا۔

سلطان محمود کی وفات کے بعد بیرونی سلطان کے بیٹے ناصر الدین اللہ
مسعود (۱۱۹۱ھ) کے دربار میں نظر آتا ہے اسی کے نام پر اس نے
"قانون المسعودی" لکھی۔ بیرونی کا انتقال ۱۱۹۶ھ میں غزنی میں ہوا اور
یہیں مدفون ہوا۔

بیرونی کی مشہور کتاب "کتاب الہند" ہے، یورپ کی علمی زبانوں میں
اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ یہ ابن بطوطہ یا مسعودی وغیرہ کا سفر نامہ نہیں
بلکہ ان ایام میں جو کچھ ہندوؤں کی معاشری زندگی تھی اس کا صحیح نقشہ
اس نے کھینچ کر رکھ دیا ہے اور اس سے بہتر و معتبر تاریخ کسی
عینی شاہد کی نہیں ملتی۔ اس نے غائر نظر سے یہاں کے مذاہب اور
ان کے رسم و رواج اور معاشری زندگی بالخصوص علوم ہدیت اور فلسفہ کا
مطالعہ کیا اس کا مفصل مذکور اس کی کتاب تحقیق الہند میں ہے بیرونی
اگرچہ ہندوؤں کی ذہانت اور ان کے علم و فن کا مداح ہے مگر بعض
باہر ایسی بھی تھیں اور آج بھی ان کی شہادت موجود ہے جو اس کے
اپنے نقطہ نگاہ میں بحیثیت مسلمان مذہوم تھیں۔ وہ لکھتا ہے کہ صنف
ضعیف کی حرکت جو یہاں ہو رہی ہے انتہائی مذہوم ہے۔ "ستی" کی

انسانیت سوز رسم عام ہے۔ بیوہ اپنے متوفی شوہر کی لاش کے ساتھ
زندہ جلائی جاتی ہے۔ بیان یہ کیا جاتا ہے کہ اسے اپنے خاوند کا
عشق مجبور کرتا ہے اس کی فرقت گوارا نہیں کر سکتی۔ اور یہ بھی ہانتی
ہے کہ اس کے سوا اس کا اور کوئی سرپرست بھی نہیں۔ اس لیے
یخوشی خاطر ان کی بھینٹ ہو جاتی ہے۔ لیکن کوئی مرد اپنی زوجہ متوفیہ
کے ساتھ جل کر اسے دست دھرم کا ثبوت نہیں دیتا۔ مغربی ہیں
شادی عام ہے۔ حکماء و علماء ہند تو توحید کے قائل ہیں مگر عوام مورتی
پوجا کرتے ہیں۔ برہمن خواہ کسی جرم کا مرتکب ہو سنگین سزا سے بری
ہے۔ راجہ اور برہمن معصوم سمجھے جاتے ہیں، دہ لکشا برہمن کسی قسم
کا مالیہ ادا نہیں کرتے۔ شمالی ہند میں پچھ خود مختار ریاستیں کشمیر اور
سندھ اور گجرات اور مالوہ اور قنوج اور بنگال میں ہیں اور ان کے
تحت چھوٹے چھوٹے راجہ اور رئیس ہیں۔

بیرونی کتاب الہند میں علم ہیئت اور ریاضی اور جغرافیہ اور تقسیم
اور طبیعیات پر بھی سیر حاصل بحث کرتا ہے۔ اور ان کی غلطیوں کو بھی نمایاں
کرتا ہے۔

ابو ایاز

سلطان محمود اور ایاز کے بارہ میں ساد کروں اور شعرا کے کلام میں
فنانے مذکور ہیں، بات تو صرف اتنی ہے کہ سلطان کے پاس ہزاروں
غلام تھے اور ایک سے ایک بڑھ کر حسن و جمال رکھتا تھا۔ ان میں سے
ایاز بھی ایک تھا۔ مگر جو بات اس میں تھی وہ کسی اور میں نہ تھی۔ بلکہ
یہ کہنا کچھ مبالغہ نہیں کہ فراست میں اکثر امراء و دربار بھی اس کا مقابلہ
نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے کچھ توجیب نہیں کہ سلطان کا منظور نظر تھا۔

پہ خوش است اگر بوداں قدر ہو میں بلندی منظر ت
کہ برآں مہاں جو عدم نہی خم گردشے خورد سرت

ایاز تو آخر ایک غلام ہی تھا۔ ہم نے اکثر ایسے سننے دیکھے ہیں کہ اگر
ملک سفلہ پرور نے انہیں مال و جاہ دے دیا تو بھول جاتے ہیں کہ
وہ کیا تھے۔ وہ اپنے پرانے اصحاب سے ملتا بھی حار سمجھتے ہیں۔ ایاز
کی نسبت ایک روایت مشہور ہے کہ چونکہ سلطان کا منظور نظر تھا۔
اس لیے دربار میں اکثر امراء بھی حد کے مارے جل بھن کر کوٹے ہوئے

نٹھے اور اس تاک میں تھے کہ موقع ہاتھ لگے تو اسے بیجا دکھائیں۔
 کبھی کبھی خزانہ شاہی میں بھی جایا کرتا، حامدوں نے خیال کیا کہ مزرہ پور
 کو تائبے سلطان کے پاس بھڑ دی، سلطان نے کہا کہ جب ایاز اس
 طرف جائے مجھے خبر کرنا۔ ایک دن ایاز خزانہ کے دروازہ میں داخل
 ہو رہا تھا کہ حامد سلطان کو وہاں لے آئے۔ سلطان نے چھپ کر
 دیکھا کہ ایاز ایک کمرہ میں داخل ہوا۔ اور ایک صندوق کھولا۔ حامد
 ہمراہ تھے۔ حل ہی دل میں خوش ہو رہے تھے کہ آج پور پکڑا گیا۔ ایاز
 نے اس صندوق سے کپڑے نکالے جو پھٹے پرانے تھے۔ اپنا دربار
 باس اتار کر یہی کپڑے پہنے اور اپنے آپ کو کچھ دیران کپڑوں کو
 دیکھتا رہا۔ آخر کیا کہ ۰

ایاز قدر خود بشناس۔ تو اس حال میں تھا جب سلطان کے حضور آیا۔
 اور آج تو اس لباس میں طبوس بیے درباری لباس کی طرف اشارہ کیا
 حامد تو وہیں زمین میں گر گئے۔ سلطان نے آگے بڑھ کر ایاز کو گلے
 سے لگا لیا۔

یہ فقرہ کہ "ایاز قدر خود بشناس" عذب المنزل ہو گیا ہے۔ اور بات
 بھی یہی پسندیدہ ہے کہ انسان کو کبھی ایسے بلند مرتبہ کی ہوس نہ کرنی
 چاہئے کہ جب اس مقام پر پہنچے تو سر چکرا جائے۔ ایسے عالی فطرت
 بھی ہوتے ہیں کہ تواضع کو ہاتھ سے نہیں دیتے۔
 تواضع و گردن فرانہ ان کو بست گوارا تواضع کند خوئے اوست
 غرض یہ سیرت کی پاکیزگی تھی جس نے سلطان کو گرویدہ بنا رکھا تھا۔
 حسن صورت کے لحاظ سے تو اور بھی بہت تھے۔ کہتے ہیں کہ ایک دفع سلطان

ایاز کے کان میں سر دربار کچھ کہا۔ جب دربار برخاست ہوا بعض مقررین
ایاز سے پوچھا کہ سلطان نے کیا ارشاد فرمایا تھا۔ جواب دیا کہ سلطان سے
ہو۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں بھرت نہیں۔ جواب دیا کہ اتنا تو سوچو کہ اگر کوئی
بات ہوتی جو سلطان تمہیں بتانا چاہتا تو مرے کان میں نہ کہتا۔ لہ
یہ یقین ہے کہ کوئی بات ایسی ہی راز دارانہ تم میں سے کسی وقت کسی کے
کان میں کہے تو مجھے بھی آگاہ نہ کرو گے۔

نزد مملکت خویش خسرواں دانند۔

شیخ عطارؒ کی بزرگی کے عارف رومی اور تمام متاخرین مداح ہیں
وہ ایاز کے پیرا یہ ہیں در مس عشق دیتے ہیں خوشتر آں باشد کہ سر دلبراں،
نہ آید در حدیث دیگران۔ یہ واقعات خواہ تاریخی لفظ نگاہ سے صحیح
ہوں مگر بلاظنا تاج سبق آموز ہیں اور یہی بات شیخ عطارؒ اور دیگر
عراق ذہن نشین کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ ایک حکایت اس طرح بیان
جاتے ہیں کہ

ایک دفعہ سلطان محمود ایک غلام کی کسی حرکت ناشائستہ پر غضب
اک ہوا۔ لہ اس کے قتل کا حکم دیا۔ ایاز موجود تھا اسے کہا کہ تم تھوڑے
رصہ کے لیے مجلس سے باہر چلے جاؤ۔ غرض یہ لگتی کہ ایاز قہر سلطانی کو
دیکھ کر آندوہ نہ ہو۔ ایاز نے تو آج تک فیروہ محبت کے سوا اور کچھ
سلطان کی جانب سے مشاہدہ نہ کیا تھا۔ عرض کی کہ کتنا خوش نصیب
یہ غلام ہے کہ بادشاہ اس کے قتل کا حکم دینا ہے۔ یہ بات
میرے نصیب میں نہ ہوئی۔

کارمن بنگر کہ روز سے چند بار
 میثوم از تیغ ہیبت کشتہ زار
 با ادب در پیش سلطان دم زدن
 سخت تر با نڈز حد گردن زدن
 روز و شب از قہر او سقیم ملام
 وانگیم بدردہ لطفست تام

میری حالت دیکھ کہ ہر روز کتنی
 اس کی تیغ ہیبت سے قتل ہوتا
 سلطان کے حضور مود بات بات کہ
 سوگردن کاٹنے سے بھی سخت
 میں تو دن رات اس کی آتش تو
 کے خوف سے جل رہا ہوں ہر کہ
 یہ مشہور ہو رہا ہے کہ میں اس کے
 لطف کا پروردہ ہوں۔

جس کسی کے سخی میں اس کا لطف
 زیادہ ہوگا بلکہ شبہ وہ لہو میں
 ہوا ہوگا۔

پہلے کہ " نزدیکیاں را بیش بود بصرانی "۔ تقرب حاصل نہیں ہو سکتے
 جنت تک انسان یا خود ہے، " شرط اول قدم آنت کہ مجنوں باطن
 شیخ عطار " اسی لطف و قہر کے موضوع کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ
 ایک رات سلطان بستر پر مزاحمت فرما رہا تھا۔ اور ایاز اس کے
 پاؤں دیا رہا تھا۔ اور ساتھ ہی پاؤں چومنا تھا۔ سلطان نے کہا کہ میرے
 پاؤں کیوں چومتا ہے، میرے چہرہ کی قدر دیگر اعضا سے زیادہ ہے۔
 چہرہ پر بوسہ دیا ہوتا۔ عرض کی کہ ہر ایک شخص سلطان کا چہرہ چاند کی
 طرح دیکھتا اور دیکھ سکتا ہے۔ سلطان کی قدم بوسی کا شرف ہر ایک
 کو میسر نہیں، ابلیس نے ہر ایک شے ترک کی اور اللہ تعالیٰ کے قہر کی
 درخواست کی۔ کیونکہ اللہ کے لطف و کرم کے خریدار بہت ہیں۔

پولعت خلعت درگا او بود
چو لعت خلعت درگا او بود
ای درگاہ سے ملا اور اسی درگاہ
سے جو بھی ملا اچھا ہی تھا۔

بداں نعت حریت مرد و زن شد
بے خلق جہاں را را ہزن شد
اسی لعنت کا خربہ اس کے ہاتھ لگا
کہ دن و مرد کے مقابلہ میں آیا اللہ
اکثر مخلوق کو گمراہ کیا۔

ازاں لعنت گرش قوت نبوے
کجا با خلق این قدرت نمودے
اگر اسے اس لعنت سے تقویت نہ
ملتی تو کیسے مخلوق پر قدرت پاتا۔

شیخ عطار اس حکایت کے آخر میں فرماتے ہیں کہ

روح اں لرض پر برگ آمد
اگر یہ دیگر اں مرگ آمد
خدا کی جانب سے یہ لعنت اس
کے لیے دھنگ کا برگ و بار ہے۔

اگر یہ دوسروں کے لیے موت کا پیغام

اس قسم کی حکایات بہت ہیں، ہم نے بغرض تفسیر ایک حقیقت

آگاہ کے کلام سے اقتباس کیا ہے،

ابوالفضل بیہقی لکھتا ہے کہ ۱۵۱۵ھ میں سلطان محمود اور نور خان

بادشاہ ترکستان یاہم ملائی ہوئے شاہ ترکستان نے دیگر مخالف کے ساتھ

عام دستور کے مخالف چند غلام بھی پیش کیے جنہیں سلطان غزنی میں ہمراہ

لایا۔ ان میں ایک کم سن لڑکا تو شنگین خوی نامی تھا۔ اس سے زیادہ

اور مقبول صورت تر اس وقت تک کوئی شخص نظر نہیں آتا تھا۔ سلطان

نے اس کی تعلیم و تربیت کا خاص اہتمام کیا۔ سلطان کی وفات کے بعد

لوشنگین سلطان محمد پسر سلطان محمود کی خدمت میں ساقی گری پر مہور ہوا

لہذا سلطان محمد نے اسے مالا مال کر دیا مگر جیب سلطان محمد کو برطرف کر کے سلطان مسعود جو سلطان محمود کا بڑا بیٹا تھا جانٹھین ہوا تو کوششیں کا وہی رتبہ لہذا اعزاز بحال رہا جو ایاز کا سلطان محمود کے عہد میں تھا۔ بلکہ سلطان مسعود نے اسے اسے ولایت و کوہ کاغان و کاغالی بھی مقرر کر دیا لہذا آخر سپہ سالار افواج سلطانی ہو گیا۔

ایاز کی ایک بہن بھائی سے بھی زیادہ مقبول صورت تھی۔ سلطان محمود چاہتا تھا کہ اسے جنالہ نکاح میں لائے مگر یہ خیال وہ رہ کر آتا کہ لوگ کہیں گے کہ اپنے بندہ زادوں سے نکاح کیا۔ ایک رات ابو نصر طحانی جس نے کتاب مقالات و تصنیف کی ہے موجود تھا۔ یہ شخص مورخ تھا۔ سلطان نے اس سے دریافت کیا کہ تو شاہاں عالم کے حالات سے واقف ہے کسی بادشاہ نے اپنے بندہ زادوں سے بھی نکاح کیا ہے۔ ابو نصر نے کہا کہ ابے واقعات بہت ہیں آل سامان نے اپنے موالیوں سے نکاح کیا۔ قباد شہنشاہ ایران نے ایک دہقان کی لڑکی سے نکاح کیا اور اسی کے بطن سے نوشیروان پیدا ہوا۔ بہرام گور نے ایک دھبلی کی لڑکی سے بیاہ کیا۔ سلطان خوش ہو گیا اور ایاز کی بہن سے عقد نکاح کیا۔

یہ قصہ ہم نے عوفی کی کتاب بھارح الحکایات سے نقل کیا ہے۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ سلطان کے دل میں دوسو سنہ کس لیے پیدا ہوا۔ جو عباس تمام کینزک زادگان تھے لہذا مسلمانوں میں چوٹی کے علماء و حکماء و فقہاء اکثر لوٹنے والے کے بیٹے تھے لہذا سب سے بڑھ کر بروئے نص قرآن زیر دستوں سے نکاح جائز ہے۔ د مملکت ایمانکم بطور یہ بھی ایک حکایت ہی ہے جیسے اور بی شمار افغانی ایاز کے بارہ ہیں۔

گردیزی لکھتا ہے کہ ششماہ میں سلطان فتح رسے کے بعد غزنی میں واپس آیا تو مرض وق کے آثار ظاہر ہوئے کچھ عرصہ کے بعد اس کی شدت بڑھتی گئی۔ اور سلطان ہر روز ضعف زیادہ سے زیادہ محسوس کر رہا تھا۔ لیکن کاروبار سلطنت میں بدستور اس طرح مشغول رہتا کہ گویا بیماری نہیں اور غالباً غرض یہ بھی تھی کہ لوگوں پر اس کا ضعف ظاہر نہ ہو۔ اور اسی حالت میں خراساں میں آیا اور بلخ میں گیا اور موسم سرما وہیں بسر کیا۔ جب بہار کا موسم آیا، بیماری زود پکڑ گئی۔ غزنی کی طرف لوٹا۔ اگرچہ بہت علاج معالجہ ہوا مگر پھر تندرست نہ ہوا مگر آخر دم تک کاروبار سلطنت سرانجام دیتا رہا۔ آخر بروز پنجشنبہ ۲۳ ماہ ربیع الآخر ۱۱۱۱ھ میں اس جہان فانی سے رحلت کی "انا لله وانا الیہ راجعون"۔

بیہقی لکھتا ہے کہ سلطان کا بیٹا اور ولی عہد سلطان مسعود اس وقت "سپاہان" میں تھا۔ اور ہمدان اور بغداد کی طرف جانے کا ارادہ تھا غزنی سے بہت دور تھا۔ اس لیے امرا دربار نے باہمی مشورہ سے سلطان کے چھوٹے بیٹے ابو احمد محمد کو "کوزکاناں" سے بلاایا جو غزنی سے نزدیک تر تھا اور تخت و تاج سجالہ کر دیا۔ اس مشورہ میں ارکان دولت مسعودی میں امیر علی صاحب بزرگ عضد الدولہ امیر ابو یعقوب یوسف بن ناصر الدین سنبلتگین برادر سلطان محمود مرحوم جو سپہ سالار بھی تھا اور امیر حسن وزیر المعروف "سید ابو نصر مشکان" صاحب دیوان رسالت و ابوالقائم کثیر صاحب "سپاہان" وغیرہ شامل تھے۔

گردیزی لکھتا ہے کہ سلطان محمود کی وفات کو پچاس روز گزر چکے تھے کہ امیر ایاز نے غلاموں کو جمع کیا اور ان سے اس امر پر بیعت لی کہ

سب امیر مسعود کی خدمت میں حاضر ہو کر اس کی مدد کریں گے۔ چنانچہ وقت
مقررہ پر سب مسلح گھوڑوں پر سوار ہو کر غزنی سے نکل آئے۔ جب اس
کی اطلاع امیر خسرو کو ہوئی تو اس نے سوندھ رائے کو جو ہندوؤں کے
دستہ فوج کا افسر تھا تائب میں روانہ کیا۔ اس نے انھوں کو چایا۔
لڑائی میں سوندھ رائے مارا گیا۔ لہذا اس کی ہندو فوج بھاگ گئی۔ اکثر
غلام بھی مارے گئے۔ فتح مند ابوالنجم ایاز بن ایاق بقیہ السیف کے
ساتھ نہایت سرعت کے ساتھ تیشاپور میں امیر مسعود کی خدمت میں
حاضر ہوا۔ جب امیر کو دیکھا تو سب نے وہیں سجدہ شکر اٹھانے کے
مصور ادا کیا۔ لہذا امیر کو تمام حالات گذشتہ بتائے۔

ادھر امیر محمد نے عیش و نشاط کی مجلس گرم کر رکھی تھی۔ مقررین نے
بہت کیا کہ تجھے اپنے باپ کے نقش قدم پر چلنا چاہئے۔ لہذا ابھی تیری
سلطنت کو استقلال بھی حاصل نہیں ہوا بڑا بھائی مسعود عراق سے ضرور
آئے گا لہذا ممکن ہے کہ تاج و تخت پھینک لے۔ مگر اس نے اس ناصحانہ
مشورہ پر کان نہ دھرا۔ جب پرچہ لگا کر برادر بزرگ امیر مسعود ایک لشکر جوار
کے ساتھ آ رہا ہے تو ہوش میں آیا۔ فوج کے ساتھ غزنی سے کوچ کیا
املا نے یہ مشورہ دیا کہ تمام لوگ دل و جان سے امیر مسعود کو چاہتے ہیں
لہذا یقیناً تو اس کے مقابلہ کی تاب نہ لائے گا۔ مناسب یہ ہے کہ تو
غزنی میں مطمئن ہو کر بیٹھا رہے اور ہمیں اجازت دے۔ امیر مسعود
کے پاس جا کر اپنی اد تیری طرف سے غد خواری کہیں تاکہ تیری اد ہماری
جان بھی سلامت رہے۔ امیر محمد نے دیکھا سب امر متفقہ آرائے ہیں اور تمام
سرطان لشکر بھی بر گشتہ ہیں اس لیے مجبوراً ان کا کہنا مان لیا۔ امراد ہر دل

شکر امیر مسعود کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اظہار اطاعت کیا۔
 جب سلطان مسعود باپ کے تخت پر متمکن ہو گیا تو ایاز کی خدمات
 ثالث کا صلہ وہی کچھ تھا کہ جو سلطان محمود کی زندگی میں اسے ملتا رہا۔ صرف
 امرا میں اسے جگہ دی۔ مسعود بھی جانتا تھا کہ ایاز اس کے باپ کا منظور نظر
 تھا اور اس نے حق فدا دانی بھی کی حقہ ادا کیا تھا۔

سلطان مسعود چاہتا تھا کہ رے کا والی کسی سالار تختتم اور کاروان کو
 مقرر کرے۔ کیونکہ یہ خاص شہر بلخانہ وسعت و آبادی و مالیکہ کی ایسے ہی
 والی کے سپرد کیا جاسکتا تھا۔ وزیر داعیان و ارکان دولت نے چند امرا
 کا نام یا بعد ایاز کی نسبت بھی کہا کہ یہ تہا میت موزوں ہے کیونکہ سلطان
 مرحوم کے ہمراہ ہر ایک ہم میں رہا ہے۔ سلطان مسعود سمجھ گیا کہ وزیر کا
 کیا منشور ہے، کہا کہ اس کی ضرورت مردست وہاں نہیں اسی جگہ ہے۔

سلطان مسعود ہر ایک جنگ میں ایاز کو ہمراہ رکھتا۔ اور اس کی خدمت
 ثالث کا صلہ بھی العام و کرام و لوازشات سے دیتا، غالباً ۱۲۲۲ھ کا واقعہ
 ہے کہ سلطان مسعود کو مکرانی سپاہ سے جنگ کرنی پڑی ایاز سپہ سالار
 افواج سلطانی تھا۔ دشمن کو شکست فاش دے کر غزنی کی طرف منظر
 و منصور لوٹا تو سلطان نے چالیس خروار دینار دیے۔ حکیم فرخی نے اس
 واقعہ کا ذکر ایک قصیدہ میں کیا ہے۔

غم نا دین آں ماہ ویدار
 اس ماہ میں حد کے ہریدار سے
 مراد خوابگاہ ریز دہی خار
 محرمی کا غم مجھے خوابگاہ میں بھی
 کائنات کی طرح کھٹکتا ہے۔

شب تارے ہمہ کس خواب یاد
من از بیشتر اوتا روز بیدار

گئے گوئم ترا کہ بیم اسے دوست
گئے گوئم بست کے بوسم ای یار

زگر یانم کہ ہستم مرغ و ماہی
بھی گریند بر من پنچو من زار

مرا گولی چسرا گرپی زاندودہ
مرا گولی چسرا نالی و بیشتر

نہ وقت باز گشتن سوئے معشوق
نہ خبر باراز داران روئے گفار

ہراں کا سال آمد سوئے من لغت
نہ آئی خود کہ من دیدم ترا پار
دگوژی پشت من چوں پشت پیراں
زبستی پائے من چوں پائے بیمار

اندھیری رات میں سب بیٹھی بیٹھی
سوتے ہیں لیکن میں اس کے غم
میں صبح تک بیدار رہتا ہوں۔
کبھی تو میں دل ہی دل میں کہتا ہوں
کہ اے دوست تجھے میں کب دیکھوں
کبھی کہتا ہوں کہ کب تیرے لبوں
پر بوسہ دوں گا۔

جس طرح میں آہستہ آہستہ اُتسور
رہا ہوں اسی طرح ہوا کے پرندے
لہ دریا کی مچھلیاں بھی رو رہی ہیں
تو مجھ سے پوچھتا ہے کہ مجھے کیا
غم ہے کہ رو رہا ہے تو مجھ سے
پوچھتا ہے کہ تجھے کیا رنج ہے کہ رو رہی
حالت یہ ہے کہ نہ تو معشوق کی طرف
مراجعت کا وقت ہے اور نہ سوائے
کرم لازم کے کسی اور سے بات کر
سکتا ہوں۔

جو بھی اس سال مجھے ملتا ہے کہتا ہے کہ
یہ تو وہی نہیں ہے جسے گزشتہ سال دیکھا تھا
میری کمر بوز سے اُمیدوں کی پیٹھ کی طرح
خندہ ہے اور پاؤں بیماروں کی طرح

ضعف سے اٹھ نہیں سکتے۔
 میں اس طرح مالہ و فریاد کرتا ہوں
 جس طرح رعد بہن کے بیٹے میں اس
 طرح آنسو بہاتا ہوں جس طرح بادل
 برسات میں۔

میرا بیچارہ جسم موم کی طرح گچھل رہا
 ہے میرا غم زدہ دل مار کی طرح
 ہلے۔

یہ بوجھ جو میرے دل پر ہے اس
 وقت ہلکا ہوگا جب میں سردار
 سردانوں کے پاس پہنچوں گا۔
 میرا جسم ضعف سے بال کی طرح باریک
 رنج کو کیسے برداشت کر سکتا ہے بیچارہ
 دل یہ بوجھ کیسے اٹھا سکتا ہے۔
 اس وقت میرے دل کا بوجھ ہلکا
 ہوگا جب امیر سالار کی خدمت میں
 پار پائی ہوگی۔

امیر جگر ایاز بن ایاز ہے جس دن
 اور بادشاہی قوت چنگ کے وقت لگتا ہے
 جب سوار ہو کر میدان کے دروازہ
 میں داخل ہوتا ہے جو دیکھنے والوں کو

خوشم چوں خروش رعد بہن
 مر شکم چوں مر شک ابر آزار

تن مکیں من بگداشت چوں موم
 دل غمگین من لشکارت چوں مار

زول برداشت خواہم بار اندوہ
 چوں نزد میر سید یافتم بار

تن چوں فوی چوں بردار دای رنج
 دل بیچارہ چوں بردار دای باز

زول برداشت خواہم بار اندوہ
 چوں نزد میر سید یافتم بار

امیر جگر ایاز ایاز
 دل و باد دل خسرو وقت پیکار
 سوار گز در میدان در آید
 ز پا اند رفت دلہائے نظار

کوئی کہتا ہے کہ یہ پہاڑ پر مرد ہے
 اور کوئی کہتا ہے کہ شاعر پر پھول
 تازہ ہے۔

پر ہیزگار گلریں چاہتی ہیں کہ شوہر
 ہو تو ایسا ہو اس لیے کچھ پیسے
 دے کر اس کی خریداری کے لیے تیار ہیں
 رانی کے وقت بڑے بڑے حل گروہ
 والے بہادر اس کے خوف سے اس
 طرح کا پنتے ہیں جیسے سفیدہ کے
 درخت کے پتے۔

اگر سرخ پتھر پر تیر مارے تو اس
 کے اندر پیکاں تک دھنس جائے
 شکار کو چیرتا ہوا اس کا تیر باہر
 پرواز کرتا ہے یہ تو میں نے ایک بار
 نہیں سو بار مشاہدہ کیا ہے۔
 محمود نے اسے دل والہانہ پوچھی
 نہیں دیا تھا محمود کا دل لپٹا کچھ
 کھیل نہیں۔

یہ تو کہو کہ سلطان کے مقررین میں سے
 کوئی اس جیسا بھی تھا حالانکہ اس کے
 علاوہ سلطان کے پاس بیشار غلام تھے

یکے گوید کہ اُس مرد است بر کوہ
 وگر گوید گل تازست بر بار

زمان پارسا از شوی گردند
 بکابین کردنی او را خریدار

دلیراں از ہمیش روز کوشش
 ہی لرزند چوں برگ سپیدار

اگر بر سنگ خارا برزند تیر
 بسنگ اندر نشاندتا بسو نار
 بروں پر اندازہ پنجر ناوک
 من این حد بار دیدستم نہ یک با

نہ بر خیزہ برو دل داد محمود
 دل محمود را بازی پسندار

پھر او دو پیش سلطان نیز کس بود
 عبر او سلطان خلاماں داشت لبیا

اگرچوں میریک تن بود زامہا اگر ان میں سے کوئی امیر تمہا بھی
 نہ چندیں بر ادا تیز بازار تھا پھر بھی یہ گرم بازاری جو اسے وصل
 تھی اسے میر نہ تھی۔

حکیم فرخی کے اس قصیدہ کے اشعار سے واضح ہوتا ہے سلطان محمود
 کے دربار میں یوں تو ہزاروں غلام تھے مگر ایاز ہی ایک ایسی شخصیت تھی
 جو منظوم نظر تھی اور اس کے وجوہ بھی ہیں کہ حسن صورت کے ساتھ حسن سیرت
 کا بھی مالک تھا۔ فرخی نے پتہ کی بات کہی کہ سلطان محمود کا دل کچھ باز بچہ
 طفلان نہ تھا۔ ایسی ہی شخصیت جیسی ایاز تھی اسے ہاتھ میں لے سکتا تھا۔
 پندرہ لاکھ کا واقعہ ہے کہ سلطان مسعود ہندوستان میں ایک ہم کے

مہراجم میں الجھا ہوا تھا، غزنی میں اسیرانوشتین نے امرا و سلطان سے
 میدان خالی دیکھا، محمد براور سلطان مسعود کو تخت سلطنت پر بٹھا دیا۔
 نوشتین اور محمد کے حالات بعد وفات سلطان محمود، ہم بیان کر
 چکے ہیں۔ سلطان مسعود کو جب واقعہ کی اطلاع ہوئی ہندوستان سے
 مراجعت کی۔ پھوٹے بھائی نے اس عرصہ میں کافی جمعیت فراہم کر لی
 تھی۔ لڑائی میں مسعود شکست کھا گیا۔ محمد نے اسے مع اہل و عیال اسیر
 کر کے قلعہ کیلی میں بند کر دیا۔ اب سلطان محمد کے نام کا سکہ و خطبہ جاری
 ہو گیا۔ اس نے اپنے بیٹے احمد کے حوالہ امور سلطنت کر دئے۔ احمد نے
 سلطان مسعود کو قتل کر دیا۔ شہاب الدولہ مودود پسر سلطان مسعود
 اس وقت خراساں میں تھا باپ کے قتل کی خبر سنی تو غزنی پر فوج کشی کی لڑائی
 میں محمد نے شکست کھائی اور سلطان مسعود تخت و تاج پر قابض ہو گیا۔ ملک ایاز اس
 کے عہد میں بھی طبقہ امرا میں ممتاز و بھر پور تھا اور بقیۃ العرا من اور خوشحالی میں بسر کیا۔

۲۱۹

بوعلی سینا

ابوعلی الحسین المعروف ابوعلی سینا مشاہیر اعلام میں ممتاز مرتبہ کی شخصیت ہے۔ اس کے حالات مفصل ہم علیحدہ لکھیں گے، لیکن سلطان محمود غزنوی کا تذکرہ نامکمل رہ جاتا ہے اگر ان شخصیتوں کا ذکر نہ کیا جائے جو نہ صرف سلطان کے معاصرین تھے بلکہ کم و بیش ان کا تعلق براہ راست یا بالواسطہ سلطان سے رہا ہے۔ ان میں ایک ابوعلی سینا بھی ہے جسے اب تاجیکستان کہتے ہیں سکندریونانی کے دور فتوحات میں "باختر" (BACTARIA) سے موسوم تھا۔ دوسری صدی قبل از مسیح میں تاجیک قوم کی سلطنت کے حدود میں میائے اموں کی داویاں اور وسط ایشیا کا ایک حصہ جو ایک طرف ایران اور دوسری طرف چین اور افغانستان اور شمال مغربی ہندوستان شامل تھے۔ اس قوم نے سکندر اعظم کے جانشین سلوکس کی مملکت کا خاتمہ کر دیا۔ تاجیک قدیم الایام سے وسط ایشیا میں آباد تھے۔ عموماً مورخین ان کو ایرانی نژاد سمجھتے ہیں مگر میری ذاتی تحقیق یہی ہے کہ یہ لوگ ترک تھے۔ لیکن اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ ایرانیوں سے ان کا اختلاط قدیم ایام سے رہا۔

آٹھویں صدی عیسوی میں خلافت بنو امیہ فیتائے عروج پر تھی۔
 خلیفہ ولید بن عبدالملک کے ایک سپہ سالار "قتیبہ" نے یہ علاقہ مسخر کر لیا۔
 اس وقت "بدھمت" ان لوگوں کا قومی مذہب تھا۔ "بودھ" اسی نامی لفظ
 "بت" ایک ہی ہے۔ یہ بودھ مت کے پیرو جہاتما بدھ اور اسی مت کے
 بزرگوں کے بتوں کی پوجا کرتے۔ ان کا یہ عقیدہ تھا کہ جو بھی ان مورتیوں کو
 نقصان پہنچائے گا دندہ نہیں رہ سکتا۔ اگرچہ ایک دلیر جنگجو قوم تھی مگر
 بدھ مت کے اصل اصول دین "احمائیہ مودھرا" نے اس حد تک انہیں
 کمزور بنا دیا تھا کہ قوت مدافعت بھی مدب ہو چکی تھی۔ قتیبہ نے تکلف ادھر
 بڑھتا چلا آیا۔ اور بدھوں نے کہیں جم کر مقابلہ نہیں کیا۔ جب قتیبہ کو ان
 لوگوں کے مذہبی عقیدہ کا علم ہوا تو چند اکابر کو بلج کر کے ایک مندر کے
 بتوں کو شکست و ریخت خاطر خواہ کی اور ان کو سمجھایا کہ تمہارا عقیدہ بت
 پرستی فاسد ہے۔ وہ تو یقین کیے بیٹھے تھے کہ دوران شکست و ریخت
 ہیں آسمان سے اس مسلمان پر بجلی گرے گی یا ان کے جہانناؤں کا غضب
 کسی نہ کسی صورت میں اس پر نازل ہوگا۔ لیکن جب خلافت توجیح کچھ نہ
 ہوا تو آنا یقین ہو گیا کہ مسلمانوں کا دیوتا ہمارے جہانناؤں سے بھی
 بڑھ کر زبردست ہے۔ یہی یقین فرعون مسخرے کو بھی "یم نیل" میں غرق
 ہونے وقت ہوا اور کہا کہ میں موسیٰ اور ہارون کے خدا پر ایمان لایا۔
 اس وقت اضم پرستوں کے مختلف فرقے تھے اور آج بھی ہندوستان
 میں موجود ہیں اور اپنے اپنے دیوتاؤں کا تفوق دوسرے فرقہ کے
 دیوتاؤں پر جتانے ہیں۔ جب بودھوں کو یقین ہو گیا کہ مسلمانوں کا خدا
 سب دیوتاؤں سے بڑھ چڑھ کر طاقتور ہے تو اسلام قبول کر لیا۔

بنو امیہ کی خلافت کا یہ ایک خاصہ ہے کہ جہاں کہیں ان کا نشانہ
 قدم پڑا وہاں اسلام اور عربی زبان کی عم اشاعت ہو گئی یہی وجہ ہے کہ آج
 بھی ان کے مفتوحہ ممالک (مصر، ہسپانیہ) میں دین اسلام اور عربی کے
 عالم کثرت سے پاتے جاتے ہیں۔ وادی سندھ اور بلوچستان اور
 افغانستان اور تمام وسط ایشیا اور ایران میں خالص مسلم آبادی الٰہی خلافت
 کی سعی کی مرہون ہے۔ یہ بات ان کے بعد کسی حکمران کو نصیب نہ ہوئی
 الامام ثناء اللہ سلطان محمود غزنوی کی فتوحات کا سلسلہ بلاشبہ بہت وسیع
 تھا مگر غیر مسلم علاقہ جس نے اسلام قبول کیا صرف پنجاب تھا۔ اور ہندوؤں نے
 جن حالات کے تحت اسلام قبول کیا ہم بیان کر چکے ہیں۔ اس میں کچھ
 شک نہیں کہ جو بھی اسلام قبول کرتا خاص مراعات کا مستحق ہوتا مگر اس نے
 کسی کو اپنا آبائی مذہب چھوڑنے پر مجبور نہ کیا۔ اس کی اپنی فوج کے خاص
 دستے مذہباً ہندو و مہرم کے پیرو تھے اور اس کے جانشین سلطان مسعود
 وغیرہ کے لشکر کے دستے بھی ہندو تھے۔ افسران ہندو تھے اور پنجاب میں
 مختلف اضلاع پر اس کے نائب السلطنت بھی ہندو تھے۔
 خلفاء بنو امیہ کا نصب العین نہ صرف اسلام کی اشاعت تھی بلکہ عربی
 کے ذریعہ مختلف علوم و فنون کی ترویج بھی تھی چنانچہ ان ایام میں اور
 ہمارے ناز تک "بخارا، جو "ما جیک" قوم کا صدر مقام تھا علم و حکمت
 کا مرکز وسط ایشیا میں قائم ہو چکا تھا۔ یہ علاقہ اب سویت روس میں شامل
 ہو چکا ہے۔ "امی" "ما جیک" قوم کے ایک ممتاز خاندان کا ممتاز رکن "عبداللہ
 ابی سینا" تھا، اس کی رہائش بخارا کے نواح میں ایک قصبہ "افشار" میں
 تھی۔ اس وقت یہ تمام علاقہ "آل سامان" کے قبضہ میں تھا۔ عبداللہ ابن سینا

سامانی سلطان نور ثانی ابن منصور (۳۵۰ھ) کے ہاں ملازم تھا۔
 یہی وہ آل سامان ہے جس کی قریح کا سپہ سالار الپتگین تھا۔ اور اسی الپتگین
 کا داماد سبکتگین تھا جس کا نامور بیٹا سلطان محمود غزنوی ہے۔

بوعلی سینا افشار میں ۳۶۵ھ میں پیدا ہوا۔ ایک ہزار سال کا
 عمر گذرتا ہے کہ سویٹ روس میں عالمگیر انجمن امن (WORLD

PEACE COUNCIL) نے بوعلی سینا کی برسی منائی۔ ۱۹۵۲ء میں اس تقریب پر
 جو کچھ اس اویب اور حکیم اور طبیب اور ہیئت دان اور علم دین اور فلسفی کی نسبت
 کہا گیا اس کے لیے ایک دفتر درکار ہے۔ مختصر یہ کہ یہ شخصیت ان مٹا ہر
 میں سے ہے۔ جن کے افکار عالیہ نے عالم السانی کی ذہنی لحد مادی ترقی کو
 چار چاند لگا دیئے۔ اور یہی وہ برگزیدہ بستیاں ہیں جو امن لحد علوم و
 حکمت کی علم بردار تھیں، اس وقت دنیا اسلام جس دور سے گذر رہی ہے وہ
 ایک عظیم الشان "ذہنی انقلاب کی نبرد سے رہا ہے۔ اور یہ انقلاب
 جس سے یورپ گذر چکا ہے بوعلی سینا جیسی شخصیتوں نے پیدا کیا تھا۔ یورپ
 نے تو ان بیگانوں کو اپنایا اور خاطر خواہ اٹھایا لیکن بوعلی وغیرہ حکماء اسلام
 کی آزادی فکر، علماء دین نے برداشت نہ کی۔ اور اسے الحاد کفر سے مہتم
 کیا اس کا جواب بوعلی نے ایک شعر میں دیا کہ

در دہریکے چو من ادرم کافر پس در دہر کے سماں بنود

ان ایام میں بخارا نہ صرف علم و حکمت کا مرکز ہی تھا بلکہ وسط ایشیا میں تجارت
 اور صنعت و حرفت میں اس کا جواب نہ تھا۔ بوعلی سینا کی تعلیم و تربیت
 کا فخر بھی اسی شہر کو حاصل ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ
 ہر کے را بہر کارے ساختند الفستق را در دلش انا ختمند (مسلم)

اگر ہر ایک شخص اسی کام میں لگ جائے یا لگایا جائے جس سے اس کو فطری
 لگاؤ ہوتا ہے تو علم انسانی کی ذہنی اور مادی ترقی تھوڑے عرصہ میں اس
 مقام پر پہنچ سکتی ہے جو انسان کی تخلیق کا فطری مقصد ہے لیکن اس کو
 وہاں پہنچنا ضرور ہے۔ مگر بعد از ہزار رسوائی و بربادی ہے کہ ہر ایک دور
 میں چند نفوس ہی ہوتے ہیں جو تقاضا فطرت کو پورا کرتے ہیں اور
 اکثریت کی پست ذہنیت ان کے ذہنی مرتبہ سے معاشناس نہیں ہوتی
 اور صدیوں بعد پہچانتی ہے جب ایسے اشخاص کی ذہنیت کی سطح
 تک صدیوں بعد آتی ہے، ایسی ہی شخصیت ایک بوعلی سینا بھی تھی،
 چھوٹی سی عمر میں علم و حکمت سے شغف کا یہ عالم تھا کہ اس نے طالب علمی
 کے زمانہ میں نیند اپنے اوپر حرام قرار دی تھی۔ رات کے وقت ایک شمع
 اس کے سامنے ہوتی۔ اور کتاب اور گوشہ خلوت، اصل اصول تعلیم اس
 نے یہ مقرر کر رکھا تھا کہ "علم در جلد خویش پاد نہ در چرم پیش" اس
 لیے جو بات مطالعہ کتب کے وقت اس کی توجہ جذب کرتی ازبر کرتا۔
 ان ایام میں نصاب تعلیم میں اول فقط قرآن اور زبان عربی تھی۔
 بوعلی سینا کی قوت حافظہ کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ قرآن مجید
 ڈیڑھ سال میں حفظ کر لیا۔ عربی پر اس کو جس حد تک عبور تھا وہ اس
 کی تصانیف سے واضح ہو سکتا ہے۔ علم ادب عربی میں بھی استادوں
 سے گونے سبقت لے گیا۔ علم ہیئت کی طرف خاص توجہ تھی اس کے
 علاوہ ریاضی اور تفسیر جس میں علم منطق نمایاں تھا اور دینیات تو خاص
 موضوع تھا۔ مگر ابن سینا کی توجہ طب کی طرف زیادہ مائل تھی۔ بلاشبہ
 وہ علم مردوبہ کا مالک تھا مگر علم طب کی وجہ سے جو شہرت اسے حاصل

ہوئی وہ نہ صرف اپنے زمانہ بلکہ آج تک قائم رہے۔ سولہ برس کی
 عمر تک وہ سب علم مرویہ پر جاری ہو چکا تھا۔ یہ حقیقت بھی ابھی طرح
 ذہن نشین کرنی چاہئے کہ خلافت اسلامیہ اتنا عت علم و حکمت میں ہمیشہ
 فراخ دل رہی ہے۔ جو ہمارے زمانہ میں مسیحی یورپ اور امریکہ کو بھی
 نصیب نہ ہوئی۔ اس موضوع پر ہم نے اپنی کتاب مشاہیر اسلام (مطبوعہ
 ۱۳۲۶ھ) میں کافی بحث کی ہے۔ ان ایام میں قلمی نسخے ہی خلفاء اور سلاطین
 کے کتب خانوں میں تھے۔ آل سامان نے جو کتب فراہم کی تھیں ان کی تعداد
 بھی ہزاروں تھی۔ لورڈ بوعلی کی خوش قسمتی تھی کہ یہ کتب خانہ اس کے زیر نگرانی
 تھا۔ یونانی فلسفہ میں جو کتب افلاطون اور ارسطو وغیرہ کی تصانیف تھیں
 ان کا عربی ترجمہ ہو چکا تھا۔ اور مشہور اسلامی شہروں کے کتب خانوں میں
 ان کے نسخے موجود تھے، بوعلی سینا کو یہ سب ازبر تھے۔ یونانی حکماء کی تصانیف
 پر حکماء اسلام نے شرح بھی لکھی۔ اور بعض حکماء نے ان کے اغلاط بھی واضح
 کئے۔ بوعلی سینا نے بھی ان کی غلطیاں نمایاں کیں اور اپنا نظریہ پیش کیا
 حکیم الرازی (۱۰۲۵ھ) کے مقالات پر بھی ابن سینا نے شرح لکھی اور
 بعض مقالات پر اختلاف بھی کیا۔ اس نے نظم و نثر میں اپنی تصانیف لکھیں،
 نظم میں منظومہ مشہور ہے۔ نثر میں اس کی تصنیف "کتاب الادویات
 التعليمات" اور کتاب التبعین، اور کتاب التولیع، وغیرہ چھوٹے چھوٹے
 رسالے ہیں۔ لیکن علم طب میں جس تصنیف نے اسے غیر فانی شہرت
 دی وہ اس کی "کتاب القانون فی الطب" اور کتاب الشفاء اور نبات
 اور اشارات، اور دانش نامہ ہیں۔ آخر الذکر کتاب اس نے قدسی میں
 لکھی۔ باقی تمام کتب عربی میں ہیں یہی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ عربی

ان ایام میں دنیا و اسلام میں کتنی مقبول ہو چکی تھی۔

آل سامان کے دربار میں علماء و حکماء کثرت سے موجود تھے۔ ان میں سے بوعلی ابن سینا اور ابوریحان بیرونی خاص شخصیتیں تھیں۔ ہر ایک حکمران پر چاہتا تھا کہ اس کے دربار کی زینت ہمعصر مشاہیر کی موجودگی سے ہو۔ وہ خود بھی علم و دست تھے اور انہی کی سرپرستی میں علم و حکمت کی اشاعت بھی ہو رہی تھی۔ ان ایام میں آل سامان کی حکومت میں نمایاں ضعف اچکا تھا، ہدایہ امرا کی رقابت نے آخر اس کا خاتمہ کر دیا۔ اور یہ سلطنت غزنوی حکومت کے تحت آگئی۔ سلطان محمود کی نظر ان علماء و حکماء پر تھی جو دربار آل سامان کی شہرت کا موجب تھے۔ کہتے ہیں عین ذوالحجہ میں جن سے انسان پاتا کوئی مقصد حاصل کر سکتا ہے، زور یا زاری یا زاری، زاری تو سلطان محمود کے حالات سے بعید تر تھی۔ البتہ زور اور زور صرف کیا۔ ابوریحان بیرونی وغیرہ تو زور و زور کی قوت سے مرعوب ہو گئے مگر بوعلی سینا پر یہ جادو نہ چلا۔ بات اصل یہ ہے کہ بوعلی سینا کی "آزادی فکر" کچھ مطلق انسان واقع ہوئی تھی۔ اور سلطان محمود کو مسلمان تھا۔ بوعلی سینا نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ سلطان سے بگاڑ ویر سویر ضرور ہو گا تو اس کی جان کی بھی خیر نہیں۔ اس لیے آبائی وطن کو خیر باد کیا اور ہرجان میں آیا، بحیرہ دمیض کے مشرقی کنارہ پر یہ حلاقہ واقع ہے یہاں اس نے طبابت جاری رکھی مگر ارادہ گنہی کی حالت میں رہا مگر تھوڑے عرصہ میں اس کا دست شفا آنا مشہور ہوا کہ سلطان ہرجان نے اپنے برادر زادہ کے معالجہ کے لیے اسے طلب کیا۔ علاج کامیاب رہا تو سلطان کا منظور نظر ہو گیا۔ سلطان محمود کو بھی اطلاع ہوئی کہ جناب حکمت ناب ہرجان میں براجمال

میں عالمی ہرجان کو لکھا کہ یوعلیٰ کو دربار غزنی میں بھیج دو۔ اب عالمی ہرجان
 کی بھی آنکھیں کھلیں کہ اس کا وہابی طبیب ہی یوعلیٰ سیاہیے۔ اس نے
 سلطان محمود کو لکھا کہ آپ کے دربار میں تو منتجب روزگار موجود ہیں یوعلیٰ نہ
 ہوا تو کمی واقع نہ ہوگی میرے پاس لے دئے کے ایک یہی ہے اس
 لیے یہ میرے پاس ہی رہنے دیں۔ مگر بدقسمتی سے یوعلیٰ کا سر پرست
 امراء دربار کی سازش کا شکار ہوا اور مارا گیا۔ چنانچہ عالمی ہرجان نے
 سلطان محمود کا اقتدار تسلیم کر لیا یوعلیٰ اس سے پیشتر ہرجان سے ترے
 میں نقل مکانی کر چکا تھا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد ترے "دوارح تہران" بھی محمودی
 سلطنت میں شامل ہو گیا تو یوعلیٰ ہمدان میں چلا گیا۔ عالمی ہمدان شمس الدولہ تھا،
 اس نے یوعلیٰ کو وزارت پیش کی یوعلیٰ سے یہ خطی ہوئی کہ وزارت قبول
 کی۔ فطرت نے اس کو سیاسیات کی گفتی سلجھانے کے لیے نہیں بنایا تھا
 وہابی امرا کی رقابت اور سازشوں کے جال میں یہ خود بھی الجھ کر رہ گیا
 شمس الدولہ کی وفات کے بعد اس کے بیٹے کو امراء نے یوعلیٰ کی طرف
 سے بدظن کر دیا۔ الزام یہ تھا کہ یوعلیٰ عالمی اصفہان ابو جعفر علاء الدولہ سے
 ساز باز کر رہا ہے۔ بدقسمتی سے والی ہمدان اور علاء الدولہ میں لڑائی بھی
 شروع ہو گئی۔ یوعلیٰ کو جیل میں ڈال دیا۔ مگر خوش قسمتی سے علاء الدولہ نے
 ہمدانی فوج کو شکست دی اور یوعلیٰ کو بھی قید سے نجات ملی۔ اور علاء الدولہ
 اسے اپنے ساتھ اصفہان میں لے گیا اور اب یوعلیٰ کو بھی تلخ تجربہ کے
 بعد ہوش و حواس کے فتویٰ پر عمل کرنا پڑا۔ سیاسیات سے بالکل علیحدہ
 ہو کر اس نے امن اور سکون کے ساتھ اپنے افکار عالیہ کو قلم بند کیا۔
 اصفہان آخر سیاسی سازشوں کی جگہ تھی۔ کابل سکون کے لیے اس نے

ہمدان ہی کی رہائش پسند کی۔ یہاں اس نے درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری کر دیا۔ اور یہی ایک کام ایسا تھا کہ جس نے اس کے نام کو زندہ رکھا۔
 دو واسطہ سے ابو نصر محمد انفار ابی اس کا شاگرد ہے۔ اس کے شاگردوں کی فہرست طویل ہے۔

۱۱۲۸ھ میں ۵۸ سال کی عمر میں ہمدان ہی میں فوت ہوا۔ اور یہاں اس کی قبر موجود ہے۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زہد شد بعشق ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

بوعلی سینا کی تصانیف کی تعداد تین سو ہے، ابن سینا غالباً پہلا شخص ہے جس نے "جراثیم" کا نظریہ امراض میں واضح کیا۔ اس کا نظریہ یہ ہے کہ ہمارے گرد و پیش ہوا اور پانی کے ذریعہ جراثیم امراض پیدا کرتے ہیں۔ صحت کے بارہ میں اس کا نظریہ یہ ہے کہ بیماری کا علاج صرف دواؤں سے نہیں ہوتا۔ بلکہ بیماری کے اسباب کا سدباب کرنا چاہئے۔ اور کھلی اور صاف ہوا میں ورزش بھی ایک محبوب نسخہ ہے۔ "کشف ثقل" جو بوعلی سینا کی وفات کے چھ سو سال بعد نیوٹن سے منسوب کی جاتی ہے۔ بوعلی ہی نے پہلے دریافت کی۔ اور اس موضوع پر نیشاپور میں حکماء کے ساتھ اس کا مباحثہ بھی ہوتا رہا۔

بوعلی سینا کی حکمت اور طبابت کے متعلق اتنے افسانے مشہور ہیں کہ اگر ایک جامع کئے جائیں تو ایک دفتر مرتب ہو سکتا ہے۔ کہتے ہیں کہ بوعلی تے پچالیس دوائیاں ایسی اختراع کی تھیں کہ ان کے ذریعہ مردہ زندہ اور بڑھا بھان ہو سکتا ہے اور اس کا راز اس نے اپنے ایک شاگرد کو بتایا تھا۔ اور ہر ایت کی نفی کہ سبب میں مر جاؤں تو یہی ادویہ جو مرہم کی

کی صورت میں تھیں میرے جسم پر ملنا۔ چنانچہ شاگرد رشید نے عمل کیا
 جوں جوں شاگرد ایک ایک مرہم لگاتا بوعلی کا جسم تو انا اور تندرست محسوس
 ہوتا۔ آخر ایک خوب صورت نوجوان کی صورت میں تبدیل ہو گیا۔ لیکن
 ابھی تک جسم میں زندگی کے آثار محسوس نہ ہوئے، اب صرف ایک ہی
 مرہم کا عمل باقی رہ گیا تھا۔ لیکن بوعلی کی لاش پر مرعٹ سے جو حیرت انگیز
 تغیر واقع ہو رہا تھا اس نے شاگرد کو مبہوت کر دیا۔ آخری شبیہ ہاتھ سے
 لے کر چور چور ہو گئی۔ اور وہاں بھی صنایع ہو گئی۔ اس لئے بوعلی دوبارہ زندہ نہ
 ہو سکا، یہ قصہ مشہور تو بہت سے مگر وہی بات کیا گروں کی ہے کہ
 ایک اونچ کی کسر باقی رہ گئی۔

خواجہ شمس الدین محمد

حافظ شیرازی

آں کس کہ گفت قصہ باہم زماش میدا

خواجہ شمس الدین محمد حافظ علیہ الرحمۃ کے سوانح حیات کسی تذکرہ میں اس سے زیادہ نہیں ہے کہ آپ شیرازہ میں پیدا ہوئے۔ یہیں پر وقا کہ ہوئے۔ البتہ آپ کے شعر و شاعری پر کم و بیش بعض تذکرہ نویسوں نے بحث کی ہے، بات بھی یہی ہے کہ حقیقی شاعر کی زندگی ان واقعات سے مبرا ہوتی ہے جو سکندر دارا کو پیش آئے۔ اشعار ہی ان کے افکار عالیہ کے آئینہ دار ہیں اور اسی آئینہ میں ان کی صورت اور میرث کا مشاہدہ ہو سکتا ہے۔ خواجہ حافظ خود فرماتے ہیں کہ سے

ماقصہ سکندر و دارا نخواستہ ایم از من بجز حکایت مہر و وفا میرس

قصہ سکندر دارا تو آپ نے ضرور پڑھا ہو گا۔ مولانا نظامی گنجوی نے سکندر نامہ بری و بکری لکھا اور آپ نظامی کی شاعری کے مداح ہیں شاہنامہ فردوسی بھی ضرور آپ کی نظر سے گذرا ہو گا۔ فردوسی اپنی دوسری تصنیف یوسف زلیخا میں اس محنت کے ضائع ہونے کا افسوس کرتا ہے کہ ایسا کلام جو محض فسانہ ہو اور فسانہ بھی جھوٹ کا طومار اس لائق نہیں کوئی عقلمند اسے سخن کی تعریف میں داخل سمجھے اور یہ بھی کہاں کی عقلمندی تھی کہ

یکے نیمہ از غم خود کم کنم جہانے پر از نام رستم کنم
 شام نام کا "ہیرو" رستم ہے۔ فردوسی نے عمر کا بہترین حصہ نصف رستم
 کا نام اچھا لےنے میں صرف کر دیا۔ سلطان محمود کے دربار میں پیش کیا تو
 "یہیں الدولہ امین اللہ" نے چیں بجیں ہو کر کہا کہ تو نے اپنی خدا داد قابلیت
 پر جتنا ظلم کیا ہے اس کا افسوس مجھے ہے، کیا تجھے خلافت راشدین اور
 سلاطین اسلام کے کارناموں میں ذمہ نظم کا موضوع نہیں مل سکتا تھا۔ یہ
 گہروں کے افسانے جن کی تاریخی سند بھی نہیں ایک ایسا شخص جو دعویٰ مسلمان
 بھی کرتا ہے کبھی لکھنا پسند نہیں کرے گا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی شخص نے طنزاً کہا ہو گا کہ خواجہ غزول تو اچھی
 کہتا ہے مگر وہ بات کہاں جو نظای اور فردوسی کی ذمہ نظموں میں ہے۔ یہی
 طعن کسی نے شیخ سعدی کے کلام پر بھی کیا۔ شیخ علیہ الرحمۃ نے دو مین
 مختصر ذمہ لکھ کر جواب تو دیا مگر ساتھ ہی یہ بھی عذر پیش کیا کہ
 ندانی کہ مارا سر جنگ نیست دگر نہ مجال سخن تنگ نیست

یہ صحیح کہ شیخ غزول میں اپنی طرز کا موجد ہے اور کوئی شاعر غزول گوئی کے
 میدان میں آپ کا مقابلہ نہیں کر سکتا اور آپ کی قادر الکلامی نظم و نثر میں
 مسلم ہے مگر ذمہ نظم کے مناسب آپ کی طبیعت واقع نہ ہوئی تھی۔
 قصیدہ گوئی ان اہم میں ایک ایسا فن سمجھا گیا تھا کہ اصناف شعر میں جس کو
 اس میں کمال حاصل ہوتا وہ مستند استاد سمجھا جاتا ہے، قصیدہ میں شاعر
 نہ صرف مدوح کے اوصاف بیان کرتے ہوئے زمین و آسمان کے تلابیے
 ملاتا بلکہ تعجب میں اپنے تخیل و افکار کی بلندی کا بھی اظہار کرتا۔ شیخ سعدی
 نے اکثر قصائد لکھے۔ وہ مدوح کے بعض اوصاف حسنہ کی طرف اشارہ بھی

کہتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی پند و نصائح کا دفتر بھی کھول دیتا ہے۔
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قصیدہ گوئی سے اس کی غرض ہی یہ تھی کہ امراء و وزراء
و ملوک کو ان کے فرائض منصبی اور مذہبی کی طرف توجہ دلائے۔

شیخ سعدی نے دو تین مختصر نذمیں یعنی حاسدوں کا منہ بند کرنے کے
لیے لکھیں لیکن خوابہ انابی کہہ کر خاموش ہو گئے کہ "ما قصہ سکند دارا نخواستہ ایم
از من بجز حکایت مہر و وفا پیرس۔ یہ سکند دارا کیا بلا تھے کہ رکھ پ گئے
اور ناکردہ گناہ لوگوں کے خون سے ہاتھ رنگے، لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم
رکھا، تمام عمر داد عیش دیتے رہے وہ شاعر کتنی پست ذہنیت رکھتے
ہیں جو اپنی کہ گن گاتے ہیں اور اپنی کے ذکر میں لگے ہوئے۔ حالانکہ
ان سے کسی صلہ کی توقع بھی نہیں۔ البتہ انسانیت کے شایاں "مہر و وفا
ہے انسان منی الطبع ہے اور ہر ایک ذہنی اور مادی ترقی اس کے تمدن
اس کی شہری زندگی میں باہمی تعاون یعنی "مہر و وفا" سے ممکن ہے۔
خوابہ حافظ کہتے ہیں کہ اس مہر و وفا کے بارہ میں اگر کچھ پوچھنا ہو تو مجھ
سے پوچھو، مگر یہی بات ہے کہ پست فطرت عوام کا لالچم کو نہیں بھائی۔ ان
کو قصہ سکند دارا میں ہی مزا ملتا ہے۔ یہ حکایت "مہر و وفا" خوابہ حافظ
اپنی دلاویز نظم اور مخصوص انداز میں بیان کرتے ہیں یہ حکایت خوابہ
کی "آپ بیتی" ہے اس لیے آپ کی زبان ہی سے آپ کی کہانی سنی
جائے تو لطف ہے اس لیے فرماتے ہیں کہ
"اں کس کہ گفت قصہ ماہم زما شنیدہ"

شیراز

خواجہ محمد حافظ کا مولد شیراز ہے۔ اسی خاک تیراز سے شیخ سعدی
رحمۃ اللہ علیہ پیدا ہوئے اور دیگر اکابر کا بھی مولد ہے اس لیے یہ کہنا
چاہئے کہ سرزمین شیراز کا بھی کچھ طبعی اثر ہے جس نے سعدی و حافظ
سے شعرا پیدا کیے۔ ایک حساس انگریز سیاح کہتا ہے کہ شیراز کی آب و ہوا
میں شاعری کا نشہ ہے۔

یہ ایک اسلامی شہر ہے، خواجہ حافظ کا معصر اور ہم شہر احمد بن
ابی الخیر اپنی کتاب "شیراز نامہ" ملاحظہ میں جیسا کچھ یہ شہر تھا اس کی تعریف
و توصیف میں رطب اللسان ہے کہ زبدہ ممالک دوائے زمین ہے۔
بلکہ زہت نامہ ہمیشہ بریں ہے۔

ممنظر خاک آن چوں حمیب عطا مصغی آب آن چوں اشک و امت

نیسے خوش کند چوں عمر ناداں ہوا کی ترصفت چوں دیں فاسق

بچپن بڑھکین نادانی کی عمر بھی خوش خوش گند جاتی ہے وہ تفکرات لغت اندر
جو بلوغ میں اہل عقل محسوس کرتے ہیں نافعان نہیں کرتے اور

فاسق کا دامن معیشت سے تر ہوتا ہے اسی طرح

دونوں باتیں نسیم اور ہوائے تر میں پائی جاتی ہیں۔

حاجی زین العابدین خیر والی اپنی کتاب "لسان البیاحت" میں اپنے

سفر ۱۲۱۷ھ کے حالات میں شیراز کے بارہ میں کہتا ہے کہ "محمد بن القاسم

بن عقیل ابن علم حجاج بن یوسف ثقفی نے سلطنت میں یہ شہر بسایا،

محمد الدولہ ابن منرال دولہ دیلمی نے ابو خلیفہ و خلافت عباسیہ پر بچایا ہوا تھا

اسے اور دوست دلی، اور اس کے قبیلہ رخ ایک اور قصبہ کا اصناف کیا
 جس کا نام "فنا خسرو گروہ رکھا، کہتے کہ یہ قصبہ اتنا آباد تھا کہ اس کا مالہ
 بیس ہزار دینار تھا۔ لیکن اب اس کے آثار مٹ چکے ہیں، صمصم الدولہ
 نے شیراز کے گرد ایک فصیل تعمیر کی لیکن نفاذ کی دستبرد سے منہم ہو گئی۔
 شرف الدین محمود انجو نے اس کی دوبارہ تعمیر کی، یہ بھی خراب و خستہ ہو گئی
 شاہ شجاع بن مبارز الدین محمد بن مظفر نے پھر تعمیر کی، یہ بھی نہ رہی "کرم
 خان زند نے (جو خاندان صفوی کے بعد شاہ ایران ہوا) ایک قلعہ مضبوط
 بروج سے مستحکم تر تعمیر کیا۔ آقا محمد خان بن حسن خان قاجار نے اس کو گرا
 دیا۔ حسین قلی خان برادر شاہ قاجار نے فصیل تعمیر کی، زلزلہ نے اسے بھی نہ چھوڑا۔
 لیکن خواجہ حافظ کے زمانہ میں شیراز ان اقامت سے مصئون و مامون تھا
 آپ شیراز اور اس کے مناظر کے بارہ میں ارشاد فرماتے ہیں کہ :-
 خوش شیراز و وضع بے مثالش خداداد نگہدار از زوالمش
 شیراز کیا ہی اچھا شہر ہے اور اس کی وضع سے کوئی اور شہر لگا نہیں کھاتا۔
 وعلیہ کہ اللہ تعالیٰ اس کا نگران حال ہوتا کہ وہاں سے محفوظ رہے
 درکنار آباد ماحد لومش اللہ کہ عمر خضریٰ بخشد زلالش
 دہرہ دکن آباد پر اللہ کی سوسو برکتیں نازل ہوں کہ سینکڑوں تحبیب و افریب
 کا مستحق ہے اس لیے کہ اس کا بیٹھا پانی خضر کی کمر بخشتا ہے۔ یعنی اس
 میں اب حیات کی تاثیر ہے۔
 میاں جعفر آباد و معلیٰ عبیر آمیزی آید شمالش
 جعفر آباد اور معلیٰ کے درمیان باد شمال کے جھونکے خوش بو سے لڑے
 ہوئے آتے۔

بشیر از آلی و فیض روح قدسی بخواہ از مردم صاحب کمالش
 شیراز میں اور روح القدس کا فیض یہاں کے باکمال ہستیوں سے طلب کر
 کہ نام قند مصری برد آنجا کہ شیریناں ندادند انفعالش
 قند مصر کا نام اگر کسی نے یہاں لیا تو یہاں کے شیروں لب حینوں نے اسے
 سخت مخرندہ کیا ہے۔

صبا ذرا لونی شگول مرست چہ داری اگہی چوں است حالش
 اے صبا اگر تجھے اس رقامہ شوخ و ظریف نشہ حسن میں سرشار کے حال کی
 کچھ خبر ہے تو مجھے بھی بتا کہ کس حال میں ہے۔

مکن بیدار ازیں خوابم خدارا کہ دارم عشرتے خوش باخیالش
 اے نیم عمر مجھے چھیڑ کر بیدار نہ کر کیونکہ میں اس کے تصور میں مرست ایگز
 عشرت میں ہوں۔

ان اشعار میں رکن آباد اور جعفر آباد لہد مصلی کا تذکرہ ہے اور ساتھ
 ہی شیراز کے باکمال لوگوں لہد بالخصوص کسی حین صورت کا بھی ذکر ہے
 جس نے خواجہ حافظ کی توجہ کو جذب کر رکھا تھا۔

ایک لہد مقام پر کہتے ہیں کہ

بہ سانی سے باقی کہ در جنت نغہای قبت کد آب رکن آباد و گلگت مصلی ما

اے ساقی شراب جو کچھ بھی باقی ہے دے دے کیونکہ جنت میں نہر رکن آباد
 کے کنارے لہد مصلی کی گلگت تو نہیں ہوگی۔ اس لیے ان دونوں کی موجودگی
 کے ساتھ جو کچھ سے نوشی کا لطف ہے باغ جنت میں میسر نہ ہوگا۔ اس
 لئے ہر وقت نوشی کہ دست دید منتقم شمارہ

ایک لہد جبکہ شیراز کے ایک خاص دلکش منظر کا ذکر کرتے ہیں کہ

وقت ذاب خمر کہ ظلمات جلتے آتے تھے تا آب ما کہ منعمش اللہ اکبر است
 اب خمر یعنی چشمہ آب حیات کی نسبت روایت ہے کہ "ظلمات" دگر ظلمات
 کے کسی جزیرہ میں ہے، شیخ سعدیؒ بھی فرماتے ہیں "کہ اب چشمہ جیواں
 اردن تاریکی است"۔ خواجہ حافظ کہتے ہیں کہ اب حیات جسے بی کر خمر
 تا قیامت زندہ رہے گا اس میں لود ہمارے پینے کے پانی میں بہت
 زرق ہے۔ اب حیات کا چشمہ تو ظلمات میں ہے۔ لود ہمارے پانی کا منبع
 "اللہ اکبر" ہے، کجا و نیوی زندگی اور کجا فنا فی اللہ و بقا ما بعد،

رکن آباد یا آب کنی کے وصف میں ایک شعر اور بھی ہے۔
 شیراز و آب کنی و آں باو خوش نسیم عیش کن کہ خالی رخ بہت کشور است
 شیراز اور نہر رکن آباد اور نسیم کے فرحت افزا بھونکے ایسی باتیں نہیں کہ
 کل ان کا عیب بیان کرے لہذا اگر کسی کی نظر میں خال سیاہ روشن چہرہ
 پر عیب ہو تو نظر بد کے لیے اس کی موجودگی واجب ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے
 کہ خوب صورت چہرہ کے حسن کو حال نہ صرف نظر بد سے بچاتا ہے بلکہ
 اس کی خوبی کو دوبالا بھی کرتا ہے۔

نسیم باو مصلی و آب رکن آباد غریب را وطن خویش میر و از یاد
 مصلی کی ہوا کے بھونکے لود رکن آباد کے پانی کی روانی ہر ایک کو جو یہاں
 مسافرانہ لود ہو اپنے وطن کی یاد بھلا دیتی ہے۔ وطن کی محبت ہر ایک
 شخص کو ہوتی ہے مگر نسیم مصلی اور نہر رکن آباد میں وہ کشش ہے کہ ہر ایک
 جو اپنے وطن سے بچھڑا ہو اسی کو اپنے وطن پر تریح دے کر یہاں مقیم
 ہونا پسند کرے گا۔

عماد فقیر کرمانی کہتا ہے کہ

نوٹا ہولے مصلیٰ و آب رکن آباد کہ آں مضرخ جاں دیں مصلیٰ دل با
 نہر رکن آباد کو رکن الدولہ حسن دیلی دو پہاڑوں کے درمیان سے شیراز
 سے دو تین میل کے فاصلہ سے کھدوا کر لایا تھا۔ اس کے منبع کو جو ان
 پہاڑوں میں واقع ہے "تنگ اللہ اکبر" کہتے ہیں، رکن الدولہ کی وفات
 ۱۲۳۶ھ میں واقع ہوئی۔ یہ نہر شیراز کے باغ مصلیٰ اور باغ جہاں اور
 باغ نو اور تکیہ بفت شان اور چیل شان اور حافظیہ کو سیراب کرتی تھی۔
 لیکن اب اگرچہ نہر موجود ہے مگر پانی کی اس میں اتنی کمی ہے کہ مشہور
 ہے کہ اگر اس کے پانی سے بے وضو تازہ کرے تو ختم ہو جاتا ہے۔

خاک مصلیٰ

مصلیٰ کی زمین اسی نہر رکن آباد سے سیراب ہوتی تھی۔ یہ خاک اس
 لیے بھی مبارک ہے کہ خواجہ حافظ کا مدفن یہاں ہے۔ آپ کی وفات
 کی تاریخ بھی حسن اتفاق ہے "خاک مصلیٰ" دہلی سے نکلتی ہے
 یہ تاریخ مولانا جامی نے بھی لکھی ہے۔

چراغ اہل معنی خواجہ حافظ کہ شمس بود از نور تجلی
 چو در خاک مصلیٰ یافت منزل بگو مار بخش از خاک مصلیٰ

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں (مفوضات) کہ
 ایک روز میرے والد شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے روزو ایک
 شخص نے اپنا حال بیان کیا کہ شیراز میں سیاحت کے دوران میں وارد
 ہوا۔ خواجہ حافظ علیہ الرحمۃ کی قبر شہر سے باہر واقع ہے اکثر رند اور
 میزار اس جگہ جمع ہوتے ہیں۔ خواجہ خود فرما چکے ہیں کہ

بدست تربت ماچوں گزری بہت خواہ کہ دیار نگہ اندازے جہاں خواہد بود
 دہمت « اصطلاح تصوف کی ہے۔ مراد یہ ہے اوپر متوجہ ہو گا تو تجھے
 فیض حافظ سے تقویت روحانی ملے گی، اور میری تربت کی دنیا جہاں
 کے رند زیارت کیا کریں گے۔

یہ لوگ اس جگہ بیٹھ کر شراب نوشی کرتے ہیں کہ محفل سدا مسرود
 بھی گرم رکھتے ہیں، خواجہ حافظ کا ارشاد بھی ہے کہ

بدست تربت من بے مطرب نشیں تا بہوت ز لحد رقص ناں بر خیرم

دیمیری قبر شراب اور مطرب کے بغیر مت بیٹھ، تاکہ شراب کی بواہر گویے
 سہیلی اور ریلی آواز کا اثر مجھ پر بھی ہو اور میں قبر سے وجد کرتا ہوں انکوں
 ہم تک ان لوگوں نے محفل گرم رکھی، آخر گھروں کو لوٹے، میں مسافر تھا۔
 کہاں جاتا یہیں شب باش ہوا۔ اور کہا کہ خواجہ صاحب آج میں آپ
 کا ہمان ہوں۔ بھوکا ہوں اور خرچ راہ بھی نہیں۔ پھر شب سے کچھ زیادہ
 گند چکا تھا۔ کہ رات کی تاریکی میں دیکھا کہ ایک مشعل میری ہی طرف ہوا
 میں متعلق آ رہی ہے۔ خوف زدہ ضرور ہوا۔ پھر دل کو کڑا کر کے انتظار کرنے
 لگا۔ دیکھا کہ ایک شخص کے سر پر تاج ہے اور دو کمرے کے ہاتھ میں
 مشعل ہے، جب دونوں قریب آئے تو مشعل والے نے باواز بلند کیا
 کہ ہمان حافظ کہاں ہے۔ میں ایک کوزہ میں دیکھا بیٹھا تھا جواب دیا کہ
 میں ہوں۔ کہا کہ میں سویا ہوا تھا خواجہ حافظ کو خواب میں دیکھا کہ مجھے
 مخاطب کر کے فرماتے ہیں کہ ایک شخص میرے ہاں میرا ہمان ہے بھوکا
 بھی اور زاد راہ بھی نہیں۔ میں طعم حسب معمول تقسیم کر چکا تھا مگر خوش قسمتی
 سے کچھ بچ رہا، حاضر ہے اور یہ پانچ اشرفیاں داد ماہ ہیں۔

سوانح حیات حافظ

ہم بیان کر چکے ہیں کہ خواجہ حافظ حقیقی شاعر تھے
اور اس طبقہ کے لوگوں کا اعلیٰ زندگی میں بہت

کم حصہ ہوتا ہے اور مزدور و عمل کے مناسب ملتی ہے۔ اس لیے شعرا کو ہمیشہ
تعلیٰ معاش کی شکایت رہی ہے۔ چنانچہ خود ارشاد فرماتے ہیں

فلک محروم سقہ معدوم مراد تو اہل دانش و فضل بھی گناہت پس

آسمان تو کینہ لوگوں کی پرورش کرتا ہے، تو اہل دانش اور فضل ہے تیرا یہی

گناہ کافی ہے کہ تجھے خوار و خست بنا رکھا ہے، بات اصل میں یہ ہے کہ

کسی کی دانش اور فضل سے کسی کا پیٹ تو نہیں بھر سکتا، شعرا کا کلام خواہ

کتا ہی بلند پایہ ہو آخر پائیں ہی تو ہیں اور باتوں کے لٹو سے نیک پروردی

ممكن رہی۔ لوگوں کا بھی عجب حال ہے، ہمارے ایک ہمعصر کے اعلیٰ افکار

کی شہرت نہ صرف ہندوستان بلکہ چار دانگ عالم میں ہے۔ اس نے

زندگی جس طرح بھی بری بھلی تھی بسر کر لی، وفات کے بعد اس کا روضہ نہیں

تعمیر کیا گیا۔ سالانہ عرس بھی ہوتا ہے لہذا پاکستان بلکہ بیرونی دنیا میں آپ کی

یہی پر خراج عقیدت بھی ادا کیا جاتا ہے، بلکہ آپ کا کلام شرح

لکھنے والوں کا ایک ذریعہ روزگار بن گیا ہے، اور آپ کے بارہ میں

اتنا کچھ چند سالوں میں لکھا گیا ہے کہ آپ کا اپنا کلام اس کا عشرِ عشر

بھی تھیں۔ غمخیز نے یہی کہا ہے کہ

بنا شد شجر من مشہود تا جاں در بدن باشد کہ بعد از مرگ اہم تاقہ بیروں می دہد لورا

مرحوم کے اشارے تو مرحوم کی زندگی میں مشہور ہو چکے تھے مگر عزت افزائی بعد از

مرگ ہی ہوئی جس کا تاؤدہ مرحوم کو تو نہیں شاید اس بیت کے پوہاریوں

کو کچھ ہو۔

خواجہ حافظ شیراز لود اس کے دلکش مناظر کا ذکر اس لیے فرماتے ہیں کہ آپ کو اس سے دل بستگی اور وابستگی مدت العمر رہی، عسرت کی شکایت آپ ضرور کرتے ہیں۔ اور کبھی کبھی دل برداشتہ ہو کر کہتے ہیں کہ وہ آب و ہوائے پارس عجب سگند پرور است۔ کوہربے کہ خیمہ از میں خاک بر کتم۔
 ایران کی آب و ہوا سخت سگند پرور ہے اگر کوئی رفیق ہمسفر مل جاتا تو یہاں سے لہد یا بسترہ باندھ کر چل دیتا رہے۔

سمن رانی و خوش خواتی نمی حد زندق شیراز۔ بیجا حافظ کہ ما خود را بملک دیگر اندازیم
 سمن گئی اور خوش کلامی ایسی چیزیں ہیں کہ ان کی قدر و قیمت کو شیراز میں کوئی نہیں جانتا، بہتر یہی ہے کہ کسی دوسرے ملک میں ڈیرہ بھمایا جائے۔
 تا از مودہ ایم در پی شہر سخت خویش باید بروں کشید از میں و طرخت خویش
 میں اس شہر شیراز میں قسمت آزمائی کر چکا ہوں۔ بلخ تجربہ کے بعد مناسب بھی ہے کہ اس طوفان بے تمیزی سے نکل کر سفر اختیار کیا جائے۔
 خواجہ حافظ کے اشارے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ایک دفعہ شیراز
 مدد میں آئے، عالی یزد کی مدح میں غالباً قصیدہ کہا ہوگا۔ خواجہ کے دیوان
 میں تو کوئی قصیدہ مدحیہ نہیں ملتا۔ البتہ چند غزلیں ہیں اور ان میں بھی
 مدحیہ اشعار گنتی کے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ کی طبیعت مدح سرائی
 کے لیے موزوں نہ تھی، موجودہ دیوان کے آخر میں چند مدحیہ قصائد جو دیگر
 شعرائے کبے اور ان کی کلیات میں موجود ہیں کسی نے کسی وقت خواجہ کے
 دیوان میں شامل کر دیئے۔ یزد میں شاہ سے ملے اور اپنا کلام مدحیہ پیش
 کیا۔ بعض مذکورہ نوایسوں کی رائے یہ ہے کہ یہ غزل ہی تھی جس کا مطلب

دلائی جہاں نصرت دین خسرو کامل یحییٰ بن مظفر ملک عالم و عادل
اور یہ بھی لکھتے ہیں کہ نصرت الدین یحییٰ خسرت میں مشہور تھا۔ اس لیے کچھ صلہ
نہ دیا۔ چنانچہ ایک قطعہ میں لکھتے ہیں کہ سے

دل نمبہای جان من بروعدہ شاہ وزیر کس نمی داند کہ کارش از کجا خواهد کشاد

ای جان من شاہ اور وزیر کے وعدہ پر نہ بجا، کوئی نہیں جانتا کہ اس کی مشکل
کامل کہاں سے ہوگا، عموماً جس سے توقع ہوتی ہے اس کی طرف سے
بایسی ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ کچھ ایسا سامان خبیب سے پیدا کر دیتا ہے کہ کام
اس شخص سے بن جاتا، جس کا خیال بھی نہیں ہوتا اس کی تصدیق خواجہ
آپ بیٹا کر کرتے ہیں۔

معاذ کل کون نمیشانی کہ ذک کلک من نقش بر صورت کہ زورنگے و گر بیرون نلو

ملا تا صمان مشورہ یہ ہے کہ اللہ پر توکل کر وہ خالق ہے اور رب العالمین نیز
بھی رادق ہے۔ اس حقیقت سے تو واقف نہیں۔ مجھ پر جو کچھ گذری وہ یہ
ہے کہ میں نے مدیہ اشار اس توقع پر کہے کہ مدوح مناسب صلہ دیگا۔
مرے ذمہ قلم سے صفحہ قرطاس پر جو کچھ لکھا گیا اس کا مفہوم یہی کچھ تھا مگر
جو رنگ میں جمانا تھا وہ تو نہ بجا کچھ اور رنگ پیدا ہو گیا۔

شاہ ہرموزم ندید و بے سخن صلہ لطف کرد شاہ یزوم دید و مدحش گفتم در بیچ ندلو

شاہ یزد کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مدح بھی کہی لیکن اس نے مجھے کچھ نہ دیا۔

شاہ ہرمز سے نہ میں ملا اور نہ اس کی مدح میں کچھ کہا مگر اس نے قابضانہ مجھ پر

سو لطف و کرم کیا۔ اہل الذکر سے میری توقع غالباً تھی، یا کسی ہونا پڑا شاہ ہرمز

کے دل میں اللہ نے میری طرف مہربانی کا جذبہ خود بخود پیدا کر دیا۔

کار شاہاں این چنین باشد تو ای حافظ مرتضیٰ وارو روزی رساں توفیق نصرت شاہ و

اے حافظ بادشاہوں کے کام ایسے ہی ہوا کرتے ہیں اس لیے رنجیدہ ہونا بے فائدہ ہے۔ البتہ دعا کر اللہ تعالیٰ جو سب کو رزدی دیتا ہے انہیں بھی نصرت عطا فرمائے۔ قطعہ کے آخری شعر میں لفظ "نصرت" کا اشارہ اگر نصرت اللہ کی بجائی کی طرف ہے تو لطف پیدا ہوگا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہ یحییٰ نے اپنے فذیر کی معرفت کچھ مناسب صلہ دینے کا وعدہ ضرور کیا ہوگا۔ خواجہ ایک غزل کے مقطع میں جس کا مطلع ہے
 حالی کہ چیت دولت دیدار یار دیدن، مکڑے ادگدائے بر خردی گزیدن کہتے ہیں کہ
 گئی رفت حافظ از بادشاہ یحییٰ یارب بیادش اور دلش پروریدن

اگر یہ صحیح ہے جیسا کہ تو کہتا ہے کہ حافظ بادشاہ یحییٰ کے یاد سے آزی گیا تو دعا ہے کہ اے خدا اس کو درویش پروری یاد دلا۔ لیکن بعض نسخوں میں یحییٰ کی جگہ منصور ہے۔ محمد یحییٰ منکرہ "حافظ شیریں سخن" میں لکھتا ہے کہ آٹھ پڑمان "مقدمہ باب دم دیوان میں لکھتا ہے کہ خواجہ نے مدح شاہ یحییٰ میں بھی غزل کہی جس کے مطلع کا پہلا مصرع دارائے جہاں نصرت دیں خرد کابل" ہے محمد میں اس پر تنقید کرتا ہوا لکھتا ہے کہ اس غزل میں یہ شعر ہے

می نوش و جہاں گیر کہ از زلف کدشت شد گردن بدخواہ گرفتار سلاسل
 یہ اشارہ اس واقعہ کی طرف ہے شاہ منصور نے زمین العابدین کو گرفتار کر کے قلعہ "سلاسل" واقعہ "شوستر" میں قید کیا تھا، خواجہ حافظ شاہ یحییٰ لہ شاہ منصور دونوں کا ہم عصر ہے اس لیے یہ تاریخی واقعہ جو منصور سے منسوب کیا گیا ہے دراصل شاہ یحییٰ ہی کے متعلق ہے۔ کیونکہ غزل کے شروع میں خواجہ حافظ شاہ یحییٰ کا نام لیتا ہے اور تم غزل مدحیہ ہے۔

بہر حال خواب کو اپنی مجلس کا شکوہ ضرور ہے۔ ایک غزل میں کہتے ہیں کہ

شیراز معدن لب لعلت و کان حسن من جوہری مجلس از آنرو مشوشتم

شہریت پر کرشمہ و خفاں ز شش بہت چیز یک نیست مدہ خریدار ہر ششتم

شیراز تو حسن و خوبی کی کان ہے۔ اگرچہ میں حسن شناس جوہری ہوں مگر مجلس ہوں اس لیے تشویش میں ہوں کہ کسی کے لب لعل کو بوسہ دوں یا کسی کے حسن کا خریدار بنوں تو کس برتنے پر شہر میں ہر طرف حسن کرشمہ ساز ہے امد ہر خریدار کو دعوت دینا ہے مگر میرے پاس تو کچھ بھی نہیں اگر ہوتا تو میں شش بہت خرید لیتا جو کرشمہ سے محروم ہے۔ ایک لود مقام پر ارشاد ہے کہ

شہریت پر حریفان ہر طرف نگارے یا ماں صدائے سعادت گئی کیند کارے

ہر نامی حافظہ دست زلف شوخ شکل نماں شش دہا میں چیں دیارے

کہ شہر تو حریفوں سے بھرا ہوا ہے اور ہر طرف حسین صورتیں دعوت عشق دے رہی ہیں۔ اگر کچھ کام کرتا ہو تو یہی عشق بازی ہے جو یہاں میر ہے۔ میرا بال بال ہر ایک شوخ کی زلف میں بندھا ہوا ہے، جب یہ کیفیت ہو اور مجلس کچھ کام نہ کرنے دے تو ایسے شہر میں مجھ جیسے مجلس تلاش کا قیم مشکل ہے۔ کہ سے خورد حریفان دمن نظارہ کمز کہ حریف تو دوشق دین اور میں منہ دیکھتا رہ جاؤں۔

ایک لود مقام پر ارشاد ہے کہ

پر شکر با ست در میں شہر کہ تافع شدہ اند شاہباناں طریقت بمقام بگے

کہ اس شہر میں جو مکھوں کا گھر ہے کون سی مٹھاس ہے کہ شاہباناں طریقت قناعت کئے بیٹھے ہیں، ابوہر مجلسی جب شیراز باہر حسن و خوبی کھانے لگا تو

سفر کی ٹھان لی، اس لیے کہتے ہیں کہ

من کز وطن سفر نگریم بعمر خویش
در عشق دیدن تو ہوا خواہ غربتم

میں نے تم عمر کبھی سفر کی زحمت گوارا نہ کی مگر تیرے دیدار کی کشش اتنی
غالب ہے کہ غیر الوطنی کو ترجیح دیتا ہوں، غرض پہلا سفر اگرچہ کچھ دور کی
مسافت نہ تھی "مزدہ کی طرف پیش آیا۔ اسی ایک سفر میں جو کچھ مایوسی اور
تکلیف کا سامنا ہوا کاتی تلخ تجربہ تھا کہ فرماتے ہیں

گرازیں منزل ہراں بسوی خانہ دم
وگرا سنا کہ دم عاقل و قرآنہ دم

آئی میں اس دیران مقام سے لوٹ کر اپنے گھر بچر و عافیت پہنچ جاؤں تو پھر
اگر سفر کی خواہش دل میں گد گدی لے تو کچھ سوچ سمجھ کر ہی اختیار کروں گا۔
یعنی یہ حماقت تھی کہ سفر کی ٹھان لی اس کے بعد ایک دفعہ اپنے وطن میں
پہنچ جاؤں تو سفر کا کبھی نام نہ لوں کہ عقل کا یہی فتویٰ ہے۔

ذہن سفر گر سلامت بطن باز دم
ند کہ دم کہ ہم از راہ بیخانہ دم

ایک دفعہ اگر اس سفر سے صبح و سلامت بچر و عافیت وطن میں پہنچ جاؤں
تو میں نے زندگان رکھی ہے کہ راستہ ہی سے سیدھا بیخانہ کی طرف رخ
کروں گا۔

تاگویم کہ پر کشف شد ازیں سیر و سلوک
بدر صومعہ باہر ربط و بیخانہ دم
"کشف" اور "سیر و سلوک" تصوف کی اصطلاحیں ہیں۔ سالک اسے کہتے
ہیں جو مجاز سے حقیقت کی طرف مقامات صبر و رقا و شکر و توکل وغیرہ
طے کرتا ہوا منزل معرفت پر پہنچتا ہے۔ اور جو کچھ نکات معرفت اس پر اس
سیر و نفسی و آفاقی، میں منکشف ہوتے ہیں اسے "کشف" کہتے ہیں۔ شعر
کا مطلب یہ ہے کہ میں یہ بیان کرنا چاہتا ہوں کہ مجھ پر اس سیر کے

دوران میں کیا کچھ منکشف ہوا۔ جسے اصطلاح میں "عال" کہتے ہیں تو وہ ایک ایسی مسرت انگیز بات ہے کہ میں شراب خانہ کے دروازہ پر مربوط بجاتا ہوا۔ پیانا ہاتھ میں لیے، وجد کرتا ہوا جاؤں گا۔ یعنی اتنی بات منکشف ہوئی کہ "سرودستی" ہی اس زندگی میں ایسی چیز ہے جسے اختیار کرنا چاہیے۔

"ہنگام تنگ دستی و عیش و مستی کیں کیمائے مستی فاروں کند گدا ماہ
مستی کے دن ہوں تو عیش و مستی میں غم غلط کرنا چاہیے۔ نقل عیش بہ از
عیش۔ کیسے ہستی یعنی عیش و مستی ایسی ہے کہ فقیر کو امیر بنا دیتی ہے۔ اس
شعری خوبی کو نفسیات کے عالم خوب سمجھتے ہیں۔ پاکستان میں آج کل اگر
آپ کسی تفریح گاہ "سینما" وغیرہ کی طرف جائیں تو وہاں لوگوں کا ہجوم نظر
آئے گا لہذا ان میں اکثر وہ لوگ ہیں جن کو دو دفعہ پیٹ بھر کر کھانا نہیں ملا
اور ویسے بھی آج کل قحط کا یہ حال ہے کہ ایک متوسط الحال کے اہل و عیال
کا گزارہ فراغت یا عسرت سے مشکل ہوتا ہے۔ بات اصل میں یہ ہے کہ
زمین کی تنگی کو کم کرنے کے لیے لوگ جو کچھ تھوڑا بہت کاتے ہیں تفریح
کی نند کر دیتے ہیں۔ خواہ فرماتے ہیں کہ

شراب رنج می خواہم کہ مردانگن بود زورش

کہ تاپیک دم بیاسم زوینا دشر و شورش

شراب کا ذائقہ رنج تو ہے مگر اس کے نشہ میں دنیا کے شور و شر سے تو کچھ
عصر نجات مل جاتی ہے۔ غالب کہتا ہے کہ

مے بسے غرض نشاط مے کس رویا کو اک گویند میخواستی مجھے دن رات چاہیے

مے نوشی سے میری غرض یہ نہیں کہ عیش و نشاط کا دلدادہ ہوں۔ میں تو

میخوری چاہتا ہوں اور میخوری میں سکون ہے۔ ویلوی تفکرات اور غم و اندہ سے تو پھٹکارا ہو جاتا ہے۔ یہی فلسفہ تحت الشعور ہر ایک کے دل میں کارفرما ہے جو نشہ کی عادت ڈال لیتے ہیں لیکن یہ فریب نفس ہے نفس انسانی حظ کا طالب ہے اور اسی حظ نفس کا مقبرہ ہے کہ انسان "رعبانیت" اختیار کرتا ہے۔ اس میں اور شراب نوشی میں اصولاً کچھ فرق نہیں، سعدی کا ارشاد ہے کہ

ہو ہیں اک بے حمیت ملا کہ ہرگز نخواہد دید وئے نیک بختی

من آسانی گویند تو لیستن را زن و فرزند بگزارد بسختی

جو لوگ تجرید پسند کرتے ہیں وہ بھی نادانستہ "حفظ نفس" چاہتے ہیں

معاذ الہی ما بس ہمیں آزار بود ورنہ حد کنج ہم آسنگی بیا بود

زندگی مسلسل جدوجہد کا نام ہے۔ اور اسی جدوجہد کو "آزار" سے تعبیر کرتے ہیں، جو لوگ آسودگی کے طالب ہیں وہ مقصد اور منشا کو نہ سمجھتے ہیں اور نہ سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کامیاب زندگی اسی جدوجہد میں ہے، جو ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہیں۔ وہ مقصد زندگی کبھی حاصل نہیں کر سکتے۔ وہ اس "آزار" ہستی کو برواشت کرنے کی طاقت نہیں رکھتے اس لیے تنگ آکر "خوکشی" کرتے ہیں، خواجہ حافظ کہتے ہیں کہ

"توئے مجدد و جہد نہادند وصل دوست توئے دیگر حوالہ تقدیر می کند"

دنیا میں دونوں قسم کے آدمی موجود ہیں، ایک تو مقصد زندگی جدوجہد سے حاصل کرنا چاہتے ہیں، اور دوسرے "تقدیر" پر شاکر ہیں۔ اور جو شاکر نہیں وہ دوسرے قسم کے آدمی ہیں جو تقدیر کو کوستے ہیں، حقیقت یہی ہے کہ "لیس الانسان الا ما سی" انسان کو وہی کچھ ملتا ہے جس کے لیے سعی کرنا ہے

لہذا ہر ایک ذہنی اور مادی ترقی اسی "سچی" سے وابستہ ہے، یہ ایک مستقل موضوع ہے، فہم و تفہیم کے لیے یہی اشارات کافی ہیں۔ اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خواجہ صاحب ما روکشن و ما رخ جو ہستی کے راز سے واقف تھا کیوں توکل اور قناعت دینا پر زور دیتا ہے، ایسا توکل اور قناعت کہ الہی قویں مخلوق ہو کر رہ جائیں۔ توکل اور قناعت کا مقام بہت بلند ہے وہ خود فرماتے ہیں کہ

تکیہ پر تعلق و دانش و طریقت کا فریفت دہر و گرسد ہنر و در و توکل باشندش

پر ہنر گاری اور عقل و دانش پر بھروسہ کرنا کہ یہی زندگی کا سہارا ہیں۔ طریقت میں کفر ہے، سالک اگر سو ہنر رکھتا ہے ان پر تکیہ نہ کرتا چاہئے، بہر حال توکل "علی اللہ" سب سے بہتر ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو متنبہ فرمایا کہ "اے موسیٰ تیرے ہاتھ میں کیا ہے تو عرض کی "عصا" اس سے میرے دنیوی ہزاروں کام نکلتے ہیں۔ اپنے بھیڑ بکری کے بیڑ کے لیے پتے بھاڑتا ہوں وغیرہ وغیرہ، فرمایا ہاتھ سے پھینک دے جب پھینک دیا تو اس عصا کی حقیقت منکشف ہوئی کہ خطرناک سانپ ہے آپ ڈر کر اس سے کنارہ کر لے لگے تو فرمایا "مت ڈر، اسے پکڑ لے، اٹھایا تو وہ وہی عصا ہی تھا۔ مولانا رومی فرماتے ہیں کہ "ابن عصا پر بود قیاسات و دلیل"۔ علامہ محمد فہرستی تذکرہ عبرت و تدبر و تفکر کی تعریف کے بعد کہتے ہیں

وہ عدد و فلان است این دیا کن جو موسیٰ اندرین ترک عصا کن

عقل کا سہارا لینا اسباب کو مسبب الاسباب یقین کرنا ہے یہ کفر ہے، ہم مناسب قیام پر آگے چل کر وہ واقعات بھی بیان کریں گے جن کے اثر کے تحت خواجہ حافظ دینا کے شوق شہر سے کنارہ کش رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔

المختصر خواجہ صاحب نے یزد کے سفر کے بعد آئندہ سفر سے توبہ کی،
ایک دفعہ خیال میں آیا کہ چلو بغداد میں قسمت آزمائی کریں مگر یزد کے سفر کلفت
نے بازرگیاں فرماتے ہیں سے

وہ ہر دیم بہ مقصود خود اند شیراز خرم اں یزد کہ حافظہ بغداد گرفت
اند نیز سے

اذکل غار ہم غنچہ عیشی نشکفت جدا دجلہ بغداد دمی روحانی
اس وقت احمد جلاہیر عراق عرب کا والی تھا۔ خواجہ کو بغداد میں تشریف لانے
کی دعوت دی، آپ نے عذر خواہی کی اور ایک غزل لکھ کر ارسال کر دی۔
احمد الدلی معد اللہ السلطان احمد شیخ اور لیس حسن ایلکانی

سلطان احمد شیخ اور لیس حسن ایلکانی کے عمل و داد کی وجہ سے ملک میں امن
اور آسودگی کا دور ہے اس لیے میں اس پر اللہ کی حمد و ثنا کہتا ہوں کہ ایسا
سلطان عادل عنایت فرمایا سے

خان بن خاں شہنشاہ شہنشاہ نژاد آنکھی دید اگر جاں بہانش خوانی
سلطان احمد خود خان ہے اور خان کا بیٹا ہے بلکہ شہنشاہ اور شہنشاہ
کی نسل ہے، زیب دینا ہے اگر تو ایسے جان جہان سے مخاطب کرے۔

میدہ ناہیدہ باقبال تو ایماں آعدو مرجبای بہرہ لطف خدا ارنانی
وہ آنکھ جس نے مجھے دیکھا تک نہیں تجھ پر میں دیکھے ایمان لائی۔ خدا کو بھی
تو کسی نے نہیں دیکھا مگر ایمان اللہ پر سب کا ہے مرجب اللہ تعالیٰ کا لطف
گرم تجھ پر ارنانی ہو رہا ہے سے

بختیش و کوشش کا آئی پچھنیز خلی بختش و کوشش کا آئی پچھنیز خلی
اپنی ترکانہ زلفت کے بیچ و غم کو ذرا لہ بھی تابدار کر کیونکہ قائل اور پچھنیز خانی

معدوں سے جس طرح لوگ ایسیر ہوئے امدان کی جان بخشی ہوئی وہ تو تیری
کاکل میں بھی تاب و طاقت ہے۔

مالگرے تو یو آید بدو نمیش بزند دولت اہمدی و معجزہ سلطانی
آنحضرت کا معجزہ شق العر مشہور ہے، آنحضرت کا اسم مبارک احمد ہے اور
خواجہ مدوح کا نام بھی احمد ہے آنحضرت شاہ عرب ہیں اور مدوح بھی شاہ
عراق عرب ہے۔ اس لیے اس نام اور مقام سلطنت کی رعایت کی وجہ سے
یہ معجزہ مدوح بھی نرزد ہو سکتا ہے کہ اگر چاند مدوح کے بغیر اکیلا طلوع
ہو تو وہ دو نیم ہو جائے۔

جلت حسن تو دل می برد از شاہ و گدا چشم بد دور کہ ہم جانی و ہم جانی
امیر ہو کہ فقیر، شاہ ہو یا گدا تیرے حسن کا جلوہ دیکھ کر دل ہاتھ سے دے
دینا ہے۔ چشم دور ہے کہ تو جان بھی ہے اور جاناں بھی ہے۔
گروہ عظیم یا تو قدح می نوشیم بعد منزل نمود و در سفر روحانی
بغداد کو جلوہ نے دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے ایک مشرقی اور دو مرا مغربی
بغداد ہے۔ آخر الذکر کو روحانی اور مشرقی حصہ کو الزوراء کہتے۔ اس لیے ندواہ
سے روحانی سفر مراد سفر بغداد ہے۔ لیکن راجح، اور روحانی، شراب
کو بھی کہتے ہیں۔ چنانچہ خواجہ کے اشعار ہی میں اس کو اس طرح بانٹھا گیا
ہے۔

می درد صبح مکہ بنتہ سماپ الصبوح الصبوح یار محاب
پو پھٹ رہی ہے لہ گھٹا چھائی ہوئی ہے ال ہم نشینو، صبوحی، یعنی صبح کے
وقت کی شراب لاؤ۔
تخت ندین زده است گل پنچمن راجح بچوں لعل آتشیں دریا

گل نے مین میں تخت زریں بچھا رکھا ہے۔ در گل " اس تودوزدوسی شے
کو کہتے ہیں جو پھول کی پنکڑیوں کے درمیان ہوتی ہے اور اسی کی خوشبو
ہوا میں پھیلی ہے۔ ایسے وقت " طبع " یعنی سرخ رنگ کی انگورہ کی طرح دہتی
ہوتی شراب طلب کر دے۔

برہیں بلال محرم بخماہ ساغرملاح کہ ماہ امن و اماں ست و صلح و صلح
ماہ محرم کی پہلی تاریخ کا چاند دیکھ کر شراب کا پیالہ پیو کہ امن و اماں کے پینے
لہ صلح و صلح کے سال کی بشارت سے رہا۔

" گرچہ دوریم بیاد تو قدح می تو شیم " کا مطلب یہ ہے کہ میں اگرچہ جہانی
لحاظ سے آپ سے دور ہوں لیکن آپ کی یاد میں جام شراب پی رہا ہوں۔
روحانی سفر میں بعد یادانی نہیں ہوتی جو مادی زندگی میں مشاہدہ ہوتی ہے۔
از گل ناریم خنجر عیٹے نشکندت جذا و جلد بغداد سے روحانی

عیش عربی لفظ ہے اہ معنی " زندگی " ہے۔ یعنی میرا خنجر دل یا زندگی خاک
ایمان سے کلنے میں نہیں آتا۔ کیا ہی اچھا بغداد کا دریا و جلد بغداد کی شراب
ہے کہ اس سے کار بستہ کے کلنے کی توقع ہے۔

اے نسیم سحری خاک رہ یار یار تاکذ حافظ ازاں دیدہ جان بھلی
اے نسیم سحر دوست کے راستہ کے خاک اٹا کر لا تاکہ حافظ اسے ہر دم چشم بنائے
اہ دیدہ جان روشن کرے۔

غالبیہ نغزل خواجہ نے ۱۶۵۰ء میں کہی جب قطب الدین محمود نے سلطان
اولیٰ کی مدد سے شیراز اپنے بھائی شاہ شجاع کو بلے و غل کر کے یا۔ مفصل
حالات ہم آگے چل کر بیان کریں گے۔

بعض تذکرہ نویسوں نے خواجہ کے سفر تہمز، کا بھی ذکر کیا ہے لیکن

آپ خود ایک قطعہ میں جس کا حالہ دیا جا چکا ہے کہتے ہیں کہ شاہ ہرموزم تہرہ
 دل سخن صدا لطف کردہ کہ شاہ ہرمز سے جبری ملاقات بھی نہ ہوئی اور میں نے
 اس کی مدح میں بھی کچھ نہ کہا مگر مجھ پر ہر طرح لطف و کرم سے نوازہ نش فرمائی
 یہ ممکن ہے کہ خواجہ صاحب ایک دفعہ ہرمزہ تک آئے ہوں مگر نہ تو شاہ سے
 ملنے کا ارادہ تھا اور نہ اس سے ملاقات ہوئی مگر سبب شاہ کو معلوم ہوا کہ آپ
 آئے بھی اور ملنے کے بغیر واپس چلے گئے تو کسی کے ہاتھ مد پیر بھیج دیا ہو۔
 قصہ یہ ہے کہ خواجہ کا جمعہ و کن رہند و سمان میں محمود شاہ بہمنی بادشاہ تھا۔
 یہ عالم اور علم و حکمت و دست تھا بقول مورخ فرشتہ لوگ اس کو "ارسطو" کہتے
 اس کے دربار میں منتخب ہوزگار کا اجتماع ہو رہا تھا۔ وزیر "میر فضل اللہ ایجو"
 نے ایک بعد عرض کیا کہ اگر خواجہ شمس الدین محمد حافظ بھی آپ کے دربار کے
 ایک رکن ہوتے تو پھر کسی بات کی کمی نہ رہتی۔ ہم تو سنا ہوا تھا۔ بعد غائب کلام
 بھی نظر سے گنڈا ہو گا۔ وزیر میر فضل اللہ کو کہا کہ جتنا مد پیر درکار ہو خواجہ
 کی خدمت میں بھیج دو اور یہاں آنے کی دعوت دو، اس وقت دو تاخیر
 خواجہ زین الدین ہمدانی بعد خواجہ محمد کا زادنی تھے ایران اور کن میں تہجائی سلسلہ
 قائم کیا ہوا تھا۔ انہی دو کے سپرد یہ خدمت ہوئی کہ خواجہ کو کن میں لائیں۔
 خواجہ کے ہاتھ میں مد پیر آیا تو بقول شیخ سعدی "قرار برکت آزادگان نگیرد مال
 نہ صبر در دل عاشق نہ آب در غربال" کچھ تو قرض کی اٹانگی میں اٹھ گیا اور
 چند بیوگان و یتیمی کی نند کیا۔ جو ہائی بچا وہ زاد راہ لے کر ہرمز تک آئے
 یہاں ایک مفذوک الحال مشناسا تھا یہ مد پیر بھی اسے دے دیا۔ تاجروں
 نے کہا کہ مد پیر کا فکر نہ کریں ہم زاد راہ کے کفیل ہیں۔ اتفاقاً تا ملائم کہ بحر
 میں امواج اٹھ رہی تھیں اور کشتیاں خس و شاشاک کی طرح بہ رہی رہی تھیں۔

شاید خواجہ نے پہلی دفعہ یہ خطرناک نظارہ دیکھا۔ وہیں بیٹھ کر ایک غزل لکھی۔ لود تاجروں کے حوالہ کی۔

دے باغم بسر بردن جہاں یکسر نمی ارزد۔ بی بفروش دلق ماگزین بہتر نمی ارزد
ایک دم غم سے بسر کرنا و پنا جہاں کی مسرتیں بھی اس کے برابر نہیں ہو سکتیں
مناسب یہی ہے میری فقیرانہ گوڑی شراب کے عوض فروخت کر دو کہ اس سے
بہتر سودا لود کوئی نہیں۔

بکوی می فروشانش بخلے بر نمی گرو۔ نیسے بجاہ تقوی کہ یک ساغرمی ارزد

مشکل یہ ہے کہ یہ دلق دیاہ اس لائق بھی نہیں کہ می فروش اس سے شراب
کے عوض خرید لے، اس بجاہ تقوی کی کیا بات ہے کہ اس کے عوض
ایک پیالہ شراب بھی نہیں ملتا۔

رقیب سرز لش با کرد کز این باب رخ برتابا پرافتاد این سرما کہ خاک در نمی ارزد
رقیب نے بہت سرز لش مجھے کی کہ میں کسی طرح اس دروازہ سے منہ موڑ لوں
مگر خدا جانے میرے سر پر کیا افتاد پڑی ہے کہ اس دروازہ کی خاک سے جدا
نہیں ہوتا، بھلا ایسی شے لود کہاں بسر ہو سکتی۔

شکوہ تاج سلطانی کہ بیم جاں درد درن است

کلابی خوشتر است اما تبرک سر نمی ارزد

تاج سلطانی کی عظمت تو ظاہر ہی ہے مگر اس میں جان کا خطرہ بھی پوشیدہ ہے
اس لیے کلاہ تو بہت ہی اچھا ہے مگر نہایت مہنگا ہے کہ اس کے ساتھ
سر کٹنے کا خطرہ عظیم ہے۔

بس آسانی کی نمود اول غم دریا ہوئی سود

غلط کردم کہ ہر موحش بصد گوہر نمی ارزد

دیہاتی سفر کی تکلیف مٹانے کی امید پر کچھ آسان قابل برداشت معلوم ہوتی ہے۔ نہیں نہیں میں غلطی کر رہا ہوں اس کی ایک ایک موج کی برابری سو گوار بھی نہیں کر سکتے۔

پروفیسر صاحب قناعت کوش واز دینا دوں بلندہ کہ ایک سو منت ہونا بعد من ندھی اردو حافظ کی طرح کوشش کر کہ تو بھی قناعت پیشہ ہو اور کہیں دنیا سے گندہ جا کہ کہنے لوگوں کی منت و خوشامد ایک سو کے برابر کی جائے تو سو من سولے کی قیمت اس کے مساوی نہیں ہو سکتی۔

تاجروں نے میر صاحب کی خدمت میں غزل پیش کیا اور مہم ماجرا کہہ سنایا۔ میر صاحب نے محمود شاہ کے گوش گزار کی، بادشاہ نے اور مدھیہ اور ہندوستان کے تحائف خواہر کی خدمت میں ارسال کئے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب خواجہ حافظ بزد کی طرف جا رہے تھے۔ اصغیان کے راستے سے گزرے۔ اصغیان آپ کے والد کا مولد تھا۔ اور یہاں شاید کچھ رشتہ دار اور دوست آشنا بھی تھے، کچھ دن ان کے پاس رہے، پھر پھر اس صحبت کو کبھی نہ بھولے اور بعض اشعار میں اس کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ ایک غزل کا مطلع ہے کہ ہے

بغداد وصل دوست اراں یار باد یاد یاد آں روزگاروں یاد یاد

اس کا ایک شعر ہے کہ ہے

گرچہ صد عدالت و حقیقت مدام زندہ رود و باغ کاران یاد یاد

مذہب رود و نعت زائیدہ رود ہے، اسی نہر بایہاٹکی تالہ کے کنارہ پر باغ کاران ہے، اس کے آثار اب بھی اصغیان میں پائے جاتے ہیں، شعر کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ میری آنکھیں ہی سو نہریں بہا رہی ہیں لیکن اس پر

بھی زندہ رود لحد بارغ کالان بھول نہیں سکتا۔ ایک غزل کا مطلع ہے

یہی مندرست بالعراق
اللاتی من نواحا ما الاتی

اس کا ایک شعر ہے

خود زندہ رود اندازوی نوش
بگیا ننگ جواناں عسلی

عقل کو زندہ رود میں ڈبو دے لحد جوانان عراق کے ترانوں کے ساتھ شہ

پی۔

مگر شیراز کو اصفہان پر ترجیح دیتے ہیں۔ ایک غزل کا مطلع ہے

صال روز عمر جادواں یہ
خداوند مرا آن وہ کہ اس

معتوق کا وصل عمر جادواں سے بہتر ہے۔ اسی خدا مجھے بھی کچھ عنایت فرما

یہی بہتر ہے یعنی وصل دوست۔

اس غزل کا شعر ہے کہ

اگرچہ زندہ رود آب حیات است
وے شیراز ما از اصفہان بہ

اگرچہ زندہ رود آب حیات ہے اور آپ حیات پی کر خضر کی طرح حیات

جادواں طبع ہے۔ مگر مجھے شیراز میں وصل دوست حاصل ہے اور وصل دوست

پر عمر جادواں قربان کی جا سکتی ہے اس لیے میرا شیراز اصفہان سے

بہتر ہے لحد مجھے شیراز ہی میں اس چند روزہ زندگی میں رہائش محبوب ہے

یہاں تک تو ہم نے خواجہ کی آپ بیتی آپ ہی

کی زیبائی سن لی مگر خواجہ کے شاعرانہ تخیل اور

معاصران حاقظا

حکیمانہ افکار عالیہ کے بیان سے ہمیشہ مناسب ہے کہ اس ماحول کا بھی

ذکر کیا جائے جس میں آپ کی پرورش ہوئی اور جس کے اثر سے کوئی شخص

کسی زمانہ میں بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ اور یہ سچ تو یہ ہے کہ جب تک اس

کا صحیح نقشہ سامنے نہ ہو خواہر کے بعض اشعار جو معاصرین کے بارہ میں
 لکھے ہیں سمجھنا مشکل ہے، خواہر ایک قطعہ میں فرماتے ہیں کہ سے
 بعہد سلطنت شاہ شیخ ابوالاسحاق یہ بیخ شخص عجب ملک فارس بود آباد
 شاہ ابوالاسحاق کے عہد میں ملک فارس پہنچ اشخاص سے آباد تھا جو تادریہ
 روزگار تھے، سے

تخت بادشہ پورا ولایت بخش کہ جان خویش بہرود و دولت عیش باد
 سب سے پہلے خود شاہ ابوالاسحاق تھا کہ بخشش کا یہ عالم تھا کہ جس کو چاہا
 کسی حصہ ملک کا والی بنا دیا۔ اپنی زمین بھر داد عیش بھی خوب دی۔ سے
 مگر تو ہم جو حاجی قوم دریا دل کہ نام نیک نبرد از جہاں ز بخشش داد
 ہمراہ اسلام کا حالی اور سر پرست شیخ محمد الدین کہ اس سے بہتر روئے نہیں
 یہ آسمان نے بھی کوئی قاضی نہ دیکھا اور نہ اسے یاد ہے کہ اس کا نظیر
 پہلے کبھی کوئی تھا۔ سے

مگر شہنشاہ وارش عندکہ در تصنیف زمین بہت او کار لائے بست کشاد
 دوسرا شہنشاہ ملک عقل و دانش عندکہ جس کے مدبر سے مشکل سے مشکل
 بہت ملکی کی گئی سلجھتی رہی۔ سے

مگر یقیناً ابدال شیخ امین الدین بنائے کار موافق بنام شاہ نیا
 دوسرا باقیات الصالحات میں سے شیخ امین الدین جو یاد گار ابدال
 تھا۔ اس نے بادشاہ کے نام اور کار و بار سلطنت میں موافقت پیدا کی، سے
 مگر تو ہم جو حاجی قوم دریا دل کہ نام نیک نبرد از جہاں ز بخشش داد
 ہمراہ حاجی قوم الدین جو دریا کی طرح فراخ دل طبع ہوا تھا، اس نے اپنا
 نیک نام جہاں میں بخشش اور داد و بخش سے لندہ ہے۔

تظیر خویش نگذاشتند و بگدشتند خلتے عزوجل جملہ را بیا مرزاد

اپنا مثل پیچھے نہ پھوڑا اور چل بسے اللہ تعالیٰ عزوجل سب کی مغفرت فرمائی

ہم لکھ لکھ چکے ہیں کہ خواجہ حافظ کی طبیعت مدح گوئی کے مناسب

واقع نہ ہوئی تھی، کسی مدح بھی تو مختصر ایک غزل یا غزل کے دو میں اشارہ

ہیں، لیکن منہ پر کسی کے اوصاف بیان کرنا خواہ وہ صحیح ہی ہوں خوشامد سمجھی

جاتی ہے انہی کے مدح میں کچھ شعر کہے جب یہ لوگ جہاں سے گزرتے گئے

تو کس درد منداں کے ساتھ ان کی سختی میں مغفرت کی دعا کرتے ہیں اور مدھیہ

الفاظ بھی وہی دہراتے ہیں جب ان کی زندگی میں پہلے کہہ چکے تھے

ان چیدہ ہستیوں کے حالات نامہ کنی ہیں ذیل میں ہم مختصر بیان کرتے ہیں۔

خواجہ حافظ کے معاصرین میں تخت دہلی پر فرزند شاہ

شاہ ابوالاسحاق

تعلق اور دکن میں محمود شاہ بہمنی اور بنگالہ میں

غیاث الدین بن اسکندر مملوک تھے۔ فارس میں طوائف الملوک تھی۔ اور

پس تو یہ سب سے کہ انتہائی بدامنی کا دور تھا کسی شخص کی جان و مال محفوظ نہ تھا

اس کا اثر خواجہ حافظ کی ذہنیت پر بھی پڑا۔ مختلف خاندان ایران کے

مختلف حصوں پر حکمران تھے اور آئے دن باہمی جنگ و جدل کا بازار

گرم رکھتے۔ بالآخر کامیابی اہل مظفر کو ہوئی۔

اس خاندان کے جد علی غیاث الدین حاجی خراسانی کے نام سے

مشہور ہیں۔ خاندان شاہ اپنی تاریخ۔ دوسرا الصفاہ میں لکھا ہے کہ

یہ شخص نہایت قوی ہیکل اور بلند قامت تھا۔ اس کی تلوار کا وزن سارے

دین من تھا اسی پر اس کی جسمانی قوت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ یہ زمانہ

ہلاکو خاں کی ترک تازی تھا۔ ہلاکو خاں چنگیز خاں کا پوتا ہے۔ چنگیز خاں اور

اس کے بعد ہلاکو خاں نے جو تباہی دنیا و اسلام میں برپا کی اس کی نظیر تاریخ کے صفحات پر کہیں نہیں ملتی، ایک قیامت تھی جو مسلمانوں پر گذری ہلاکو نے آخر بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ شیخ سعدی اس وقت زندہ موجود تھے آپ نے وہ انگیز مرثیہ لکھا کہ اس واقعہ کو قیامت سے تعبیر کیا۔

حاجی خراسانی کے تین بیٹے ابوبکر اور محمد لور منصور تھے۔ ابوبکر اور محمد نے تاتاریوں کی وفات اختیار کی، لور حق و فاداری ادا کر کے ہوئے داد مروانگی دی، ابوبکر تو سرحد مصر پر مارا گیا اور کچھ بعد محمد بھی فوت ہوا۔ تیسرا بیٹا منصور باپ کی خدمت میں رہا۔ منصور کے تین بیٹے محمد اور یحییٰ اور مظفر تھے۔ مظفر سب سے چھوٹا مگر سب سے بڑھ کر صاحب اقبال ہوا۔ شجاعت اور الواعزلی میں بھی سب سے بڑا تھا۔ حسن صورت اور سیرت میں بھی بڑا تھا۔

اس وقت ہلاکو خاں کی اولاد فارس پر قابض تھی۔ مظفر کا ستارہ اقبال اوج پر تھا، شاہ غازان نہایت مہربان تھا۔ شاہ خاناں کے بعد اس کا بھائی اولجایتو سلطان ^{۱۲۵۲} ۱۲۵۳ء میں تخت نشین ہوا۔ لور مظفر کو زرا امر میں شامل کر لیا اور ہرات اور مردہ وغیرہ کی سوبہ داری تفویض کی، تھوڑے عرصہ بعد انتقال ہو گیا۔ لیکن اپنے خاندان میں جو آل مظفر کے نام سے مشہور ہے شاہی کی بنیاد رکھ گیا۔

آل مظفر امیر مظفر کا بیٹا امیر مبارک الدین محمد خواجہ حافظ کا ہمصر تھا۔ سلطان اولجایتو کی وفات کے بعد سلطان ابو سعید بہادر خاں تخت سلطنت پر بیٹھا۔ یہ ہلاکو خاں کی اٹھویں پشت میں تھا۔ سلطان ابو سعید کے

عہد میں ملک کے طول و عرض میں عام بد نظمی پھیل رہی تھی کہ حقیقت یہ ہے کہ ایران ہلاکو خاں کی اولاد کے ہاتھ سے عملاً نکل چکا تھا۔ ان کی شاہی برائے ہم تھی، ہر ایک صوبہ دار کے سر میں ہوا سے خود مہری سمائی ہوئی۔ نہ صرف خود مختار تھا بلکہ ہمایہ صوبہ داروں کے ملک میں تصرف کر رہا تھا۔ ان میں سے ایک امیر شیخ ابواسحاق تھا اس کا باپ امیر محمود عراق اور فارس کے ایک حصہ کا والی تھا۔ امیر مبارک الدین محمد اس وقت بیروزہ کا حاکم تھا۔ لہذا شیرازہ امیر پیر حسین کے تصرف میں تھا۔ ایک اور امیر ملک امیر پیر حسین چوپانی والے شیرازہ کے بھائی ہندوں میں سے تھا۔ اس نے شیرازہ پر قبضہ کرنے کے لیے بہت سی جماعت فراہم کر لی۔ لہذا امیر شیخ ابواسحاق کو بھی اپنے ساتھ ملایا۔ لہذا شیرازہ کو محاصرہ میں لے لیا۔ شہر مسخر ہو گیا۔ لیکن شیخ ابواسحاق نے ملک اشرف کی خدمت میں یہ گزارش کی کہ اگر مجھے اجازت دیں میں شہر میں پہلے داخل ہو کر وہاں آپ کی رہائش کا انتظام کروں، اسکے بعد نزدیک واقعہ کے ساتھ جلوس کی صورت میں تشریف لائیں، ابالیان شہر پر آپ کا وہر بیٹھا جائے گا۔ اگر آپ فوراً داخل ہوں تو کسے معلوم ہے کہ دشمن کے آدمی گھات میں ہوں اور آپ پر کیا افتاد پڑے اس لیے یہ خدمت جاننا روں کے سپرد کریں، ملک اشرف نے شیخ کی دودا اہلیسی کی تعریف کی اور خوشی خوشی اجازت دے دی، ابواسحاق شہر میں داخل ہوا اور اپنی فوراً چاروں طرف پھیلا دی اور ساتھ ہی اہل شہر کو ملک اشرف کے خلاف ابھارے۔ یہ امن تو کسی اور امید پر ادھار کھائے بیٹھا تھا۔ جب شیخ کا قبضہ شہر پر خاطر خواہ ہو گیا اور اسے اطلاع ہوئی تو ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ عین اسی غفلت میں ابواسحاق نے اس پر حملہ کر دیا۔ بھاگتے ہی بن پڑے۔

شیخ کے لیے میدان خالی تھا۔ ناج شاہی سر پر رکھا اور شاہ شیراز ہو گیا۔
 شاہ اسماعق کو بخوبی علم تھا کہ ملک فارس میں اگر کوئی نبرد آزما اس
 کا حریف ہے تو وہ مبارالدین محمد ہے، اس لیے امیر کی بیخ کنی کی تدبیر
 سوچنے لگا۔ مبارالدین اپنی شجاعت اور سخاوت کا سکہ لوگوں کے دل پر جما
 چکا تھا اسے بھی علم ہو گیا کہ شیخ اس کی گھات میں لگا ہوا ہے۔ امیر خود
 بھی داعیہ سلطنت رکھتا تھا۔ ۱۵۱۰ء میں مبارالدین یزد میں شیخ ابواسحاق
 شیراز میں ایک دوسرے کے مقابلہ کی تیاری میں مصروف تھے۔ ماہ رمضان
 میں شیخ ابواسحاق نے پیش دستی کی اور یزد پر یورش کی۔ اگرچہ پے درپے
 دلیرانہ حملے کئے مگر شہر مسخر نہ ہوا۔ مایوس ہو کر شیراز کی طرف لوٹ آیا۔
 بروز پہار شنبہ ۱۴ جمادی الاول ۹۵۳ھ بن ہجرائے منج انگشت «
 پھر دونوں لشکروں میں مٹھ بھیر ہوئی۔ اور ابواسحاق نے شکست فاش کھالی
 اب امیر مبارالدین محمد کی بانی تھی۔ اس کا سوصلہ بڑھا ہوا تھا، شیراز پر
 فوج کشی کا ارادہ کیا۔ ابواسحاق کو اطلاع ہوئی تو قاضی عضدالدین عبدالرحمن
 کو صلح کا پیغام دے کر بھیجا۔

قاضی عضدالدین
 قاضی رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت خواجہ حافظ کہتے
 ہیں کہ

گر شہنشاہش عندکہ در تصنیف بنائے کار موافق بنام شاہ تہاد
 بلاشبہ قاضی کا احترام ہر ایک کرتا تھا۔ اب علم و فضل کا شہرہ دروزدیک
 تھا۔ ہم عراق و فارس میں آپ کے شاگرد موجود تھے اور جب کبھی شیخ
 ابواسحاق کو کوئی مشکل پیش آتی آپ کی طرف رجوع کرتا آپ اپنے اثر و رسوخ
 سے بگڑا ہوا کام سنوار دیتے مگر اس دفعہ کامیابی نہ ہوئی۔

قاضی عبدالرحمن بن احمد شیخ ابواسحاق اور مبارز الدین اور اس کے بیٹے
شاہ شجاع اور خواجہ حافظ کے معاصر تھے۔ آپ ایک واسطہ سے قاضی القضاة
ناصر الدین بیضاوی کے شاگرد تھے۔ سلطان ابوسعید اور خواجہ غیاث الدین محمد
رشیدی اور شاہ شیخ ابواسحاق اور دیگر لوگوں کے ہاں آپ کا بہت بڑا
احترام تھا۔ ابوسعید کے عہد میں منصب قاضی القضاة ممالک ایران پر
فائز تھے، سلطانید میں رہائش تھی، ملوک لہو امرا اور وزراء عموماً بصد عقیدت
مزد و نیاز بھیجتے تھے۔

شیخ ابواسحاق کے ہاں آپ کی عزت و توقیر ہر ایک شخص سے
بڑھ چڑھ کر تھی۔ اور تمام بہات ملکی میں آپ سے مشورہ لیا کرتا۔ چنانچہ
امیر مبارز الدین کے پاس آپ کو پیغام صلح کے بھیجا۔ "سیرجان" پر
ملاقات ہوئی امیر نے پچاس ہزار دینار آپ کی ذات گرامی کے لیے اور
دس ہزار نوکر چاکروں کے خرچ کے لیے پیش کیے۔ اور یہاں اپنے بیٹے
شاہ شجاع کو شاگردی کے لیے پیش کیا۔ اور نہایت احترام سے رخصت
کیا، جب امیر مبارز الدین نے شیراز پر لشکر کشی کی تو قاضی شہانکار
کی طرف چل دیئے۔ امیر شہانکار سے نہ بنی۔ اس نے آپ کو قلعہ میں قید
کر دیا۔ اور اسی قید و بند میں ۲۱ رمضان ۶۶۵ھ میں فوت ہو گئے۔

قاضی کی تالیفات حکمت و بیان و اصول میں بہت ہیں ان میں
سے مشہور ترین کتاب "مواقف" ہے یہ علم کلام میں ہے اور خواجہ غیاث الدین
محمد کے نام پر تالیف کی مگر خواجہ حافظ قطعہ کے شعر محولہ بالا میں بتائے کہ
مواقف بنام شاہ بہادہ کہتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ واقف کی شرح
شاہ ابواسحاق کے نام پر لکھی۔ اس کتاب اور اس کی شرح میر سید

شریف ہرجانی کے توسط سے علم کلام میں مشہور ترین درسی کتاب ہے دیگر
تالیفات میں "ذوالدعیاتیر" اور شرح مختصر امن حاجب مشہور ہیں۔ عثمان بن عمر
معروف بامن حاجب ۶۲۶-۵۶۰ھ نے کتاب فہمی الاصول کا خلاصہ لکھا کہ
اس کو مختصر سے موسوم کیا تھا۔ اس پر بہت علماء نے شرح لکھی۔ ان
میں سے قاضی عسکالدین کی شرح مشہور ہے۔

قاضی صاحب کی رہائش شیراز میں تھی، قیاس غالب یہی ہے کہ
خواجہ حافظ کے بھی ایسے فاضل اجل سے ضرور استفادہ اور قاضی صاحب
تصنیف و تالیف کا مطالعہ بھی کیا ہوگا۔

خواجہ حافظ شیخ ابوالسحاق کے بارہ میں قطعاً مذکورہ میں اشارہ کر
گئے کہ جب تک زندہ رہا دلو عیش دیتا رہا، خوش صورت نیک سیرت
تھا۔ پچودہ سال شیراز اور اصفہان پر حکومت کی، پچاس سوار ترک اور
ایرانی اس کی فوج میں تھے۔ شیراز میں کسرے کے ایوان واقع مدین کے
نمونہ پر ایک قصر تعمیر کیا مگر تکمیل سے پیشتر ہی فوت ہو گیا۔ اس کے عیش و
عشرت کا یہ عالم تھا کہ میدان جنگ میں بھی کوئی موقع ہاتھ سے نہ دیتا
خواجہ حافظ کا یہ شعر اس پر صادق آتا ہے کہ

"بہر وقت خوش کہ وہ منعم شاد کس را وقت نیست کہ انجام کار ^{حلیت}
امیر مبارالدین نے شیراز کو محاصرہ میں لیا ہوا تھا، بیمار کا موسم تھا۔ اپنے
نیم شیخ امین الدین جہرمی کو کہا کہ مبارک الدین عجب بے وقوف ہے
کہ اس خوشگوار موسم میں مجھے تو عیش و خوشدلی سے منع کر رہا ہے اور
خود آپ بھی اس سے بہرہ نہ نہیں ہوتا۔ اور شاہنامہ کا یہ بیت پڑھا۔
بیانا یک امشب مما شہر کینم چو فردا زسد فردا کینم

آمل کر آج رات تو رنگ رلیوں میں بسر کریں جب کل اُسے گا تو کل کا
نکر بھی کر لیں گے۔

امیر مبارالدین فتح و ظفر کا شادیانہ بجاتا ہوا شہر میں داخل ہو گیا
اور بہ نسبت ہمارے بیٹا ہوا تھا، پوچھا کہ یہ شور و غوغا کیسا ہے۔ ملازم
نے کہا امیر مبارالدین شہر میں داخل ہو رہا ہے۔ کہا کیا ابھی تک
مروک لڑا کا یہاں سے نہیں گیا۔ شیخ بروز جمعہ ۲۱ جمادی الاول ۷۵۸
اکابر شیراز کے ایک بیٹے کے ہاتھ سے مارا گیا اس کے باپ کو شیخ
نے قتل کیا تھا اس نے باپ کا انتقام مناسب وقت لیا۔
شیخ خود عالم اور ادیب تھا اس لیے دو زبانیاں محمد معین نے
نقل کی ہیں۔

افسوس کہ مرغ عمر را دانہ نمائند امید بھیج خویش و بیگانہ نمائند
ور واد درینا کہ دریں مدت عمر از ہر چہ بکفہم جز افسانہ نمائند

با پرخ ستیزہ کار مستیز و پرو باگردش چرخ در میاویز و پرو
یک کا سا زہراست کہ مرگش خوانند خوش درکش ابر بر جہاں ریز و پرو
خواجہ حافظ کے تعلقات شیخ ابواسحاق سے دوستانہ تھے،
شاہ شیخ نے ایک دفع اپنے امرا میں سے سلطان شاہ جاندار کو
امیر مبارالدین کے دشمنوں کی کمک کے لیے روانہ کیا، سلطان شاہ
امیر مبارالدین سے جا ملا۔ شاہ ابواسحاق کو سخت صدمہ ہوا اس
موقع پر وہ قصیدہ کہا جس کا مطلع ہے کہ
سپیدہ دم کہ صبا لوی بوستان گیرد چمن ز لطف ہوا نکتہ تر جہاں گیر

اس کے ضمن مدحیہ اشعار یہ ہیں کہ سے

جمال چہرہ اسلام شیخ ابواسحاق کہ ملک در قد مشن زریب بو شان گیرد
چراغ دیدہ محمود آل کہ دشمن را ز برق تیغ ری آتش ہدود ماں گیرد

اگرچہ محمد معین " اس قصیدہ کا شان نزول بھی بیان کرتا ہے جس کا مذکور
اوپر کیا گیا ہے مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ نے یہ قصیدہ اس وقت
کہاجب شاہ ابواسحاق امیر مبارالدین سے پہلی دفعہ لڑائی میں شکست
کھا کر شکستہ دل شیراز کی طرف لوٹا۔ کیونکہ خواجہ حافظ اسی شکست کی طرف
اس قصیدہ میں اشارہ کرتے ہیں۔

ملا تے چو کشیدی، سعادتے وحدت کہ مشتری نسق کار خود ازاں گیرد
شکست زدہ تو ملا مت زدہ ہو رہا ہے مگر پروا نہیں کیونکہ اس کے
بعد سعادت یعنی نیک نیتی کا وعدہ شروع ہو گا۔ مشتری ستارہ کے
دلوں حکم محسن و سعد ہیں، اس لیے امیدوار فضل و رحمت الہی رہنا
چاہئے۔

از امتحان تو ایم را غرض آنست کہ از صفائی ریاضت دولت نشاں گیرد
زلطف غیب لسنجی رخ امید تاب کہ مغز نعر مقام امد استواں گیرد
جس طرح ہڈی سخت ہوتی ہے اس کے اندر اصل شے مغز ہے جس
کی حفاظت چھلکا کرتا ہے۔ اس لیے اگر لفظ ہر سختی محسوس ہو تو
دل شکستہ نہ ہوتا چاہئے کیونکہ اصل چیز یہ نہیں، مغز ہے جو نرم
ہے۔

اس کے عبرت آمیز استقلال کی نصیحت ہے کہ سے

ماں مقام کہ میل حوادث از چپ راست چناں رسد کہ اماں از میاں گیرد

پھر غم بود کہ بہمہ حال کوہ ثابت را کہ موجہائی چناں قلزمے جہاں گیر
 اگر پھر خصم تو گستاخ میرد و علیے تو شاد باش کہ گستاخیش عناں گیر
 غالباً سلطان شاہ کی غلامی بھی عین مورکہ جنگ میں پیش آئی جو شاہ اسحاق
 کو مبارک الدین کے ساتھ پیش آیا تھا۔ اور دونوں واقعات ایک دفعہ ہی
 رونما ہوئے ہوں کہ لڑائی کے وقت سلطان شاہ مبارک الدین سے مل گیا۔
 اور شاہ کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔

شاہ کے قتل کا قطعہ تاریخ خواجہ حافظ نے لکھا۔

بلبل و سرد و سمن یا سمن و لالہ گل حسرت نامہ تاریخ وفات شہ سہیل لاکل
 خرد روئے زمیں شاہ زمن بو اسحاق کہ یہ طلعت اور ناز و خود و بر گل
 جمعہ بیت و یک از ماہ جمادی الاول در پسین بود کہ پیوستہ شد از خرد بل
 بلبل، سرد، سمن، یا سمن، لالہ گل کے عدد ۵۷۷ ہوتے ہیں مگر شاہ اسحاق
 کا قتل ۵۷۸ میں واقع ہوا ایک عدد کم ہے۔ معلوم نہیں کہ غلطی کتابت
 کی ہے یا لالہ گل، لالہ گل کی جگہ ہے۔

دوسرا قطعہ تاریخ یہ ہے

بروز کات و الف از جمادی الاول بسال ذال و دیگر حادثوں علی الاطلاق
 ضایعہاں سلاطین مشرق و مغرب خدیو کشور عنود و کرم با اسحاق
 سپہ علم و حیا آفتاب جاہ و جلال جمال دینی و دین شاہ شیخ ابوالسحق
 مہاں عرصہ میدان خود بہ تیغ عدد بہادر و دل اجاب توفیش تاریخ فراق
 کات کے عدد بیس اور الف کا ایک یعنی بتاریخ ۲۱ جمادی الاول، ذال
 کے پھر سو اہ "ح" کے آٹھ اور "ن" کے پچاس ہیں اور یہ ۵۷۸
 ہے۔

امیر مبارک الدین محمد

امیر مبارک الدین امیر شرف الدین مظفر کا بیٹا ہے۔ اور شرف الدین بن منصور بن غیاث الدین

عاجی خراسانی ہے جس کا مذکور ہو چکا ہے۔ امیر شرف الدین سلطان اولجایتو کی طرف سے منصب امارت ولایات میں کرمان شاہ و لرستان تاجرات اور مرو اور ابرقو پر منتصب تھا۔ اس کی تعدی سے لوگ نالاں تھے، جب امیر شرف الدین فوت ہوا مبارک الدین کی عمر کوئی سترہ سال تھی، امیر بدر الدین ابو یکر برادر زادہ اہل عاماد امیر شرف الدین مظفر مبارک الدین اور اس کی بڑی بہن زویہ بدر الدین مذکور کو ساتھ لے کر سلطان اولجایتو کے پاس حاضر ہوا راستہ میں چند ڈاکوؤں سے لڑنا پڑا۔ ڈاکو کچھ تو مارے گئے اور باقی بھاگ کھڑے ہوئے۔ بدر الدین ان کے سر کاٹ کر سلطان کے حضور لایا، ابلیخاں اولجایتو بہت خوش ہوا اور ان راستوں کی حفاظت پر مبارک الدین کو مامور کیا جو ریزوں کی دہر سے مسرود ہو رہے تھے، مبارک الدین اولجایتو کی آخر عمر تک اس کے لشکر میں رہا، جب ابو سعید اس کا بیٹا سلطان اولجایتو کی جگہ تخت پر بیٹھا مبارک الدین کو منصب پر بحال رکھا۔ شاہ میں شاہ ابو سعید نے مبارک الدین کو میدان کی طرف بھیجا۔ اس وقت آتا تک یزد عاجی شاہ تھا۔ سید محمد الدین محمد یزدی سمعہ فارس کی طرف سے شاہ ابو سعید بدظن تھا۔ اس کی گرفتاری پر مبارک الدین آتا تک کو مامور کیا شاہ میں امیر غیاث الدین کیمز و برادر شیخ ابواسحاق اینجوہ شاکارہ، سے یزد میں فارغ ہوا۔ اور آتا تک عاجی شاہ بن یوسف شاہ سے یارانہ لگتا تھا اس کے بعد میدان میں آیا، لہذا مبارک الدین سے بھی دوستی ہو گئی۔ لیکن امیر غیاث الدین کیمز و کے نائب اور آتا تک عاجی شاہ میں کسی دہر

سے نزاع پیدا ہو گیا۔ اتاتک نے نائب کو مار ڈالا، کینرو اور مبارزے سلطان ابوسعید کے پاس استغاثہ کیا۔ اور سلطان کی اجازت سے اتاتک پر حملہ کر دیا۔ اس طرح ۷۱۸ھ میں سلسلہ اتابکان یزدختم ہو گیا اور سلطان ابوسعید کی طرف سے مبارز الدین کو یزد کی ولایت تفویض ہوئی۔ مبارز الدین نے رہزنیوں کا قلع قمع خاطر خواہ کیا اور ملک میں امن قائم کر دیا۔ ۷۲۹ھ مبارز الدین نے قلعہ مخم شاہ دختر قطب الدین شاہ جہاں بادشاہ فرحتی کرمان سے عقد نکاح کیا۔ اس کے بطن سے تین بیٹے شاہ شجاع اور شاہ محمود اور سلطان احمد پیدا ہوئے۔

ہم بیان کر چکے ہیں کہ شاہ ابوسعید کی وفات کے بعد ملک کے طول و عرض میں بدامنی اور بد نظمی کا دور دورہ شروع ہو گیا تھا۔ ہر ایک عالی ولایت خود مختار تھا۔ لہذا اپنی ولایت کو دسوت و بینے کے لیے ہمسایہ دلیاں سے دست و گریباں پورہ ہاتھ مارا۔ اس وقت شاہ شیخ ابواسحاق اور اس کے بھائیوں کے تصرف میں تھا۔ ۷۳۷ھ میں شیخ اپنے بھائی جلال الدین مسعود شاہ کے امر کے تحت یزد کی طرف بڑھا مگر اس وقت امیر مبارز الدین احترام کے ساتھ پیش آیا۔ اس لیے شیخ نے کرمان کی طرف رخ کیا۔ لیکن فالپی کے وقت پھر یزد پر اُدھکا۔ لیکن یہاں منہ کی کھائی تو غالباً قاضی عند کے ذریعہ پیمان صلح باندھا۔ لہذا شیراز کی طرف لوٹ گیا۔ ۷۴۷ھ میں امیر پیر حسین پوہانی یزد میں امیر مبارز الدین کے پاس کمک کی درخواست لے کر آیا۔ اسے شیخ ابواسحاق نے کرمان سے بے دخل کر دیا۔ امیر اور اس نے شیراز پر چڑھائی کی جلال الدین مسعود شاہ کا ذادن کی طرف بھاگ گیا۔ امیر پیر حسین نے کرمان مبارز الدین کے سپرد کر دیا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد امیر پیر حسین سے نہی۔

امیر حسین نے شیخ ابواسحاق سے رشتہ دوستی گانٹھا مگر شیخ کے بھائی کو
 امیر پر حسین قتل کر چکا تھا اس لیے شیخ دراصل انتقام کی فکر میں تھا۔
 بظاہر دوستی کا دم بھرنا رہا علاوہ ازیں حکومت فارس جس پر اب امیر حسین
 چھایا ہوا تھا اپنے خاندان کا سخی سمجھتا تھا۔ جس وقت ملک اشرف برادر
 شیخ حسن کو چک چوپانی کیخبر عراق کے ارادہ سے ادھر آیا تو شیخ نے
 باوجود مخالفت امیر پر حسین اس کی رفاقت اختیار کی۔ امیر حسین ملک
 اشرف کے چچا کا بیٹھا تھا۔ امیر حسین نے شیراز سے ان کے مقابلہ کے لیے
 حرکت کی تو شکست کھائی۔ بھاگ کر سلطانیہ میں آیا اور یہاں اسے زہر دیا گیا
 اب ملک اشرف لہد شیخ اسحاق دونوں شیراز کی طرف بڑھے، ہم
 بیان کر چکے ہیں کہ شیخ ابواسحاق نے یہاں اپنا سکہ جمایا اور ۷۲۲ھ
 میں شیراز اس کے قبضہ تصرف میں آگیا۔ ۷۲۳ھ میں ملک اشرف یزد میں
 مبارک الدین کے پاس بغرض ملک آیا جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں، مبارک نے
 مدد تو دی مگر کام نہ بنا۔ اور فارس بدستور شیخ اسحاق کے قبضہ تصرف
 میں رہا باقی حالات ہم بالا خصار شیخ ابواسحاق کے حالات کے تحت بیان
 کر چکے ہیں۔ امیر مبارک نہایت تند خو اور داشت گو تھا، بات بات پر
 لوگوں کے قتل کا حکم دینا، اپنے بیٹوں سے ہی نہ بنی، کبھی کبھی غضب
 میں آکر کہتا کہ میں تمہاری آنکھیں نکلا دوں گا۔ شجاع و محمود دونوں ڈرتے
 تھے اور باپ سے دور دور رہتے اور آخر بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس
 کے بعد شاہ سلطان سے سفارش کی، وہ بھی باپ سے رنجیدہ تھا۔
 ۱۰ ماہ رمضان ۷۵۹ھ میں مبارک کو گرفتار کر کے پہلے قلعہ طبرک اصفہان میں
 قید کیا چار روز بعد آنکھوں میں سلائی پھیر دی، اسی نا بینائی کی حالت میں

ماہ ربیع الاول ۱۹۶۵ء میں مر گیا۔ یہ واقعہ ایسا جبروت انگیز تھا کہ کئی شعرا نے اپنے قطعات کا موضوع بنایا۔ مولانا صدر الدین عراقی فرماتے ہیں۔

یک چند شکوہ ہمتش پیل کشید

ہمیانہ دولتش پوشد مالامال

ہم دوشنی چشم خودش سبیل کشید

ہم یعنی بیٹے ہی نے آنکھیں نکلا دیں

آنکہ از کبر بکو جب می دید

آنکہ می گفت شیر شرزہ منم

قرۃ العین کرد چشمش کور

تا بدانی کہ با سعادت و بخت

بر نیاید کسے بگردی و زور

اس واقعہ کا اثر خواجہ حافظہ کے حل و دماغ پر جو کچھ بھی ہوا ایک قطعہ میں واضح کیسے ہے۔

حل منہ بر دنیا و اسباب او

فانکہ از ورے کس و قاحالی ندید

دنیا بعد اس کے اسباب سے حل نہ لگا، کیونکہ اس نے کسی سے دعا

نہیں کی رہے

کس غسل بے پیش ازیں دکان نخورد

کس طب بے خار ازیں بستاں نچید

یہ دنیا اور اسباب یا عیش و دنیا ایسا شہد ہے کہ بغیر زہریلے ڈنگ

کے کوئی ذائقہ شناس نہیں ہو سکتا، یہ ایسا سبز باغ ہے کہ اس

تازہ میوہ کو جب تک کاٹا نہ چبے کوئی ہاتھ نہیں لگا سکتا۔

ہر کہ ایسے چراغ بر فروخت

چوں تمام افروخت بادشہ دید

جس کسی نے محفل نشاط روشن کرنے کے لیے دیا جلا یا جب جلا

چکا ہوانے بجھا دیا۔

بے تکلف ہر کہ دل بروئے تلو چوں بدیدم خصم خود می پرورید
 جس نے بھی اس سے دل لگایا میں نے غور کیا تو یہی معلوم ہوا کہ اپنے ہی
 دشمن کو پال رہا ہے۔

شاہ غانی خسرو گہتی ستاں آنکہ از شمشیر او خون می چکید
 وہ غانی بادشاہ (مبارک الدین) جو ایک دنیا کو مسخر کر رہا تھا۔ جس کی تلوار
 سے لہو ٹپکتا تھا۔

گر بیک حملہ پاسے می شکست گم بہوئے قلب کو سبے می درید
 کبھی ایک ہی حملہ سے فوج کو شکست دیتا، کبھی اس کے ایک نعرہ جنگ
 سے پہاڑ کا دل دہل جاتا۔

سردراں راسبے گنہ می کرد جس گردتاں راسبے سخن سر کی لید
 بڑے بڑے سرکش سرداروں کو ناکردہ گناہ قید و بند میں رکھتا، کئی گردنوں سے
 بلاہد سس سرانہ دیتا۔

از نہیش بنجہ می انگند شیر در بیاباں ہم او چوں می شنید
 اس کے خوف سے شیر بھی اگر بیاباں میں اس کا نام سن پاتا پنچے
 جھاڑ کر رہ جاتا۔

عاقبت شیراز و تبریز و عراق چوں مسخر کرد و قتش در دید
 آخر کار جب شیراز، تبریز، اور عراق مسخر کر چکا اس کا آخری وقت بھی
 آیا۔

آنکہ دوشن بدبہاں بنیش بربراد میل در چشم جہاں بنیش کشید
 خود اس کے بیٹے نے جو اس کا نوردیدہ تھا اور جس سے اس کی آنکھوں
 میں دنیا جہاں دوشن تھا اس نے اس کی آنکھوں میں سلائی پھیر کر اندھا

کر دیا۔

امیر مبارک الدین نے چار سال اسی نابینائی میں بسر کیے۔ اگرچہ شاہ شجاع نے سدا و خطیبہ اسی کے نام پر جاری رکھا مگر برائے نام ہی تھا۔ ۶۵ھ میں فوت ہو گیا۔ لحد مدسہ مظفریہ میں جو اسی کا تعمیر کردہ تھا مدفون ہوا۔

امیر جلیا کچھ امور سلطنت میں سخت گیر تھا، امور شرعیہ میں بھی ویسا ہی سخت گیر تھا۔ شیراز کے زندہ دل اسے محتسب کہتے، خود اس کے بیٹے شاہ شجاع نے ایک رباعی میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے کہ
 مجلس و ہر ساز مستی بست است نہ چنگ بقائل صحت دوست است
 دنیاں بہر ترک سے پرستی کر دند خبر محتسب شہر کہ بے مے مست است

اس نے تمام لوازمات عیش و مستی کو قفل لگا کر بند کر دکھا ہے۔ نہ گانے بجاتے گا نا مان اس کے پنجر میں ہے اور نہ دف ہاتھ میں ہے رندوں کا کیا ذکر ہے جو مے پرستی ترک کر چکے ہیں صفت ایک حضرت محتسب رہ گئے ہیں جو بن پئے مست ہیں، خواجہ حافظ کے اکثر اشعار میں محتسب کا اشارہ امیر مبارک الدین ہی کی طرف ہے۔ ایک غزل کا مطلع ہے کہ
 عالی کہ چنگ و عود پر تصریری کند نہاں خودید بادہ کہ تفسیری کند
 اس کا ایک شعر ہے

می دہ کہ شیخ و حافظ و مفتی و محتسب چوں نیک و بگری بہر تزییری کند
 مجھے شراب پلائے جا، یہ جو شیخ لحد حافظ اور مفتی اور محتسب بنے پھرتے ہیں جب تو ابھی طرح ان کا جائزہ لے گا تو بہت دیا کار ہی نکلیں گے۔
 ایک اور غزل کا مطلع ہے

اگرچہ بادہ ذرخ بخش و باد گلینز است بیانگ چنگ موزمی کہ محتسب تیز است
اگرچہ موسم پینے پلانے کا ہے کہ شراب فرحت بخش موجود ہے اعلیٰ باد بہار دل و
دماغ کو معطر کر رہی ہے مگر شراب سرور کے ساتھ نہ پی حالانکہ رقص و
سرور بھی اس کا لازم ہے اس لیے محتسب نہیں پونگتا۔

دو آئین مرقع پیالہ پنہاں کن کہ بچو چشم صراحی زمانہ خوزریز است

شراب کے پیالہ کو آئین کی تہ میں چھپا کر پی اس لیے جس طرح صراحی کی آنکھ
سے سرخ رنگین شراب انڈیلی جاتی ہے اسی طرح زمانہ بھی خوزریز ہے۔

صراحی و عریضی گرت بختگ افتد بعض کوش کہ ہم فتنہ انگیز است

اگر شراب سے بھری ہوئی صراحی اور کوئی ہمنشین اتفاق سے ملتا ہے اسے
تو کچھ عقل سے بھی لینا چاہئے۔ اس لیے کہ زمانہ فتنہ انگیز ہے۔ حریف
کا ذکر اس لیے کیا کہ عیش تنہائی بے مزہ ہوتا ہے، آپ دیکھیں گے کہ
عیش ہمیشہ جمع اسباب ہی میں ہوتا ہے۔ لود چلے اور چھپ کے پینے
میں بھی کچھ لطف نہیں چنانچہ خواجہ اسی نفسیاتی پہلو کو ملحوظ رکھ کر کہتے
ہیں کہ

شراب و عیش نہاں چیت کار بے بنیاد۔ زودیم بر صفت رنداں دہر چہ باعا باد
شاہ شجاع شاہ شجاع باپ کی زندگی ہی میں تخت و تاج کا مالک
ہو گیا تھا۔ مدت سلطنت بعد وفات امیر مبارز ^{۱۸۹۶}

تک رہی۔ ابوالقوارس جلال الدین شاہ شجاع نے تخت نشینی کے بعد
اپنے بھائی شاہ محمود کو ابرو اور عراق عجم لے کر ماں لور دوسرے بھائی
عماد الدین کو دے دیا۔ شاہ شجاع کا وزیر خواجہ قوم الدین محمد۔
امیر مبارز الدین کے پانچ بیٹے تھے۔ شاہ شجاع اور شاہ مظفر شاہ محمود

سلطان احمد، دیو یزیدہ شاہ مظفر ۷۵۲ھ میں جبکہ امیر نے شیرازہ کو
محاصرہ میں لیا ہوا تھا فوت ہو گیا۔ شاہ مظفر کی دو بیٹیاں اور چار لڑکے
شاہ یگی اور شاہ منصور اور شاہ حسین اور شاہ علی تھے۔ ان چاروں میں
یگی سب سے بڑا اور امیر مبارالدین کو بیعت پیارا تھا۔ اور اسی کو اپنا
جانشین بھی نامزد کرنا چاہتا تھا۔ جب شاہ شجاع اور دوسرے بیٹوں
کو یہ حال معلوم ہوا تو ناچار وہی کام کیا جو تاریخ ہند میں غازی اورنگ
زیب عالمگیر نے اپنے شاہجہاں سے کیا۔ اورنگ زیب نے تو قلعہ آگرہ
کی چار دیواری میں بند رکھا اور ہر ممکن آرام و آسائش کے سامان جیا کر
دیئے مگر شاہ شجاع نے باپ کی آنکھیں نکلوا دیں۔ اس کے سوا ہم اور کیا
کہیں کہے

رموز سلطنت خویش خرواں مانند گدائے گوشہ نشینی تو حافظا محمدش

ایسے واقعات سے ہر ایک قوم اور ملت تاریخ بھری پوری ہے۔
شاہ شجاع تخت نشین ہوا تو یگی کو گرفتار کر کے شیرازہ کے قلعہ قہنڈر
میں قید کیا۔ یگی نے قلعہ دار کو لگائٹھا اور قلعہ کی فوج کو بھی اپنے ساتھ ملا
لیا۔ اب پچا اور بھتیجہ میں مقابلہ شروع ہو گیا۔ شاہ شجاع نے قلعہ کو
محاصرہ میں لیا مگر مستحضر نہ کر سکا۔ آخر دونوں میں اس شرط پر صلح ہو گئی کہ
یگی قلعہ شاہ شجاع کے حوالہ کر دے۔ اور یزیدہ میں چلا جائے اور وہاں
عم بزگوارہ شاہ شجاع کی طرف سے اور شاہ کے نام پر والی ہے۔ چنانچہ
یگی ہند میں آیا اور اس پر تصرف جما یا۔ اور یہاں اپنی خود مختاری کا اعلان کر
دیا۔ شاہ شجاع نے لشکر کشی کی، آپ تو ابرقہ میں ٹھہر گیا اور وزیر خواجہ قوام الدین
کو یزید کی تسخیر پر مامور کیا۔ وزیر نے محاصرہ سختی سے ڈالا تو شاہ یگی بھی نرم

پڑ گیا۔ اور عم بزرگوار کی خدمت میں معذرت نامہ ارسال کیا۔ شاہ شجاع نے
قصور معاف کر دیا اور وزیر کو واپسی کا حکم دیا۔

۱۷۱۵ء میں شاہ محمود نے بھی اعلان خود مختاری کیا۔ شاہ محمود ابرو اور
اصفہان کا والی تھا۔ خود مختاری کے ساتھ ہی یزد سے کہ عراق پر فوج کشی کی۔
شاہ شجاع نے اصفہان پر یورش کی۔ اس اثنا میں شاہ محمود کے سپاہیوں
نے شاہ سلطان کی سپاہ پر چچا پر مارا۔ اور شاہ سلطان کو گرفتار کر کے
شاہ محمود کے پاس لائے۔ شاہ سلطان ہی تھا جس نے شاہ شجاع کے ایما
پر امیر مبارالدین کی آنکھوں میں سلتلی پھیر دی تھی۔ شاہ محمود نے یہی سلوک
اس سے کیا۔ مولانا صدرالدین عراقی نے جو امیر مبارالدین کا مداح تھا ایک
رباعی لکھی۔

گردت تلک چشم ترا بیل کشید در ذات شریف تو جہاں نفس نید

ہو کس کہ بدای چشم تو آسیب رساند اونیز بعینہ مکاتلش دید

شاہ شجاع اور شاہ محمود میں آخر صلح ہو گئی اور یہ قرار پایا کہ شاہ محمود
بہستور اصفہان وغیرہ کا والی رہے مگر سکھ لوہ خطبہ شاہ شجاع کے نام کا
جاری رہے گا۔ شاہ محمود نے ناچار یہ شرط منظور کر لی مگر سر میں وہی ہوائی
خود سہری تھی۔ سلطان لوہیں جلائے شاہ آفندہ بایجاں کو اکسپا کہ شاہ شجاع کا
لداہ تہریز کی تسخیر کا ہے اگر میری مدد کریں تو شاہ شجاع کو نیچا دکھاؤں
سلطان لوہیں نے اپنے لداہ فوج شاہ محمود کی مدد کے لیے روانہ کر دی۔ اس
متمذہ لشکر سے ۱۷۱۵ء میں شاہ محمود نے شیراز کو محاصرہ میں لیا۔ آخر بھائیوں
میں صلح ہو گئی اور اس شرط پر کہ شیراز شاہ محمود کے قبضہ میں دیا جائے اور
شاہ شجاع ابرو کی طرف چلا جائے۔ اس پر عمل ہوا۔ شاہ شجاع نے تھوڑے

عرصہ میں پھر جمعیت اور قوت فراہم کر لی اور کرمان لے لیا۔ شاہ محمود نے
شاہ یحییٰ کو مقابلہ کے لیے روانہ کیا۔ لیکن شاہ یحییٰ عم بزرگوار سے مل گیا
اہل شیراز بھی شاہ محمود کے ظلم سے تنگ اُچکے تھے۔ ہمارے خواجہ حافظ بحر
مل سے شاہ شجاع کا تسلط چاہتے تھے۔ شاہ مظفر کا بیٹا شاہ منصور
یعنی شاہ یحییٰ کا بھائی شاہ شجاع کی کمک کو پہنچ گیا۔ شاہ محمود نے بھاگ
کر جان بچائی۔ شاہ شجاع پھر سے شیراز پر متصرف ہو گیا۔ اس موقع
پر خواجہ حافظ نے ایک غزل لکھی۔

بشری اذا السلامت حلت بنی سلم لله حمد معترف غاتیرہ النعم

مژدہ باد کہ محبوب فی سلم میں داخل ہو گیا۔ ذی سلم یا سلامتی کا شہر شیراز
ہے، مطلب یہ ہے کہ معشوق بخیر و عاقبت و سلامت شہر میں داخل
ہو گیا ہے۔ تمام حمد و ثنا اللہ ہی کے لیے کہ اعتراف کے ساتھ شکر نعمت
کا یہی تقاضہ ہے۔

اں خوشخبر کجا ست کزیں فتح مژدہ داد تا جان فشانمش چو زرد سیم دم قدم
وہ بشارت فتح دینے والا کہاں ہے جس نے یہ خوشخبر سنائی تاکہ میں اس
کے قدموں پر زرد سیم کی طرح جان نثار کروں۔

از بازگشت شاہ پر خوش طرز نقش بست آہنگ خضم او بسرو پردہ علم

بادشاہ کی حلبی پر عجیب و غریب نقش پردہ علم پر کھینچ گیا کہ دشمن اس کی
لوٹ میں آگیا۔

پیمان شکن ہر آئینہ گرو شکستہ دل ان الہمد عند ملوک کہنی ذم

عہد و پیمانوں کو توڑنے والے دل ہر طرح ٹوٹ کر رہ جاتا اس لیے کہ بادشاہ
کے نزدیک عہد کا پاس کرنا لازم ہے۔

قد نزل غم فنادہ سپہیں لبطعہ گفت الل تو ندمت و ما منع الندم

اس شعر میں اشارہ قرآن شریف کی ایک آیت کی طرف ہے۔ جس میں فرعون کی غرقابی نیل میں منکود ہے کہ جب فرعون نے محسوس کیا کہ وہ غرق ہونے کو ہے تو کہا کہ میں بنی اسرائیل اور موسیٰ اور ہارون کے خدا پر ایمان لایا۔ ارشاد الہی ہوا اب ایمان لا بہا اور اس سے پیشتر تو سرکش تھا۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص یعنی سلطان محمود شیل کے غم میں ڈوبا ہوا تھا کہ سپہری یعنی ذات پاری تعلقے نے جو علی کل شیء محیط ہے زبرا تو بیخ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ اب اپنے اعمال تا شایستہ پر تادم ہو رہا ہے اس وقت کی ندامت تجھے کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔

می جست از سحاب ال رحمتے ولے جزویدہ اش معایئعنہ بیرون ندام
امید کے بادل سے باران رحمت ٹپک رہا ہے لیکن اس کا مشاہدہ اہل نظر کی آنکھوں سے باہر ممکن نہیں۔

ساتی بیا کہ وود گل است و زمان علیش بیٹش آر جام و بیچ مجز غم ز بیٹش و کم
ای ساتی موسم بہار میں گل کا دور تجمل ہے اور علیش و عشرت کا بھی وقت مناسب ہے تو بھی آ اور شراب سے لبریز پیالہ کو ہمارے سامنے دور سے اور فکر بیش و کم کو بھلا دے۔

سے دل تو جام جم لطیب ملک جم خواہ
کیں بود قل بلبل بتا نرائے جسم
ان اشعار کے بعد خواجہ حافظ نصائح کی طرف گریز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان انقلابی واقعات مشاہدہ کرنے کے بعد تو نے سمجھ لیا ہوگا کہ

کہاں ہے دارا کہاں ہے سکند کہہاں ہے کسری کہاں ہے قیصر

شکستہ میں ان وہ پر زمانہ عبرت نگار ہے (ملفوظ)

اس لیے اسے دل ہوس ملک جمشید نہ کر کہ اس کی جاہ و حشمت چن

یعنی ہے البتہ جام جمشید کے باغ حشمت کی بلبل اپنے نغموں میں پہلے

ہی سے چکی ہے۔ خواجہ حافظ نے اس شعر کے مضمون اور مفہوم

کو مختلف دل کش پیرایہ میں واضح کیا ہے۔ ایک شعر ہے۔

کمند صید بہرامی بختین جام جم بر او

کہ من پشمودم این محرانہ بہرام است و نے گوش

بہرام کا قصہ مشہور ہے کہ گورخر کا شکار لکڑیا کرتا۔ مطلب شعر یہ ہے

کہ وہ کمند جو بہرام گور کے شکار کے لیے استعمال کرتا تھا پھینک دے

اور جام جم اٹھالے۔ یہ مشہورہ میں اس لیے دے رہا ہوں کہ میں نے

اس محرانے دنیا کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک چھان مارا، نہ

تو بہرام کا اود نہ اس کی قبر کا نشان کہیں ملا۔ لفظ گد کے دونوں معنی ہیں

ایک تو گور خروہ جس کا شکار بہرام کیا کرنا اود دوسری قبر یعنی آج بہرام کی قبر

کی خاک بھی دکھائی نہیں دیتی، سے

چوں خون خصم ہجو صراحی بے بختی

باورستان بعیش و طرب گیر جام جم

اب جبکہ تو نے دشمن کا ہجو صراحی کی رنگین شراب کی طرح بہا دیا

کے ساتھ بیٹھ کر عیش و نشاط کی محفل گرم کر اود جام جم نوش کر۔ سے

بشنود جام بادیہ کہ این نال نوحوس

بیار کشت شوہر چوں کب قباد جم

صراحی کی قفل سے جو آواز آرہی ہے اس پر بھی کان دھرنا چاہئے
 سنا چاہئے کہ کیا کہہ رہی ہے کہ اس نال دنیا نے جو سجیلی نوپلی دلہن
 کی طرح کرشمہ دکھا رہی ہے اس نے بے شمار شوہروں کو خاک و خون
 میں ملا دیا ایسے شوہر جو کیقتاد اور جہم کی شان رکھتے تھے، اس مضمون
 کو بھی خواجہ حافظ نے مختلف پیرایہ میں ادا کیا ہے۔ ایک شعر ہے کہ

مجو دوستی عہد از جہاں کست نہاد

کہ این عجزہ عروس ہزار داماد است

دنیا کی بنیاد ہی بودی ہے اور گذشتنی اور گناشتنی ہے اس لیے
 اس سے یہ توقع ہی عبث ہے کہ اس کا عہد و پیمان استوار ہوگا یہ
 بڑھیا تو ہزاروں داماد کی دلہن ہے ایسی ہر جانی، گشتی سے وفا کی امید
 خام خیالی ہے۔۔۔

حافظ کلچ میکہہ وار و قسرا گاہ

کا لطیفی الحدیقہ واللیٹ فی التذہم

حافظ نے میکہہ کے گوشہ میں قیام و قرار الیا پکڑا ہوا ہے۔

جیسے طائر باغ میں چھپاتا ہے اور شیر جنگل میں آناخانہ بلا خوف و خطر
 پھرتا ہے۔

محمد معین اپنے مذکرہ حافظ شیریں سخن میں لکھا ہے کہ "شیراز
 میں مزاجت کے بعد شاہ فجاج نے شیراز میں اصول مذہب تسنق کو
 تقویت دی اور تربیت علماء دین کی اور لوگوں کی بہبودی میں کوشش
 کی اور باپ کی روش اختیار کی اور خلفا جاسکی جو اس وقت مصر میں مقیم
 تھے ان کی بیعت کی۔ بالخصوص ۱۱۷۷ھ میں علماء دین نے القاہرہ کے بعد محمد بن

ابوبکر کی بیعت کے لیے نامے لکھے اور ان کو نامود کیا کہ خلیفہ کا نام خطبہ میں داخل کریں۔

ان اہل بیتوں کا تذکرہ جو شاہ شجاع کو شاہ محمود سے پیش آئیں۔ اس سے زیادہ ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ اس زمانہ کے عام حالات سمجھنے کے لیے بھی کافی ہیں۔ شاہ شجاع کی مدت سلطنت چھبیس برس ہے اور اس عرصہ میں اس نے باغیوں کا قلع قمع کیا۔ ممالک مسخر کیے اور اپنے باپ امیر مبارک الدین کی طرح شجاع اور متدین تھا۔ نو سال کی عمر میں قرآن حفظ کیا اور شعائر دینی کے قیام و استحکام میں نہایت سعی کی۔ بادشاہ بھی تھا اور فاضل اور شاعر اور شعر دوست و ادب پرورد تھا۔ قاضی عند الدین ابی اور دیگر علماء عصر سے تحصیل علم کی۔ حافظ بھی بلا کا تھا کہ بارہن کر سات آٹھ عنی شعر ذہن میں محفوظ ہو جاتے آپ بھی عربی اور فارسی میں شعر کہتا زمانہ کے دستور سے اس کا کلام صنائع ہو گیا۔ چند قطعات اور رباعیات مذکوروں میں محفوظ ہیں۔

مدسہ دارالاشعاشیرازہ اسی نے تعمیر کیا اور سید شریف ہرجانی کو مدرس و مدرسین کے لیے نامود کیا۔ غالباً آپ بھی مولانا قاسم الدین کے طبقہ مدرس میں شامل ہونا رہا۔

عماد فقہ اور خواجہ حافظ شاہ شجاع کے ہم عصر تھے۔ آغاز سلطنت امیر مبارک الدین کے محتسب کی سختی دفع ہو گئی تو خواجہ کی خوشی کی بھی کوئی انتہا نہ رہی ایک غزل میں اس کا اظہار کرتے ہیں۔

سحر زہائف غلبم رسید مژدہ بگوش
کہ فار شجاع است می ولیر بنوش

صمد ہائف غیب کی طرف سے خوشخبر میرے کانوں میں پڑی کہ اب

تو شاہ شجاع کا دور حکومت ہے۔ کوئی بندش نہیں رہی اس لیے بے خوف و
خطر دلیرانہ شراب پیو۔

فد آئندہ اہل نظیر کفارہ کی رفتار ہزار گونہ سخن بردہاں لب خاموش
وہ دن گئے جب اہل نظر پختے ہوئے کفارے کفارے پتے تھے۔ منہ میں شکوہ
و شکایت کی باتیں تو ہزاروں تھیں مگر لب بند تھے۔ ٹھیک اسی طرح ہمارے
زمانہ میں سینٹی ایکٹے کا عمل و اثر ہے۔

بیانگ چنگ جو تم اک سکا پیتا کہ از ہفتن آں دیگ نیمہ می زبوش
اب چنگ کی زبان سے علانیہ وہ وہ شکایتیں برسبیل شکایت بیان کریں گے
کہ جن کے اظہار کے لیے ہمارا سینہ دیگ کی طرح بوش مارنا تھا اور دل کی
دل ہی میں تھیں۔

شراب خانگی ترس محسب خود وہ بروئے یار بنو شیم و بانگ نوشاوش
محسب کا ڈرا اس قدر چھپایا ہوا تھا کہ شراب گہریں وہی بیٹھی تھی اب تو دوست
کے رو رو پیٹینگے اور دل کھول کر پیں گے۔

زکوئی میکہہ دوشش بدوش می بروند اہم شہر کہ سجادہ می کشید بدوش
حضرت اہم شہر جو کل تک سجادہ کند ہے پر اٹھائے پھرتے تھے آج جناب
کو دیکھا بار دوست ان کو جلوس کی صورت میں کندھوں پر اٹھائے ہوئے
بیخانہ کی طرف لیے جا رہے تھے کہ یہاں امامت دنیاں کیجئے۔
ولا دلالت خیرت کم براہ نجات مکن لفسق مباحات فذہدم مفروش
ای دل میں تجھے نیک راستہ کی طرف رہنمائی کرنا ہوں جو نجات کا راستہ
ہے کہ فسق کا مرتکب ہو رہا ہے تو اس پر فخر نہ کر اور اگر نہ بد و تقویٰ تیرا شمار
ہے اور تو بیاکاری سے اجبر ضائع نہ کر۔

محل نور تجلی است رائے نور شاہ چو قرب او طلبی در صفائی نیت کوش

حدیث شریف ہے کہ مومن کے نور فراست سے ٹھنڈا۔ اس نور کی روشنی میں تمہارے دل کے ارادے اس پر منکشف ہو جائیں گے اس شعر میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔ رائے کے معنی میں مشاہدہ خواہ نظری ہو یا عقلی، چونکہ بادشاہ کا دل نور تجلی کا مقام ہے اس لیے تمہاری نیت کا حال اس روشن ہو جائے گا۔ اس لیے اگر اس کا قرب مطلوب ہے تو نیت صاف رکھو یعنی نیک نیتی ہونی چاہئے۔

بجز ثنائی جلالش مساز درد ضمیر کہست گوش دلش محرم پیام سروش

جو بات تیرے دل میں آئے وہ بادشاہ کے جلال کی طرح ہی ہو اس لیے کہ بادشاہ کا دل فرشتہ کے قیام سے واقف ہے۔ یعنی بادشاہ حق و باطل میں تمیز کر سکتا ہے اس لیے تو اگر اس کے جلال کی طرح کرے گا تو وہ فوراً معلوم کرے گا آیا یہ بات تو نے صدق دل سے کہی ہے یا یونہی بات بنا رہا ہے جلال الدین شاہ شجاع کا نام ہے۔

رموز مملکت خویش خسرواں و آند گدائی گوش نشینی تو حافظا مخدوش

یہ سچی بات اور سچا واقعہ کہ خواجہ حافظ کے ممدوح شاہ شجاع نے اپنے باپ مبارک الدین سے کیا سوچا کیا خواجہ حافظ کے دل میں ضرور کھٹک رہی ہے اور یہ طرح کے خلاف ہے۔ اس لیے اس کی نسبت اتنا ہی کہا کہ بادشاہ اپنی مملکت کے رموز سے خوب واقف ہوتے ہو کرتے ہیں اس کے جواز کی دلیل بھی ان کے پاس ہوتی ہے اس لیے مجھ جیسا ایک گدائے گوش نشین مملکت کے رموز سے نہ واقف ہو گا اور نہ اسے واویلا کرنا چاہئے۔

بقول خواجہ حافظ شاہ شجاع کا وعد حکمت و شرع ہے۔

بہیں ہلال محرم بخواہ ساغر مارج کہ ماہ امن و اماں است و سال صلح و صلاح
 اہل مکہ نے چار ماہ ایسے مقرر کر رکھے تھے جن میں امن شکن جنگ و جدل
 ممنوع قرار دیا تھا۔ ان میں سے ایک محرم ہے اور محرم کی حرمت اس کے
 نام سے ظاہر ہے۔ یہ چار ماہ سفر حج کے لیے مقررہ تھے۔ غرض یہ کہتی کہ
 لوگ دود و نزدیک سے جب حج البیت کے لیے آئیں تو امن سے آئیں
 اور تین دن ایام حج گزار کر بلا خوف و خطر ان چار ماہ میں گھروں کو لوٹ جائیں۔
 خواجہ حافظ فرماتے ہیں کہ محرم کا چاند دیکھ کر شراب کا ساغر طلب کر کیونکہ
 یہ امن کا مہینہ ہے۔ اور صلح و صلاح کا کہ سال کا مہینہ شروع ہے۔
 اسلامی سال ماہ محرم سے شروع ہوتا ہے۔

خواجہ کے مذہب پر ہر ایک تذکرہ نویس نے بحث کی ہے۔ شیعہ
 حضرات کہتے ہیں کہ شیعہ تھا اور سنی کہتے ہیں کہ سنی تھا حقیقت یہ ہے
 کہ خواجہ تفرقہ اور فرقہ بندی سے بالاتر غالباً مسلم تھا مناسب مقام پر ہم اس
 موضوع پر بحث کریں گے۔

نمان شاہ شجاع ست دور حکمت و مشرع مراجعت دل و جان کوش و
 صباح و رواح شاہ شجاع کا عہد ہے اور مشرع و حکمت کا عہد ہے اس لیے
 اطمینان دل و جان سے صباح اور رواح کے حصول کے لیے کوشش کر۔
 صباح اور رواح سے مراد صبح کی شراب ہے۔

ایک قصیدہ خواجہ حافظ نے شاہ شجاع کی مدح میں کیا پنتیس اشعار

میں مطلع ہے۔

شد عرصہ زمیں پو بلط ارم جواں از پر تو سعادت شاہ جہانیاں

چند اشعار یہ ہیں۔

اعظم جلال دولت و دین آنکہ رفعتش وارد ہمیشہ تو سن ایام زیر حال

جلال المعلا والدین یعنی شاہ فجاج کی عظمت کی پابندی کا اندازہ اکی سے کر لو۔
لیل و نہار کو ایک اہل گھوڑا تصور کرو جو اس کی ماٹوں کے نیچے رہتا ہے ظاہر
کو لیل و نہار یا ایام کا ظہور سورج اور چاند اور زمین کے تعلقات اور گردش
سے ہوتا ہے، یہ ایام ایک گھنٹا ہے جس پر شاہ فجاج سوار ہے اور
وہ گردش کر رہا ہے یعنی گردش ایام اس کی مراد کے موافق ہو رہی ہے۔

دارائی و ہر شاہ فجاج آفتاب ملک خاقان کا مگار و شہنشاہ لیریاں

دادہ فلک عمان ارادت بدست تو یعنی کہ مرکب مراد خودت براں

یہ شعر پہلے شعر اعظم جلال الخ کی تشریح ہے کہ فلک خود ایک مرکب ہے اور

اس کی لگام شاہ فجاج کے ہاتھ میں آسمان نے خود سے رکھی ہے کہ اپنی مراد
کے موافق جس طرح چاہے اسے چلائے۔

شاہ فجاج کی وفات پر قطع تاریخ لکھا

رحمان لایموت چو این بادشاہ را

دیاد آنچنان کہ زو عمل خیر لایفوت

جالش قرین رحمت خود کرد تا بود

تاریخ این معادلہ رحمان لایموت

۷۸۶

شاہ فجاج کی وفات کے بعد اس کا

سلطان زین العابدین

بیٹا سلطان مجاہد الدین زین العابدین جالین

اس کا مختصر بعد حکومت شاہ سخی اور سلطان احمد اور سلطان الجاسق

سے جنگ و جدل میں گذرا۔ خواجہ حافظ اس کو اس تعلق کے لحاظ سے
جو اس کے باپ کے ساتھ تھا۔ جنگ و جدل سے منع کرتے ہیں۔
لہذا اس وقت یہ نصیحت کی جب وہ شاہ منصور پر غالب اچکا تھا ایک
غزل کا مطلع ہے۔۔۔

خوش کنیا دہی فلکت روز دہی ہا شکر چوں کنی و چہ شکرانہ ادھی
لٹائی کے دن ملک نے تیری مدد اچھی طرح کی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ تو شکر
کس طرح ادا کرتا ہے اور کیا شکرانہ پیش کرتا ہے۔۔۔
اگر کس کو افتادِ خلائق گرفت دست گوہر تو بادِ تاغم افتادِ گالِ مخنی
اس شعر کا اشارہ شاہ کجی اور ابو یزید کی طرف ہے کہ سلطان زین العابدین
ان پر غلبہ حاصل نہ کر سکا۔ یعنی خدا نے ان کی دستگیری کی اس لیے کہ وہ
اللہ کے حضور عجز و تیا کرتے رہے تجھے بھی مناسب ہے کہ جسے تو
نے نیچا دکھا یا ہے یعنی سلطان منصور اس کی دستگیری کرے مطلب
شعریہ ہے کہ جو اللہ کے حضور بھکتا ہے اور اس کی دستگیری کرتا
ہے تجھے بھی چاہئے کہ اللہ کے اخلاق سے رنگین ہو اور زیر دست
عاجزوں پر رحم و کرم کرے۔۔۔

دکوئی عشق شوکت شاہی منی خرمند اقرار بندگی کن و اظہار چاکری
عشق کے بازار میں شوکت شاہی کا کوئی خریدار نہیں چاہئے کہ بندگی کا
اقرار اور چاکری کا اظہار کرے، ایک شعر ہے کہ
ای سکند بنشین و غم بہبودہ مخور کہ نہ بخشند ترا اب جیاز شاہی
ای سکند آرام سے بیٹھ لہو بے فائدہ کوشش نہ کر یہ نہیں ہو سکتا کہ
تجھے اب حیات شاہی کے بل بوتے پر ملے۔

ہم خدائے ہم و تیلہ ہوں لیکن خیال است و محال است و جنون

(عارف رومی)

در شاہزادہ جاہ و بزرگی خطرے است اس یہ کہ کزیں کر یوہ سبکبار بگنڈی
جاہ و بزرگی کے راستہ پر بے شمار خطرے ہیں بہتر یہی ہے کہ اس سے
گندتے وقت تیرے سر پر بوجھ نہ ہو تو پھلے لور گرے۔
ایک حرف صوفیانہ گویم اجازت است۔ ای لور ویدہ صلح بہ از جنگ وادری
میں تمہیں ایک نصیحت ضاف صاف لفظوں میں کہتا ہوں اگر اجازت
دے، ای لور ویدہ صلح بہر حال جنگ وادری سے بہتر ہے "د صلح خیر"
لیکن شاہ زین العابدین نے یہ حرف صوفیانہ اور نصیحت بزرگانہ نہ سنی
آخر شاہ منصور ہی غالب آیا۔ زین العابدین خراساں کی طرف بھاگا جب
رے "میں آیا۔ یہاں کے حالی نے اسے گرفتار کر کے منصور کے پاس بھیج
دیا۔ منصور نے اس کے ساتھ وہی سلوک کیا جو اس کے باپ شاہ شجاع
نے اپنے باپ میاز دین سے کیا تھا۔ یعنی اس کی آنکھوں میں سلاخی
پھیر دی اور پھر قلعہ "سلاسل" میں قید کیا۔ قلعہ سلاسل موجودہ قلعہ شو شترہ
سے، خواجہ حافظ کا اشارہ شاہ بگیا کی مدح کے ضمن میں اس شعر میں
اسی واقعہ کی طرف سے ہے۔

میں لوش جہانگیر کہ زلف کندت شہ گروں بدخواہ لگی تو سلاسل

شاہ بگیا اور شاہ منصور زید العابدین کے مقابلہ میں متحد تھے۔ خواجہ حافظ
زین العابدین کے غرور اور ظلم سے سخت متنفر تھے نہایت سزاوارت
پر لائے کی کوشش کی مگر بے سود، آخر اس نے اپنا انجام دیکھ لیا۔
نیچے کندت، گوش کن، بیاد بگر کہ ہرچہ نامع مشفق بگویت بیند

شیخ سعدی نے یہ سچ کہا کہ
محل قابل و دانگ نصیحت قابل چو گوش بدش نباشد چہ سود حسن معانی
نصیحت خواہ کتنی ہی فصیح و بلیغ لفظوں میں کی جائے جب تک قبول
کرنے کی صلاحیت نہ ہو بے فائدہ ہے۔

شاہ یحییٰ کا
شاہ نصرت الدین یحییٰ کے حالات ہم کچھ بیان کر چکے ہیں۔
امیر تیمور نے شیراز کی فرمانداری شاہ یحییٰ اور ابوالاسحاق کو
بن لوئیس میرجان کی حکومت لودکراں کی ولایت سلطان عماد الدین احمد
کو ۹۵۷ھ میں تفویض کی تھی، سلطان ابو یزید کو یہ تقسیم نہ بھالی۔ اس لیے
لڑائی کی ٹھان لی۔ تیمور نے اسے کچھ نہ دیا اب یہ بزور لینا چاہتا تھا۔ اس
کا پہلا مقابلہ سلطان عماد الدین احمد سے ہوا مگر امیر ہوا۔ احمد نے تصور
معات کر دیا اور ہر مزکی طرف بھیج دیا۔ ابو یزید نے کچھ مال و دولت بسر
لومات کے لیے بھیجی لودکراں میں رہائش اختیار کی اور اپنے بھائی سلطان
عماد الدین احمد کی خدمت میں مدت السمر ۹۵۷ھ تک رہا۔

ہم لکھ چکے ہیں کہ شاہ منصور نے زین العابدین کو قلعہ سلاسل موجودہ
شوشتر میں قید کر دیا تھا تیمور جب واپس لوٹ گیا تو شاہ منصور نے
شیراز کی طرف رخ کیا۔ لود بڑے بھالی شاہ یحییٰ نے جب دیکھا کہ چھوٹے
بھائی کے مقابلہ کی تاب نہیں لاسکتا تو شیراز پھوڑ کر مینوہ کی طرف چلا
گیا۔ شاہ منصور نے بسہولت شیراز پر قبضہ جمایا۔

شاہ یحییٰ نے سلطان ابوالاسحاق عالی "میرجان" لود حکم ابرو کو بزرگان
حکما کر اپنے ساتھ ملا لیا۔ لود سلطان احمد کو کراں سے بے دخل کرنا چاہا
اس متحدہ فوج کا مقابلہ صحرائے میافت میں، جمادی الاول ۷۹۲ھ میں

سلطان احمد سے ہوا۔ متحدہ لشکر کا شیرازہ بکھر گیا۔ شاہ یحییٰ اور سلطان
ابو اسحاق نے بھاگ کر جان بچائی۔ آخر کار تیمور نے ۱۳۹۵ء میں ذمہ
ان عاقبت نا اندیش بھائیوں کی خانہ جنگی کا خاتمہ کر دیا بلکہ ان کو اور
دیگر افراد آل مظفر کو تلوار کی گھاٹ اتار دیا۔

شاہ یحییٰ جب یزد میں فرماندار تھا تو خواجہ حافظ نے اس کی مدح
میں اشعار کہے مگر یہ سخت کنجوس واقع ہوا تھا مگر صلہ کچھ نہ ملا۔
جب شاہ یحییٰ شیراز کا عالی مقرر ہوا تو چار غزلیں اس کی مدح
میں کہیں، ایک غزل کا مطلع ہے کہ ہے

دانی جہاں نصرت دین خسرو کمال یحییٰ بن مظفر ملک عالم عادل
دوسری غزل کا مطلع ہے کہ ہے

طانی کہ چیت دولت؟ دیدار یار دیدن در کوئی در گدائی بر خسروی گزین
مقطع ہے کہ ہے

گوئے برفت حافظ از بادشاہ یحییٰ یارب یاد کس آرد در پیش پروردگار
تیسری غزل کا مطلع ہے کہ ہے

در لے مغال رفتہ بود آب نودہ نشتر پیر و صلائی بہ شیخ و ثاب نودہ

اس غزل میں خواجہ تشبیب میں یہ فرما رہے ہیں کہ میخانہ کو صاف
اور ستھرا بنایا ہوا تھا اور پھر گاؤ ہو چکا تھا۔ پیر مغال برا بھلا سمجھتے اور
جانوں اور بوڑھوں کو دعوت دے رہے تھے کہ آؤ اور پیو، فرشتے
رحمت کے ہاتھ میں ساغر عشرت تھا اور سور و پری کے چہرہ پر گلاب کی
طرح پھڑک رہا تھا۔ میں نے پیری فروش کے صورت سبک کر سلام کیا
تو ہنستے ہوئے کہا کہ اسی مجلس شراب نودہ تو نے لے لی تھی اور ضعف

رائے سے وہ کام کیا جو کوئی کرنا پسند نہیں کرے گا۔ تو ایسی جگہ سے جہاں گنج
تھا نقل مکانی کر کے خرابی میں میں آیا مجھے ڈر ہے کہ دولت بیدار جس
کے وصل کا تو خواہاں ہے تیری ہاتھ نہیں اٹے گی تو اپنے بخت خواب
ردہ کے اغوش میں سویا ہوا ہے۔

ملک چینہ کش شاہ نصرت الدین است بیابہ ہیں ملکش در رکاب تودہ
آسمان شاہ نصرت الدین یگی کے آستانہ پر ماتھا رگڑ رہا ہے تو بھی اکر دیکھ
لے کہ ملک اس کی رکاب سے جا بستر ہے۔

خدا کہ علم غیب است بہر کسب ثروت العی صدق حدیث بوسہ بر جیادہ
خود جو کہ علم غیب ہے ثروت حاصل کرنے کے لیے سچے دل سے
دعا اس کے حضور آستان پر بوسہ دیتا ہے۔

بیامیکہ حافظ کہ بر تو عرضہ کنم ہزار صفت دعا ہای مستجاب زدہ
لی حافظ تو میخانہ میں آیا تجھے بتاؤں کہ دعائے مستجاب نے کس طرح ہزار
مغنی توڑ دیں؟

چوتھی غزل کا مطلع ہے۔

ایک بر ماہ از مہظ میکش نقاب انداختی . لطف کردی سایہ بر آفتاب انداختی
تس نے اپنے چاند جیسے مکھڑے پر سیاہ زلفوں کا نقاب ڈالا ہوا
ہے کیا بات ہے کہ آفتاب کو زیر سایہ لے یا۔
از فریب ز گیس عمود دلمی پرست حافظ خلوت نشین را در شرب انداختی
تیری متعالی انکھڑیوں اور شربانی سرخ ہونٹوں نے وہ فریب دیا کہ حافظ
گوشہ نشین کو شرباب میں ڈال دیا۔ یعنی وہ بھی ان کا متوالہ ہو گیا۔
غزلی میدول حد گرتم ز بھیر زلف ہوں کند خسرو مالک نقاب انداختی

حل کا شکار کرنے کے لیے میرے گروں زنجیر گیسو میں ایسی جکڑی جیسے
بادشاہ ایردوں کی گردنیں کٹندے میں باندھ رکھا ہے

داعدار شکوہ ای آنکہ تاج آفتاب از سر تعظیم بر خاک جناب انداختی

وہ دار کی شان و شکوہ والا وادہ جس کے قدموں کی خاک پر آفتاب پاپا
تعظیم اپنا تاج ڈال رہا ہے۔

نصرت الدین شاہ یحییٰ آنکہ ختم ملک از دم شمشیر چوں آتس در آب انداختی

تکوار میں آب ہے اور آگ پانی میں بجھ جاتی ہے۔ شمشیر کی دھار
دونوں کام کرتی ہے۔ جو بھی نصرت الدین یحییٰ کے ملک کا دشمن ہے
اسے موت کی گھاٹ اتار کر وہ کام کرتی ہے جو پالی آگ سے کرتا ہے
دشمن ملک مثل آگ ہے۔ اور آب شمشیر اس کو بجھانے والی شے ہے

شاہ منصور کی مدت حکومت ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۵ء تک

شاہ منصور

یہ شخص شجاعت مجسم تھا۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ
آل مظفر میں خانہ جنگی شروع ہو گئی تھی۔ اور اس کا نتیجہ جو کچھ ہوا کرتا ہے
ان کو بھی بھگتنا پڑا۔ شاہ منصور نے غلبہ کے بعد سلطان احمد لور شاہ یحییٰ
کو پیام دیا کہ مناسب ہے کہ ہم سب تیمور کے خلافت مسمد ہو جائیں
لہذا سب اپنا اپنا لشکر میرے حوالہ کر دو میں خراسان پر پورش کرنا چاہتا
ہوں اور اگر تمہیں یہ منظور نہیں تو میرے ساتھ جنگ کے لیے تیار
ہو جاؤ۔ سلطان احمد تیمور سے سخت خائف تھا اس لیے شاہ منصور
کی درخواست مسترد کر دی۔ اس پر شاہ منصور نے دونوں کی ملامت
کمان لہریز کو تباہ کر کے رکھ دیا۔

تیمور کو بھی شاہ منصور کی دیدہ دلیری کی اطلاع ہوئی۔ تو دوسرے

صفحہ ۷۹۵ میں قلع سفید مستر کیا۔ یہاں سلطان زین العابدین
 نابینا مقید تھا اسے نجات دی اور وعدہ کیا کہ تمہارا انتقام شاہ منصور
 وغیرہ سے لوں گا شاہ منصور نے قریباً پانچ سو ار پیادہ جمع
 اور شیراز سے تین کوس کے فاصلہ پر تیمور کا مقابلہ کیا۔ تیمور کے
 ہمرکاب اس وقت میں ہزار کی جمعیت تھی۔ مگر شاہ منصور نے
 مٹھی بھر آدمیوں کے ساتھ اس زور کا حملہ کیا تیموری لشکر کی صفیں تلب
 تک توڑ کر لکھ دیں۔ مرغانہ وار تیمور کی طرف بڑھا۔ تیمور اس وقت
 تنہا رہ گیا تھا۔ اس کا عملدار بھی بھاگ چکا تھا۔ شاہ منصور نے پے در پے
 تلوار کی ضربات پورے زور سے لگائیں لیکن اس صاحبِ اقبال پر کچھ
 اثر نہ ہوا۔ تیمور کو سب سے خرق تھا اتنے میں پراگندہ سرخاں فوج پھر
 جمع ہوئے اور شاہ منصور کو زخم میں لے لیا۔ شاہ زخموں سے چور ہو
 رہا تھا لیکن برابر شمشیر برائے بلکہ اپنے زور بازو کے جوہر دکھا رہا
 تھا۔ گھوڑا بھی سخت زخمی تھا وہ گرا تو شاہ بھی زخموں سے مٹھاں گرا
 اور پھر نہ ابھرا۔ تیموری لشکر نے اس کا سر الوحتسہ د تیمور کے گھوڑے
 کے قدموں میں ڈال دیا۔ ایک شاعر نے اس کی شہادت کی تاریخ لکھی۔

شہر پابے مصر منصور آنکہ او دزد میں ملک تخم داد کشت

ملک ہشت از در دنیا چون بہشت لاجرم تاریخ او شد ملک بہشت

صفحہ ۷۹۵

منصور کے ساتھ آل مظفر کا خاتمہ ہو گیا۔ ستر ہزار ہوانان ایران کا
 قتل عام اور ان کے سروں کا ایک مینار چنا گیا۔ عرب مورخین تیمور کو
 الوحتسہ کے لقب سے یاد کرتے ہیں اس نے چنگیز خاں کو اپنا نمونہ

مقرر کیا تھا وہ تو نامسلمان تھا لہذا سے دعویٰ مسلمان تھا خواہ حافظ نے
شاید اسی کے حق میں کہا تھا۔

گرمسائی ہمیں است کہ حافظ دارد مائے گرانڈ پس امروز بود فروئے

شاہ منصور خواہ حافظ کا مدوح ہے، خواہ منصور کی شہادت سے
بیشتر وفات پا چکے تھے، اور یہ حادثہ قاہرہ نہ دیکھا جب پہلی دفعہ
شاہ منصور زین العابدین کو شکست دے کر شیراز میں داخل ہوا تو
خواہ نے خیر مقدم کیا۔

بیادکے رایت منصور باد شاہ رسید نوید فتح و بشارت بمہر و ماہ رسید

اڈام دیکھو کہ شاہ منصور کا جھنڈا لہراتا تھا شیراز کی طرف آ رہا ہے فتح کی
خوشخبری اور مرزہ ہرد ماہ تک پہنچ گیا۔

جہاں بخت زدوں نے ظفر نقاب انداخت کمال عدل بفریاد داد خواہ رسید

فتح کے پہرہ سے حسن بخت نے نقاب الٹ دیا۔ یعنی ظفر کی وجہ سے
حسن بخت شاہ منصور بے جہانہ جلوہ افروز ہو رہا ہے۔ لہذا عدل کے
کمال کا تقاضہ ہی یہی ہے کہ ہر ایک داد خواہ کی فریاد سکر اسکی مصیبت دور کر
سیر و خوش کنواں بعد ماہ آمد جہاں لہم حل الکنوں رسد کہ شاہ آمد

آسمان اب خوش خوش گردش اس لیے کر رہا ہے کہ چاند طلوع ہوا
اور جہاں کی مرادیں اب بھرا میں کیونکہ بادشاہ تشریف لے آیا۔

ز قاطعان طریق این نماں شو عدالین قائل حل و عاش کہ مرودہ را رسید

اس عہد میں اہل دل لہذا اہل حاش کے تھکے ڈاکوؤں سے امن میں
ہیں کیونکہ مرودہ پہنچ گیا۔

عزیر مصر بر غم برادران غیبہ ز قہر چاہ بر آمد باوج ماہ رسید

یوسف لود آپ کے بھائیوں کا قصہ مشہور ہے۔ شاہ منصور تو یوسف
مصری ہے اور بھائیوں نے اسے کنوئیں میں قال رکھا تھا یوسف
عزیز مصر ہوا اور یہ بھائیوں پر غالب آکر آخر ماہ کنعان کی طرح چاند
کی بندی تک پہنچ گیا۔

کجاست صوفی دجال چشم ملحد شکل یگوسوز کہ جہدی دیں پناہ رسید

صوفی دجال چشم دکاتا اور ملحد اس مصرع میں تیمور ہے۔ اور اس کا پھو
شاہ یحییٰ جس کو شیراز کی حکومت سے حملہ کے بعد تفویض کی تھی۔ تیمور
کے عقاید مذہبی میں الحاد کی آمیزش کی۔ وہ صوفیوں کا بہت گرویدہ تھا
چنانچہ جب سلطان روم یازید یلام کو شکست دے کر ہزاروں ترک
سپاہی اسیر کر کے لایا تو شاہ صغی الدین کی خدمت میں حاضر ہو کر زو جو ابر
ندرانہ پیش کیے۔ شاہ نے کہا کہ اگر کچھ دینا چاہتے ہو تو سب اسیران جنگ
میرے حوالہ کر دو۔ تیمور نے شاہ صاحب کے حوالہ کر دیئے۔ یہ آپ
کی خانقاہ کے درویش بنے۔ تیمور ہی ان کے اذوق کا کفیل تھا۔ یہی بعد
میں قزلباش کہلائے اور شاہ صاحب کے خلف الرشید اسماعیل سے خاندان
صوفی کی حکومت کا آغاز ہوا۔ اور یہی قزلباش اس حکومت کو تقویت
دیتے رہے!

تیمور کا عقیدہ مذہبی فرقہ باطنیہ سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے، فرقہ
باطنیہ کو اہل سنت والجماعت "ملحد" کہتے، اور وہ ان کو اہل قال اور اہل
ظاہر طنزاً کہتے۔

نماہر حافظ شاہ منصور کے حق میں دعا فرماتے ہیں۔ غزل کا مطلع ہے کہ۔
سحر جوں خسرو ظا و ظلم بر کو ہاراں زد بدست درخت بام در امید والال زد

جب صبح کے وقت شاہ مشرق یعنی آفتاب نے اپنا بھنڈا پہاڑوں پر
گاڑ دیا میرے دوست کا دست کرم امیدواراں رحمت کا دروازہ
کھٹکھٹانے لگا۔

شہنشاہ مظفر شجاع ملک دین منصور۔ کہ جو بدبلاخیش خندہ برابر بہاراں زور
شاہ منصور جو شہنشاہ مظفر فرزند ملکی اور دینی سلطنت کو بزور باد و شجاعت
سے لے چکا ہے اسکی بے دریغ بخشش اور بہار کا مضحکہ اڑا رہی
ہے۔

دوام عمر و ملک او بخواہ از لطف حق حافظ کہ جزع این سکہ دولت بنام شہریاراں زور
لی حافظ تو دعا کر کہ اللہ تعالیٰ اس کی عمر دراز کرے اور اس کا ملک ہمیشہ
رہے کیونکہ آسمان نے یہ سکہ دولت شہریاروں کے نام پر ڈھالا ہے۔
خواجہ اپنی شہرت کا موجب بھی شاہ منصور کو سمجھتے ہیں حالانکہ خواجہ
حافظ کی وجہ سے منصور کا نام زندہ ہے۔

الای طوطی گو یائے اسرار مبادا خالبت شکر منقار

طوطی شیریں سخن تو خود خواجہ حافظ ہیں جو اسرار کھول کھول کر بیان
کرتے ہیں اپنے ہی حق میں دعا کرتے ہیں کہ تیری منقار کبھی شکر سے
خالی نہ رہے۔

ہر مین دولت منصور شاہی علم شد حافظ اندر نظم اشعار

شاہ منصور کی حکومت ہی کی برکت سے حافظ کی شاعری کا مرتبہ بلند ہو
رہا ہے۔

خواجہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ شاہ منصور جو مظفر و منصور ہو رہا
ہے تو میری توجہ اور التفات باطنی کے ساتھ۔

گرچہ باندگاں پادشاہیم بادشاہاں ملک صبح گیم
 اگرچہ ہم بادشاہ کے غلام ہیں مگر صبح کے وقت ہماری شاہی کاہے
 یہ وقت اجابت دعا کا ہے۔ یعنی بادشاہ کی بندگی کا تقاضا ہے
 کہ ہم بوقت صبح اس کے حق میں دعا خیر کرتے ہیں جو قبول ہوتی ہے
 گو غنیمت شمار ہمت ما کہ تو در خواب دما بدہ گیم
 بادشاہ سے کہو کہ ہماری صبح خیرزی اور دعا دولت جو ملی تو بہ سے کہتے
 ہیں غنیمت سمجھ کہ تو تو اطمینان سے اس وقت خواب راحت میں ہوتا
 ہے اور ہم گھبانی کرتے ہیں۔

شاہ منصور واقفت کہ ما روئے ہمت بہر کجا اریم
 دشمنان را ز خون کفن سازیم دستاں را بباقی فتح و عیم
 شاہ منصور اس حقیقت سے خوب واقف ہے کہ ہم جس طرف
 ہمت سے تو بہ کریں دشمنوں کو خون کفن پہناتے ہیں اور دوستوں
 کو فتح کی قبا،

دام حافظ بگو کہ باز دھند کردہ اعتراف دالگو عیم
 حافظ کا قرض کہو کہ ادا کرے تو نے مان یا ہے اور ہم گواہ ہیں۔
 کسی نے سچ کہا ہے کہ ماما دان کرے بھنداری کا پیٹ پھٹے۔
 خزانچی پر لے درجہ کے خیس ہوتے ہیں بادشاہ کسی پر نوازش فرما کہ
 الہم و کرام کا حکم دیتا ہے تو یہ پیٹ پکڑ کر رہ جاتے ہیں، شاہ منصور
 کے وزیر خزانہ نے بزرگان شہر شیراز کے مقررہ وظیفہ شترتومان کو ایک چوتھائی کم
 کر دیا۔ بادشاہ کو اطلاع ہوئی تو سخت خفا ہوا اور کہا کہ اب اصل پر
 تیس اور زیادہ کرو یعنی سو تومان۔ خواجہ حافظ نے بادشاہ کی سخاوت کی داد

اس قطعہ میں دی۔

بادشاہ لشکر توفیق ہمراہ تواند خیر اگر عزم تخیر جہاں نہ مکنی

انے بادشاہ اللہ نے تجھے توفیق کی فوج عنایت کی ہے جو تیر ہمراہ ہے اگر تو جہاں کے دل کو مسخر کرنا چاہتا ہے تو اٹھ اور اپنا کام کر
 آہکے دو ماہ ہفت آہ لہی سووے نکر فرصت باد کہ ہفت دہم راہ مکنی

اس شعر کے دو معنی ہیں ایک یہ ہے کہ اصل وظیفہ سو تومان تھا۔ جس کو
 وزیر نے پچھرتومان کم کر کے بنا دیا۔ شاہ کے حکم سے دوبارہ سو
 ہزار رہا اور اگر اصل پچھرتومان تھا جس کی پورتھالی کم کر دی گئی تو حکم شاہ
 نہ صرف یہ کمی پوری کی گئی بلکہ سو تومان تک اضافہ ہو گیا۔

خواجہ نے ایک قصیدہ غزل نما پچیس اشعار کا کہا مطلع ہے

ہوا نہ بہر بہاد سمایل بزارم یعنی غلام شاہم و سو گند میخوم

اس قصیدہ کا شعر ہے کہ

منصور بن مظفر غازیست حرمین وزا میں نجتہ نام بر اعدا مظفر

یہ قطعہ بھی دعائیہ ہے۔

روح القدس اے سرورش فرخ بر قبہ طارم تیر جد

مئی گفت سحر گیسے کہ یارب در دولت و حشمت مجلد

بر مسند خسروی بماناد منصور مظفر محمد

عیاش الدین سلطان بنگال

سلطان عیاش پسر شاہ سکندر
 پسر حاجی ایاس الملقب بہ شاہ

شہس الدین بھنگرہ خواجہ حافظ کا ہم عصر ہے۔ اپنا وقت عیش و عشرت
 میں گزارتا رہا سات سال اور چند ماہ سلطنت کے بعد ۱۵۵۵ء میں فوت

ہوا۔ اس کے مبارک میں علماء و فضلاء کے علاوہ شعرا بھی تھے، سلطان اکثر شراب میں مست رہتا اور جو کچھ مستی کے لوازمات ہیں، یہ تقاضائی جوانی دیوانی بھی جیسا تھے اور ان سے لطف اندوز ہوتا۔ ایسی بے اعتدالی کا لادھی نتیجہ بیماری بھی ہے۔ چنانچہ ایک دفعہ بیمار ہوا، علاج معالجہ سے اچھا ہو گیا۔ محل میں تین کینیزیں سرود گل و لالہ نالی تھیں اور ان کے سپرد خدمت غسل تھی۔ غسل صحت کرتے وقت کینیزیں ایک دوسرے سے نوک جھونک مزاحیہ باتیں بھی کرتی تھیں۔ سلطان کے ذہن میں یہ مصرع آیا۔ سالی خدمت سرود گل و لالہ می رود، دوسرا مصرع موزوں نہ ہو سکا۔ شعرا دیوار سے فریاد کی۔ ہر ایک نے کچھ نہ کچھ کہا مگر سلطان کو پسند نہ آیا۔ ایک درباری نے کہا کہ کاش اس وقت خواجہ حافظ ہوتے تو

مصرع موزوں کرتے۔ جب سلطان کو خواجہ کے حالات اور شاعراں عصر میں آپ کے ممتاز مرتبہ کی اطلاع ہوئی تو کہا کہ اچھا یہ مصرع خواجہ کی خدمت میں ارسال کیا جائے کہ اس پر طبع آزمائی کریں لہذا ہندوستان کے تحفے بھی بطور نذرانہ ارسال کیے۔ خواجہ نے ملا کے وقت اس پر ایک غزل کہی اور سلطان کے قاصدوں کے قدیمہ بھیج دی۔

سالی خدمت سرود گل و لالہ می رود دین بخت با نالا فرغ سالہ می رود

واقعہ کے لحاظ سے تو شعر کا مطلب واضح ہے کہ سرود گل و لالہ تین غسالہ ہیں انہی کی یہ باتیں ہیں۔ لیکن مطلب اور بھی ہے حکام یونان نے شراب نوشی کے اوقات اور معمول اس طرح مقرر کیا ہے کہ صبح کے وقت تین پیالہ شراب پیتے ہیں غرض یہ ہے کہ معدہ کا غسل اور صفائی ہو جائے۔ اسے "نالا فرغ سالہ" کہتے ہیں۔ اور طعام کے بعد پانچ پیالے

پیتے ہیں غرض یہ ہے کہ طعام ہضم ہو جائے اسے "خمسہ ماضمہ" کہتے ہیں، پھر سوتے وقت سات پیالے پیتے ہیں کہ نیند گہری ہو
 شعر کا مطلب تو اتنا ہی ہے کہ موسم بہار کا آغاز ہے اور سردی
 گل و لالہ کی خوش کن گفتگو صبح کے ثلاثہ غسالہ کے ساتھ ہو رہی ہے
 مے وہ کہ نو عروس چمن حد حسن یافت۔ کارا میں زماں ز صفت دلالہ می رود
 دہن کو آراستہ و پیراستہ کرنے کے لیے مشاط کی ضرورت ہوتی ہے
 لیکن یہاں شعر کا مطلب یہ ہے کہ سلطانی کو بھی کسی دلالہ تے جا لگانی
 کہ بوقت غسل لونڈیاں کیا محفل کر رہی تھیں۔ عروس چمن ملکہ حرم ہے یعنی
 حدیث سرد و گل و لالہ دلالہ نے ملکہ کے گوش گزار کی اور ملکہ نے سلطان
 سے اس کا ذکر بہ سبیل حکایت یا شکایت کیا۔

یہاں تک وہ باہن تھیں جس کا علم سلطان ہی کو تھا۔ اور خواجہ
 نے سب پتہ کی باہن کہہ دیں رشتہ دارے دربارے چارے کیا کہتے
 اس لیے خواجہ ان پر بھی پوٹ کر گئے۔
 شکر شکن شونہ ہمہ طوطیاں ہندہ زیر قند پارسی کہ بہ بنگالہ می رود

ہے طوطیاں ہند یعنی شاعران ہندوستان کو شکر شکن بنا دے گی
 اور ساتھ ہی اپنی کرامت کی طرف بھی لطیف پیرایہ میں اشارہ کیا کہ
 طے مکان ہیں و نماں و طریق شعر گاہ طفل یک تبہ نہ یک نالی رود
 میرے اشارہ کا اعجاز دیکھو کہ غزل میں نے ایک رات میں کہی گویا یہ
 ایک رات کا بچہ ہے جو میرے داغ کی پیدائش ہے مگر ایک رات
 کا بچہ تو چل پھر نہیں سکتا، اور عجب طفل یک شبہ ہے کہ ایک

سال کی مسافت طے کر کے شیراز سے بنگالہ میں پہنچ گیا۔ وہ
 ان چشم جادوانہ عابد فریب ہیں کس کارواں سحر و نبالہ می رود
 وہ جادو نظر دیکھ جو عابد کو بھی اپنا گردیدہ بنا کر فریب دیتی ہے اس کی
 چھپے چھپے کارواں سحر رواں ہے۔ آنکھ میں سرمہ و نبالہ وار کارواں سحر
 ہے جس نے اس زاہد فریب آنکھ کو دیکھا سحر ہو کر رہ گیا۔ وہ
 نخلی کردہ می خرامد بر عارض سمن از شرم دعویٰ اور عرق از نبالہ می رود

ہماری اردو میں ژالہ کے معنی "اولے" ہیں مگر فارسی میں اس کے معنی
 شبیم کے قطرے ہیں۔ یا مطلق پانی کے قطرے ہیں نشاط کہتا ہے کہ
 نر لالہ ژالہ می چکداز ابر مشک نام یعنی لالہ پر بارش کے یونندیں پڑ رہی
 ہیں۔ مطلب شعر یہ ہے کہ ایک تو تابش حسن سے اور دوسرے شرم
 کی وجہ سے اس کے رخسار پر پسینہ کے قطرے وہ غضب ڈھا رہے
 ہیں کہ سمن دیکھ دیکھ کر پانی ہو رہا ہے، اس کے بعد خواجہ حافظ
 تصحانہ مشورہ بھی دیتے ہیں کہ

این شوق عشوہ دنیا کہ این عجز مکارہ می نشیند و محالہ می رود

اس دنیا اور اس کی زینت پر نہ جا کہ یہ بڑھیا مکرو فریب کی پڑیا اس
 گھٹ میں لگی رہتی ہے کہ چمک دیا اور اپنا راستہ لیا یعنی سخت بے وقاب ہے
 چل سامری مباح کہ نداد از خری موٹے بہشت وانے گو سالی رود

سامری کو بھی ساحر کہا گیا ہے اور بنگالہ کا جادو بھی مشہور ہے علاوہ ازیں
 ہندو سب گو سالہ پرست ہیں۔ خواجہ نصیحت کرتے ہیں کہ تو سامری نہ
 بن کہ اس نے بنی اسرائیل سے سونا لیکر ایک بچہ ڈھال دیا اور
 اسرائیلیوں کو کہا یہ تمہارا خدا ہے جو تمہیں مصر سے نکال لایا، اس

کی پوجا کرو، سامری نے حضرت موسیٰ کی روش اور ملت تو جید تو بھڑوڑ
دی اور گو سالہ پرستی کی، یہ گدھا پن ہے اور تو بھی اہمق نہ بن کہ اس
چند روزہ زندگی کو عیش و عشرت میں تباہ کر رہا ہے مناسب یہ ہے
کہ اللہ سے لو لگائے۔ اب پھر نصیحت کے بعد گریز کرتے ہیں کہ
باد بہاری دزد از گلستاں شاہ وز ژالہ بادہ در قعر لالہ می رود

باد شاہ کے باغ میں باد بہار چل رہی ہے اور ابر بہار سے مینہ شراب
کی طرح لالہ کے پیالہ میں اندھ پلا جا رہا ہے۔
حافظ شوق مجلس سلطان غیاث دین خامش مشوک کار تو از نالہ می رود

ای حافظ سلطان غیاث الدین کے دربار میں باریابی کا شوق ہے تو چپکا
نہ بیٹھ تو اگر وہاں نہیں پہنچ سکتا تیرا نالہ رسا وہاں جا سکتا ہے اور تیرے
اشتیاق کا حال سلطان پر واضح ہو جائے گا۔

ہم بیان کر آئے ہیں کہ
سلطان قطب الدین تمہن بن توران شاہ ہرمز

سلطان محمود شاہ بہمنی
دکن کی دعوت پر خواجہ حافظ نے ہرمز تک سفر کیا مگر یہاں سے لوٹ آئے۔
ہرمز میں سلطان قطب الدین بن تمہن بن توران شاہ حکمران تھا اسے اطلاع
ہوئی کہ خواجہ حافظ تشریف لائے تھے مگر واپس چلے گئے فوراً اپنے آدمی
بھیجے کہ خواجہ کی خدمت میں التماس کریں کہ واپس تشریف لائیں کہ میں
ہمانداری کا فرض تو ادا کر دوں۔ خواجہ بہت دودھ نکل چکے تھے مگر آدمی جلے
اور سلطان کا پیغام دیا خواجہ بہت متاثر ہوئے مگر عند خواجہ کی لودھی وقت
ایک غول لکھ کر سوال کی کہ سلطان کی خدمت میں میری طرف سے پیش کر
دینا۔

من کہ باشم کہ بر آں خاطر خاطر گندم لطف ہامی کمی ای خاک حدت تاج مہم
 میں تو ایک گلاٹے گو شہ نشین ہوں میری کیا ہستی ہے کہ سلطان مجھے یاد
 فرمائے مگر سلطان کے عنایات و الطاف کا شکر یہ اس فدہ تواری کا تقاضہ
 ہے کہ میں تیرے دروازہ کی خاک کو اپنے سر کا تاج بناؤں، یعنی میرا سر ہو
 اور تیرا استارہ۔

دلبر بندہ نوازیت کہ آموخت بگو کہ من این ظن برقیباں تو بہرگز بدم
 تیرے لطف و کرم نے میرا دل موہ لیا یہ تو بتا کہ یہ بندہ نوازی تو نے کس
 سے سیکھی ہے۔ کیونکہ میں تیرے رقیبوں سے خوب واقف ہوں ان
 کی نسبت تو یہ گمان ہی نہیں ہو سکتا کہ انہوں نے کوئی کلمہ خیر میرے حق
 میں کہا ہوگا اور مجھے بندہ نوازی پر آمادہ کیا، یعنی لطف و کرم کرنا تیری
 سرشت میں ہے۔ تو طبعاً مخیر اور بندہ نواز ہے۔

ہستم بدرقہ را کمن ہای طاٹر قدس کہ دراز است رہ مقصد من تو سفرم
 اے طاٹر قدسی اپنی ہمت سے میری رہنمائی کر کہ منزل دور دراز ہے اور
 میں پہلی دفعہ سفر پر نکلا ہوں، ایسا نہ ہو کہ سفر کی تکلیف برداشت نہ
 کر سکوں اور ہمت ہار کر بیٹھ رہوں۔

اے نسیم صحری بتدگی من برساں گو فراموش مکن وقت دعا محرم
 اے باد صبا میرا نیاز پہنچا دے اور یہ کہنا کہ مجھے دعا سحر وقت بھولنا
 ماہ خونگہ صم ناپس انیں سے خرم بانو دیگر غم دنیا خرم
 مجھے وہ خلوت گاہ خاص الخاص کی راہ بتا کہ اکیلے تیرے ساتھ بیٹھ کر شراب
 پیوں اور پھر غم دنیا نہ کھاؤں۔
 خرم آن روز کریں مرحلہ بہ بندم باغ فدہ سر کوئی تو پر مند رہنیتاں جرم

کیسا اچھا وہ دن ہو گا کہ اس مرحلے سے پوریا بسترہ باندھ کر چل دوں
 اور تیرے کوچہ میں جا کر ایسا گم ہو جاؤں کہ رفیق میری خبر تیرے کوچہ
 سے دریافت کریں یا رفیق مجھ سے تیرے کوچہ کے حالات دریافت کریں

پایہ نظم بنناست جہانگیر بگو تاکند پادشہ بخر دہاں پر گیرم
 میری نظم کا مرتبہ بلند ہے اور عالمگیر ہے سلطان بخر کو سنا دو تاکہ میرا
 منہ موتیوں سے بھر دے۔ سلطان ہرمز کو سلطان بخر بھی کہتے تھے۔

حافظ شیدا طلب گوہر وصل ویدہ دیدیا کتم از اشک و درد غوطہ زخم
 اے حافظ مکن بے بلکہ زیبا ہے کہ تو گوہر وصل کی تلاش میں آنکھ
 کے آنسوؤں کے پانی سے دریا بہائے اور اس میں غوطہ لگائے۔

مشہور و معروف سیاح ابن بطوطہ بھی خواجہ حافظ کا ہم عصر ہے
 جب ہرمز میں وارد ہوا تو شاہ ہرمز سے بھی ملاقات اس کے وزیر
 شمس الدین محمد علی کی معرفت کی، ابن بطوطہ شاہ کے حالات اپنے
 سفر نامہ میں لکھتا ہے کہ نہایت سادہ و صغیر کا آدمی ہے۔ لباس
 بھی سادہ، میں تو پہلے اس کو پہچان نہ سکا۔ اپنے مصاحبوں کے
 درمیان بیٹھا ہوا تھا مجھ سے میرے سفر کے حالات دریافت
 کیے اور ان سلاطین کی نسبت بھی پوچھتا رہا جن سے میں ملاقات
 کر چکا تھا۔

امیر تیمور گورمانی ۸۱۶ - ۸۵۱
 امیر تیمور خواجہ کا ہم عصر تھا۔ اگرچہ
 دولت شاہ سمرقند نے اپنے

مذکرہ الشعراء میں ذکر کیا ہے کہ خواجہ کی ملاقات امیر تیمور سے ہونے
 لداہی کے حوالہ سے دوسرے تذکرہ نویسوں نے اس واقعہ کو دہرایا

ہے کہ جب امیر خواجہ سے ملا تو کہا کہ تمہارے بدن پر تو پتھر سے بھی نہیں اور بخشش کا یہ حال ہے کہ میرا وطن ماہوت سمرقند بخارا ایک خال ہندو پر بنا کر دیا۔ خواجہ نے کہا کہ اسی دلو و دہش کا نتیجہ ہے کہ مجھ قلاش کو اس حال میں دیکھ رہے ہو۔ دولت شاہ غوما ایسے لطافت اختراع کرتا ہے اس کے مدکرہ میں ایسے واقعات تاریخی حیثیت سے ساقط ہیں لیکن اس میں کچھ نہیں کہ یہ شعر کہہ

اگر آن ترک شیرازی بدست آروط ماما بحال ہندویش بخشم سمرقند و بخارا را

ایک پیش گوئی ضرور ہے جو اپنے وقت پر پوری ہوئی۔ امیر تیمور کی ادلاؤ کو سمرقند و بخارا سے دست بردار ہونا پڑا اور ہندوستان میں ہی سلطنت منعلیہ قائم کی۔

خواجہ حافظ امیر تیمور سے سخت متنفر تھے۔ اس نے جو کچھ اسلام اور اہل اسلام کو نقصان پہنچایا۔ اس کی تلافی نہ ہو سکی۔ تیمور کے سامنے چنگیز خاں اور ہلاکو خاں کا نمونہ تھا۔ وہ بالکل انہی کے نقش قدم پر چلا۔ اس نے جس طرح ایران میں قتل و غارت کا بازار گرم رکھا ایسا واقعہ نہ تھا کہ خواجہ اس کو نظر انداز کرتے، ایک غزل میں کہتے ہیں۔

دیوار نیرک و از بادہ کہن مومنی فراخی دکتابی و گوشہ چمنی

اس پر آشوب زمانہ میں جس کا آغاز چنگیز خاں کی ترکازی سے ہوا اور خواجہ حافظ کی زندگی کے بعد بھی تیمور پر ختم ہوا۔ اس دور میں جیکہ ہر ایک شخص کو جان کے لالے پڑے ہوئے تھے، اس مفقود اور بد نظمی کا وہ دورہ تھا۔ خواجہ حافظ کہتے ہیں کہ اگر دو دست دانا

اور پرانی شراب دوا کش اور ذرا فراغت میسر ہو تو کتاب کا مطالعہ جن
کے کسی گوشہ میں ہو تو اس سے بڑھ کر لطف زندگی نہیں۔

من این مقام بدینا و آخرت ندیم اگرچہ درپے افتد خلق انجمن
ایسا مقام فراغت و قناعت جس کا مذکور ہوا دنیا اور آخرت کی
نعمتیں بھی مجھے اس کے عوالم میں تو ہاتھ سے نہ دوں خواہ دنیا
جہاں کے لوگ اصرار کریں اور مجھے اس کے چھوڑنے پر مجبور کریں۔

بیا کہ رونق این کارخانہ کم نہ شود۔ زہد، بچو توئی یا بفسق ہجو منی
حقیقت یہ ہے کہ اس کارخانہ دنیا کی رونق کبھی کم نہیں ہو سکتی، نہ تو
تیرا زہد و تقویٰ اسے کچھ بڑھا سکتا ہے اور نہ میرے فسق و فجور
سے اس میں کچھ کمی واقع ہو سکتی ہے۔ یعنی زہد و تقویٰ اور فسق و
فجور کا اثر نظام کائنات پر کچھ نہیں ہوتا۔ مہذبانہ انداز بیان یہی ہے
کہ خواجہ یہ نہیں فرماتے کہ میرا زہد و تقویٰ معاشری زندگی کی رونق بڑھا
دیا ہے، اور اکثریت کا فسق و فجور کم کر دیا ہے۔ بلکہ فسق کو اپنے طرف
نسوب کرتے ہیں اور اکثریت کو متقی ہی کہتے ہیں حالانکہ امر واقعہ
اس کے خلاف ہے۔ مطالب یہ ہے کہ زہد و فسق کا اثر انفرادی
زندگی پر پڑتا ہے۔ اگر یہ تسلیم بھی کیا جائے کہ اکثریت اعلیٰ درجہ کی
پرہیزگار اور مستبانہ ہے تو کارخانہ دنیا پر اس کا اثر نہیں پڑتا اور
اگر اس کے خلاف فسق و فجور میں مبتلا ہے تو کچھ اپنا ہی بگاڑ رہی
ہے مگر دنیا جیسی تھی ویسی ہی ہے اور ایسی ہی رہے گی۔ چٹگیر خاں
اور ہلاکو اور تیمور سے بہت بر خود غلط فطرت گر ہوئے اور ہوں گے
مگر دنیا کا کیا بگاڑ اس کی رونق جیسی پہلے تھی اب بھی ہے بلکہ کچھ

کچھ زیادہ سے زیادہ بڑھ چکی ہے۔

ہر آنکھ کنج قناعت بہ گنج دنیا داد فروخت یوسف مصری بہترین شہنی

یوسف کے بھائیوں نے یوسف کو چند ٹکوں کے عوض فروخت کر دیا۔ اور بھائی کو اغیار کا غلام بنا دیا۔ یوسف کو تو اللہ نے وہ عزت دی کہ عزیز منہر ہو گیا۔ اور بھائیوں کو اس کے حضور جھکانا پڑا، اسی طرح جو شخص کنج قناعت پھوڑ کر گنج دنیا کا طالب ہے اس کی مثل بھی یوسف اور برادران یوسف کی سی ہے کہ اعلیٰ شے ادنیٰ کے عوض فروخت کر رہا ہے۔ "دنیا" کے معنی وہ شے جو نزدیک تر ہے۔ ادنیٰ شے وہ ہے جو بسہولت ہاتھ آئے اور وہ نزدیک تر ہی ہوتی ہے، اس لیے اس کا مفہوم حقیر شے ہے، جو شے دور تر ہو وہ زیادہ کوشش سے ہاتھ آتی ہے اس کو اصطلاح میں "آخرت" سے تعبیر کرتے ہیں، اور یہ پائیدار اور گراں قدر بھی ہوتی ہے۔ جو ادنیٰ زندگی اور اس کی زینت پر فریفتہ ہے وہ اعلیٰ زندگی کے فوائد سے محروم رہتا ہے۔ ادنیٰ زندگی ثانی اور اس کے فوائد محدود ہیں اور یہی خورد و نوش و پوشش کے سامان ہیں اور یہ محض بہائم کی زندگی ہے۔ یہ ادنیٰ زندگی بہائم اور انسان میں یکساں ہے کہ دونوں پیدا ہوتے، پرورش پاتے، سوتے جاگتے۔ اور آخر مر کر خاک میں مل جاتے ہیں۔ مگر انسان کی امتیازی خوبی کچھ اور ہے اور اس کا تقاضہ بھی اور ہے وہ یہ کہ آخرت کی زندگی کے لیے سعی بلیغ کرے۔

یہیں دہ آئینہ جام نقشبندی غیب کہ کس بیاد ندارد چہیں عجب بینی
آئینہ بزم سے مراد "دل" ہے کہ ذرا اپنے دلوں کو ٹٹولو اور اس

صودت حالات کا جائزہ لو جو رونما ہو رہی ہے تو تم پر منکشف ہو جائے گا کہ ایسا پر آشوب زمانہ پہلے کبھی نہیں گذرا۔

زندہ باد و جلوت می توں ویدن دین چمن کہ گلے بوجہ است یا سمنی

یہ طوفان بد تمیزی جو آج برپا ہے یہ حادثہ کی صرصر جو آج چل رہی ہے اس نے اس چمن عالم انسانی کو ایک دلیرانہ بنا دیا اور درختوں پر ایک پتہ بھی نہ پھوڑا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ کبھی لہلہاتا باغ تھا اور وہ باغباں کہاں ہے کہ زور و کریم بتائے کہ یہاں سبزہ یہاں گل تھا۔

ایں سہموم کہ بر طرف بوستان بگذشت عجب کہ بوئے گلے بہت رنگ لسنی

یہ زہریلی ہوا جو بوستان پر گزری اس کے بعد یہ بات نہایت تعجب انگیز ہوگی کہ اگر کوئی یہ کہے کہ یہاں پھولوں کی خوشبو اور نسترن کی رنگینی بھی کبھی تھی۔ یعنی ان کی یاد تک دلوں سے محو ہو چکی ہے۔ چمن اور چمن کی خوشبو اور رنگینی کا کیا مذکور ہے۔

نگار خویش بدست کساں بھی بلنم چین شناخت فلک ہی خدمت یمنی

نگار سے مراد یہاں ایران بالخصوص شیراز ہے، جو اب اغیار کے ہاتھ میں چلا گیا۔ خواجہ حافظ کا اشارہ اس واقعہ کی طرف ہے کہ ایران کے تمدن اور تہذیب کو مجھ جیسے لوگوں نے ترقی دی، اور خدمت ملک و ملت میں عمریں صرف کر دیں وہ آج ان ظالموں کے ہاتھ پڑا کہ اس کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا۔

بصبر کوش نوائے دل کہتی دانکنند چین عزیز رنگینی بدست اہرمنی

قصہ سلیمان مشہور ہے کہ آپ کے پاس ایک انگشتری تھی جس پر اسم اعظم کندہ تھا۔ یہ انگشتری کسی طرح ایک دیو کے قبضہ میں آگئی۔ دیو تو سلطنت

پر اسی ام عظیم کی برکت سے قابض ہو گیا۔ اور حضرت سلیمان اس سے محروم ہو گئے۔ ایرانی ہمیشہ کو حضرت سلیمان سمجھتے ہیں، ملک سلیمان، یہی شیراز وغیرہ تصور کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جو مصائب تیمور کی وجہ سے ملک پر نازل ہوئے اس پر صبر کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور حکمت سے یہ بعید ہے کہ دیولعین کے قبضہ میں قائم سلیمانی رہے "اہرمن" اور "یزدان" اہل ایران کے مذہب میں دو متضاد ہستیاں ہیں، "اہرمن" سے مراد شیطان اور "یزدان" سے مراد خدا تعالیٰ خواجہ حافظ تیمور کو "اہرمن" کہتے ہیں جو تاریکی اور ہر ایک گناہ کا دیوتا ہے، یہ پیش گوئی بھی اپنے وقت پر پوری ہوئی۔

خواجہ حافظ اور ہم عصر وزراء | اس حد تک ہم نے ان سلاطین کا ذکر کیا ہے جو خواجہ کے ہم عصر تھے۔

ان میں سے اکثر کا تعلق ایران اور بالخصوص شیراز سے کم و بیش رہا ہے۔ ان میں سے خواجہ کے ممدوح بھی تھے۔ لیکن اپنی سلاطین کے وزراء بھی خواجہ کے ممدوح تھے۔ اور ان سے مراسم دوستانہ بھی تھے، ان کے اسما و گرامی حسب ذیل ہیں۔

۱۔ وزراء شاہ شیخ ابوالسحاق۔ ۱۔ شمس الدین محمود ۱۴۳۳ھ میں وزیر تھا

۲۔ عماد الدین محمود

۳۔ حاجی قوام الدین حسن ۱۴۵۵ھ میں وزیر تھا

۱۔ تاج الدین عزاتی ۱۴۴۵ھ میں وزیر تھا۔

۲۔ برہان الدین خواجہ کمال الدین محمد ابوالمعالی

۳۔ بہار الدین محمود بن عزیز الدین یوسف

خواجہ نظام الدین کا پوتا تھا۔

وزیر شاہ شجاع۔

۱۔ قوام الدین محمد شاہ میں وزیر تھا۔

۲۔ کمال الدین رشیدی شاہ میں وزیر تھا

۳۔ خواجہ قطب الدین سلیمان شاہ بن خواجہ محمد

کمال شاہ میں وزیر تھا۔

۴۔ سید رکن الدین حسن نیروکی

۵۔ خواجہ جلال الدین توران شاہ

ان وزرا میں سے خواجہ حافظ کے مدوح پانچ شخص ہیں۔

مولف تذکرہ "ہفت اقلیم" لکھتا ہے کہ خواجہ عماد الدین مرد دانشمند تھا اور علم طب

خواجہ عماد الدین محمود

کابل دستگاہ تھی۔ خواص افسون پر اس نے ایک رسالہ بھی لکھا خواجہ حافظ

کی غزل میں اس کو سراہا گیا ہے جس کا مطلع ہے

کنش کہ در پچن آمد گل از عدم بوجود

اس غزل کا ایک شعر ہے

بخواہ جام صبوحی بیاد آصف عہد

وزیر ملک سلیمان عماد الدین محمود

ہم لکھ چکے ہیں کہ اہل ایران شیراز وغیرہ مقامات ایران کو ملک سلیمان کہتے

ہیں، حضرت سلیمان کا وزیر آصف بن برخیاہ تھا۔ اس لیے ہر ایک وزیر

کو آصف کہتے ہیں۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ "آصف عہد" یعنی وزیر

ملک سلیمان یا ایران عماد الدین محمود کی یاد میں صبح کی شراب پی لیتا دعا

خیر بوقت صبح کرے۔

خامدان صفویہ کے دور میں ملا صدرا
شیرازی مشہور فیلسوف گذرا ہے۔

جاہلی خواجہ قوم الدین حسن

کے اجداد سے خواجہ قوم الدین حسن ہے جو شاہ ابواسحاق کا وزیر تھا۔
یہ حافظ کا ممدوح ہے اور پتھ تو یہ ہے کہ خواجہ نے اس کے ہل
و سخاوت اور علم و فضل کی جو کچھ تعریف کی ہے یہ اس کا مستحق بھی تھا۔
خواجہ نے تین غزلوں اور تین قطعات میں اس کا ذکر خیر کیا ہے۔

ایک غزل کا مطلع ہے

ساتی نمود بادہ برافروز جام ما مطرب یگو کہ کار جہاں شد بکام ما

اس غزل کا ایک شعر ہے

دیوار اختر فلک و کشتی ہلال صند غرق نعمت جاہلی قوم ما
یہ نیلے رنگ کا آسماں ایک بحر ہے لور بحر کا پانی نیلا ہوتا ہے لور اس
میں ہلال کی کشتی سب میرے جاہلی قوم کی نعمت میں غرق ہیں۔ کہتے ہیں
کہ ایک رات خواجہ حافظ جاہلی قوم کے ساتھ ایک دسترخوان پر کھانا کھا
رہے تھے۔ شور بہ میں آسمان لور چاند کا عکس پڑ رہا تھا۔ خواجہ نے
شعر مودوں کیا کہ مدوں جاہلی کی نعمت میں غرق ہیں۔

دوسری غزل کا مطلع ہے

عشق بالی و جوانی و شراب لعل نام محفل انس و حریت ہمدم و شرب مدام
نکتہ دلے، بندہ گوچوں حافظ شیریں سخن بخشش آموزی جہاں فروز چوں جاہلی قوم
ہر کہ این صحبت نخواستہ خوشی بردے تبا و آنکہ این مجلس بخود زندگی بردے حلام

جوانی لور جوانی میں عشق بازی لور سرخ رنگ کی شراب محفل میں
سرشار لور مدد شراب فامی حلاوت انہیں ایک نکتہ واں لور

بذکرہ گو حافظ بشیریں سخن سا بھی ہونا چاہئے اور دنیا جہاں کو اپنی بخشش
 اور داد و بخش سے والا مال کرنے والا جاگی توام بھی ہو۔ جس کو یہ صحبت
 بھی بےس نہیں بلکہ بھی خوش نصیب نہیں ہو سکتی اور جو ایسی مجلس کا طالب
 نہیں اس کی زندگی حرام ہے۔
 میسری غزل کا مطلع ہے۔

مرا شریعت باجاناں کہ تاجاں در بدن دارم ہوا داراں کو لیش را چو جان تویش
 اگرچہ حافظ کا شہرہ رندی میں تمام جان پہچان والوں میں ہو چکا ہے مگر
 مجھے اس کی پروا نہیں کہ لوگ میری نسبت کیا کہتے ہیں جب تک دنیا
 میں قلم الدین حسن میرا غوار ہے مجھے کسی کا غم نہیں۔

دنیا میں اکثر لوگ اہل جاہ کے حاسد ہوتے ہیں، خواجہ قلم الدین
 کے بارہ میں بھی بعض حاسدوں نے شاہ ابوالاسحاق کو بدظن کرنے کی
 کوشش کی۔ خواجہ فرماتے ہیں۔

میں خواجہ مارا بگو کہ بد بچہ پسند
 دگر تہ در نماں خبر بدت خبر اندھ

میرے خواجہ قلم الدین پر جو حسد کرتا ہے اسے یہ کہو کہ دیکو برائی پسند
 نہ کر کیونکہ زمانہ میں برائی کا بدلہ برائی ہی ملتا ہے۔

مکن بنییز کہ ہرگز بعقل و فکر فضول
 نکل نہ ہم تصرف بدست ماند

ای حاسد تو یہ چاہتا ہے کہ شاہ کو بدظن کر کے خود مند وزارت سنبھال
 لے۔ اور اس لیے اس نامحقوق جدوجہد میں لگا ہوا ہے کہ خواجہ شاہ
 کی نظروں سے گر جائے اور تجھے توقع ہے کہ ہم اختیار و حکومت تیرے
 ہاتھ میں آجائے گی یہ تو قبح بفتقائ عقل و فکر فضول ہے۔ فضول کے
 مدلوں معنی ہو سکتے ہیں ایک بر معنی فضیلت، اور دوسرے ناپید بے فائدہ

لَعَنُوا بِاللَّهِ اِذَا تَوَلَّوْا لَهَا لَعْنَةً كَلِمَةً كَلِمَةً
 یعنی نعمت حاجی قوام کا کہنا کہ بحرِ مصیبت خود بدیں رفقا نہ ہوں
 ایک قطعہ ہم شروع میں درج کر چکے ہیں خواجہ حسن پانچ اشخاص کو یاد
 فرماتے ہیں وہ فارس کی رونق کا باعث تھے ان میں سے ایک حاجی
 قوام الدین حسن ہے۔ ایک اور قطعہ جس میں تاریخ وفات حاجی مرحوم
 ہے حسب ذیل ہے۔

سرموہا بل عاتق، شمع بزمِ انجمن صاحب صاحب تزار حاجی قوام الدین حسن
 وہ حضرات جنکی زندگی منتنات زمانہ میں سے ہے اور جن سے بزمِ جہاں
 کی رونق ہے ان میں سے سربر آوردہ شمع علم و فضل و سخاوت صاحب
 قراں یعنی شاہ ابوالسحاق کا مصاحب حاجی قوام الدین حسن تھا۔
 ماہِ ریح اللعل اندیم روز روزادینہ حکم کردگار ذوالہین
 عفت صد پنجاہ و چار و ہجرت خیر البشر میراجزا مکان و ماہ و انوشدن
 ماہِ ریح الاول کا دن، دو پہر کا وقت، جمعہ کا روز اور ہجرت رسول کریم
 ۱۰۰۰ سال کا تھا۔

آفتاب برج جوزا میں اور ماہتاب سلسلہ میں تھا کہ حکم خدائے
 قادر مطلق۔

مرغِ روضہ شش کاں ہمائی آشیانِ قدس بود۔ شد سوی باغِ بہشت از دامِ این دار
 اس ہما کا مرغِ روح ہو آشیانِ قدس میں بسیرا لیتا رہا اس رنج و غم
 کی دنیا کے جال سے اڑ کر باغِ جنت کو سدھارا،
 جن ایام میں امیر مبارالدین نے شیراز کو محاصرہ میں لیا ہوا تھا۔
 شاہ ابوالسحاق محصور سخت پریشان تھا محاصرہ طویل پکڑ رہا تھا۔ چھ ماہ

اس محاصرہ میں گزرے شاہ نے ایک روز خواجہ قوم الدین سے پوچھا
کہ اس لٹائی کا انجام کیا ہوگا، خواجہ نے کہا کہ جب تک میں زندہ ہوں
تیری حکومت میں کوئی رخنہ اندازی نہیں کر سکتا۔ لیکن اسی دوران میں
خواجہ کا انتقال ہو گیا۔ لہذا مبارک الدین کا قبضہ شیراز پر ہو گیا۔

ابو نصر خواجہ فتح اللہ برہان الدین ابو المعالی
برہان امیر مبارک الدین
کا وزیر تھا۔ یہ بھی

خواجہ حافظ کا مدوح ہے۔

ایک غزل کا مطلع ہے۔

دیدار شد میری دوس و کنار ہم از بخت فکر دارم و اتعنا گزیم

اس غزل کے چند اشعار حسب ذیل ہیں۔

برہان ملک بدیں کہ ز دست ذلتش ایم کل پمیں شد و دیا یسا رہم

برہان الدین وزیر کے واسطے ہاتھ کا جو اہرات کی کانوں اور بائیں

ہاتھ کا دیا سیرت صرف ہو گیا۔

برادری العداو آسمان بطیع جان می کن فدوا و کواکب نثار ہم

دوسری غزل کا مطلع ہے

یا مہیا بحالی و دعا من اللالی یا رب چه و چه آمدگوش خط بلالی

اس غزل کے چند اشعار حسب ذیل ہیں۔

صافی است جام خاطر در دود اصف عهد تم قاسقنی رجھا صفی من الزلال

الملك قویبالی من جدہ و جدہ یارب کہ جاوداں پاو ایں قدرت و ما

مند زوز دولت، کان شکوہ شوکت برہان ملک و ملت ابو نصر ابو المعالی

پوں بنت نقش و دریاں مدیج حال ثابت۔ حافظ مکن شکایت نئے خوریم عالی

برہاں کا انتقال ۱۸۸۰ء میں ہوا، خواجہ حافظ نے قطعہ تاریخ لکھا

یعد شنبہ سادس زماہ ذی الحج بسال نصف صدہ مشاد و جہاں ناگہ

ز شاہراہ سعادت ببلغ رضوانیت فہم کمال ابو نصر خواجہ فتح اللہ

خواجہ قوام الدین محمد بن علی صاحب عیار وزیر شاہ شجاع
۱۸۵۲ء میں مقرر ہوا۔ ۱۸۵۵ء میں نائب السلطنت

اور ۱۸۵۴ء میں کرمان میں قائم مقام شاہ شجاع۔ ۱۸۶۳ء میں شاہ شجاع
نے اسے قتل کیا اور ایک ایک عضو ہر ایک شہر میں بغرض تشہیر بھیا
خواجہ حافظ نے اس کی شان میں ایک قصیدہ اور دو غزل اور دو قطعہ
کیے۔ قصیدہ کا مطلع ہے

زولبری نتواں لاف زو باسانی ہزار نکتہ حدیں کار بہت تامانی

گریز کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

مگیر چشم عایت رحال حافظ باز دیگر نہ حال یگویم ہر اصفت ثانی
وزیر شاہ نکاں خواجہ زمین دزماں کہ خرم است باد حال اسی و جانی
قوم دولت و دنیا محمد بن علی کہ میدرخشدش از بچہ نوریزمانی
مدرا کے بعد کہتے ہیں کہ

شہید ہم کہ زمین بادی کنی گاہ طلب لی کنی زمین سخن، خطا میں سے
دولے ہر مجلس خاص خرم نمی خوانی و گرنہ باتو پہ بحث است در سخندانی
رحال نکاں جہاں کس پو بندہ جمع نہ کرد لطائف حکمی بانکات قرآنی
میں نے سنا ہے کہ تو مجھے کبھی کبھی یاد کرتا ہے لیکن مجھے اپنی مجلس

میں کیوں نہیں ملاتا۔

ظلم تو یہ ہے کہ تو مجھ سے میرا کلام طلب کیوں نہیں کرتا۔ میرا

مقصود یہ نہیں کہ سخذانی میں تمہ سے بحث پھیرنی جائے۔ دنیا جہاں میں
حافظاں قرآن اور بھی ہیں لیکن میرا دعویٰ ہے میری طرح کسی نے نکات
قرآنی اور حکمت کی لطیف باتوں کو سمجھ نہیں کیا۔

دوسری غزل کا مطلع یہ ہے

آنکہ رخسار تندرنگ و نسریں داد صبر و آرام تو اندھین مسکین داد
جس نے تیرے رخسار کو گل و نسریں کی رنگین اور نزاکت دی ہے ہو سکتا
ہے کہ مجھ مسکین کو صبر و آرام عطا فرمائے۔

گنج زر گنج ثمن کعب قناعت باقی است آنکہ آن داد بشارت باں گللیاں اپن داد
اگر گنج زر میر نہ ہو گنج قناعت تو باقی ہے جس نے بادشاہوں گنج زر
یا فقیروں کو گنج قناعت دیا۔

در کف غصہ و دریاں دل حافظ سون شد از فراق رخت ای خواہر قوم الدین داد
غضبناک نمانہ کے ہاتھ میں حافظ دل کا سون ہوا۔ ای خواہر قوم الدین
تیرے دیدار سے بھوری کے ہاتھ سے داد خواہ ہوں۔

تیسری غزل کا مطلع ہے

مکن و خلق و دقا کس بیار ما ترسد ترا حدیں سخن انکار کار کار ما ترسد

اس کا ایک شعر ہے

ہزار نقد بازار کائنات آرد یکے لیکہ صاحب عیار ما ترسد

صاحب عیار وزیر قوم الدین کا لقب ہے عیار کے معنی سونا بھی
ہے۔ عیار کسویٰ کو کہتے ہیں جس پر کھرا کھوٹا سونا پرکھا جاتا ہے

مطلب شعر یہ ہے کہ بازار کائنات میں ہزاروں اشیا ہیں مگر صاحب
عیار کا سکہ خالص سونے کا ہے جس میں کھوٹ نہیں لگا دیکر اشیا

میں کم و بیش یہ نقص موجود ہے۔

وزیر کے قتل کا مادہ مارچ اس قطعہ میں ہے۔

اعظم قوم دولت و دیں اُنکے بردوش
 از بہر خاکبوس نمودے فلک بچود
 فاق جلال و آن سو وزیر خاک شد
 در نصف ماہ ذوالقعد از عرصہ وجود
 کس امید بچود ندارد و گر ز کس
 آمد حرفت سال دفاتش امید بچود
 بود میں فال منقوطہ یعنی "ذ" ہے اس لیے سال وفات ۱۹۶۲ء ہے
 فارسی میں "د" اور "ذ" ایک ہی ہے۔ چونکہ صاحب عیار "کو نہایت
 بے رحمی اور ذلت کے ساتھ قتل کیا گیا خواجہ حافظ اس زمانہ کے
 سینٹی ایکٹ" کی زد سے بھی بچنا چاہتے تھے مگر مدوح کا احترام
 بھی ملحوظ ہو گا اس لیے فرماتے ہیں کہ

گدا گر گہر پاک داشتے اور اہل
 بر آب نقطہ شرمش مدار با لیتے
 بد آفتاب نمودے فسوں جام ندوش
 بھارتی نے خوشگوار با لیتے
 دگر سہرائے جہاں را سرخرابی نیت
 اساس لو بہ ادیں استوار با لیتے
 ناز گرنہ سر قلب داشتے کارش
 بدست اصف صاحب عیار با لیتے
 چو بد گاہ جزیریں یک عزیز داشت
 بھر بہشتن از روزگار با لیتے

بعض تذکرہ نویسوں کو قوم الدین حسن اور قوم الدین محمد کے نام کی مشابہت
 سے متامل ہوا ہے کہ خواجہ حافظ لعل الذکر کی وفات کا افسوس کرتے
 ہیں لیکن یہ صحیح نہیں۔ کچھ شک نہیں کہ خواجہ قوم الدین حسن بھی خواجہ
 حافظ کا مدوح ہے مگر خواجہ قوم الدین محمد کا احترام بھی آپ کے دل
 منکم نہ تھا۔ اس لیے کہ آخر الذکر نے مدرسہ شیلرز میں آپ کو تدریس
 قرآن پر مامور کیا ہوا تھا۔ اور خود قوم الدین محمد اپنے رواد میں فاضل اہل

تھا۔ خواجہ حافظ خواجہ قہم الدین حسن کے دور وزارت میں پچیس سالہ جوان تھے اور قہم الدین محمد کے زمانہ میں اس لائق تھے کہ خدمت دینی پر مامور ہوتے

توران شاہ شاہ شجاع کا وزیر تھا اور
خواجہ جلال الدین توران شاہ شاہ شجاع کے بعد کچھ عرصہ اس کے

بیٹے زین العابدین کے ابتدائی دور میں وزیر رہا۔ زین العابدین اس کی قد و منزلت سے واقف نہ تھا اس لیے اسے برطرف کر کے اصغیان شاہ کو قلمدان وزارت دیا۔ خواجہ حافظ کو توران شاہ سے خاص ولی لگا دیا تھا۔ جب خواجہ حافظ یزد سے ماہوس ہو کر شیراز واپس آنا چاہتا تھا اپنی ایام میں خواجہ جلال الدین توران شاہ بھی شیراز کی طرف آ رہا تھا خواجہ نے ایک قصیدہ پیش کیا اور اپنی پریشانی کے اظہار کے بعد ہر ایک کا تقاضہ کیا۔ قصیدہ کا مطلع ہے۔

مراولیت پریشی بدست علم ہمال چنانکہ بیچ کسم میت واقف لحال

خواجہ جلال الدین نے وعدہ کیا کہ جب شیراز کی طرف دعا لگی ہوگی ہمراہ لے جاؤں گا۔ خواجہ نے اسی امید پر غزل بھی کہی۔ مطلع ہے

گرازیں منزل دیباں ہونے خانہ ہم وگرا آجاکہ ہم عاقل و فرزند ہم
 مقطع ہے

خرم آدم کہ چو حافظ بنوای وزیر سرخوش از میکہ یلدوست بکاشانہ ہم

ایک اور غزل میں اسی مضمون کو دہرایا ہے۔ مطلع ہے۔

خرم آں بعد گزیں منزل دیباں ہم راحت جان طلیم خنپے جانان ہم

مقطع ہے

دو چو حافظ ہم وہ زیباں ہرول ہمرہ کو کبہ آصف حلال ہم

توران شاہ خاندانی امیر تھا ایک دفعہ شاہ شجاع کو بعض حاسدوں نے
بدظن کر دیا کہ وزیر آپ کے دشمنوں سے ساز باز کر رہا ہے اس نے قید کر دیا
مگر تحقیقات پر الزام لے بنیاد ثابت ہوا اس لیے پھر وزارت پر بحال
کر دیا۔ خواجہ حافظ نے ایک قصیدہ تہنیت لکھا۔

مطلع ہے

خیر محکم مرجای طار خنجر خندہ دم شاد ماں کردی مرنا زعم ترا سر تا قدم

چند اشعار حسب ذیل ہیں۔

اں گذشت ای دل کر خواری دیدی دست رقیب

یار باز آمد بجمد اللہ عزیز و محترم

خواجہ توران شاہ عادل دل جلال ملک و دیں

بد آفاق حلا سون الوری غوث الام

قلب بدخواہاں شکست احوال پا بر جامی تو

بر کرا دل نشکند فیروز گرد و لاجرم

ایک غزل کا مطلع ہے کہ

سرم دالت میخانہ بدولت خدای گفت باز آئی کہ دیدینہ میں صگاہی

ایک شعر ہے کہ

تو فقر نملی نعل از دست مند خاجگی و منصب توران شاہی

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ توران شاہ شاہ شجاع کی بد سلوکی سے افسردہ

خاطر ہو چکا تھا کہ ایک حاسد کے کہنے پر ذلیل کیا۔ اس لیے دینوی

جاہ و حشمت سے دل سرد ہو گیا۔ لہذا دین کی طرف زیادہ سے زیادہ

متوجہ رہا۔ فقر سے محبت امدان کی صحبت کا طالب رہا۔ خواجہ حافظ نے

اپنے کلام میں اس کی طرف اکثر اشارہ کیا ہے، اور یہ بھی بتا دیا ہے کہ
یہ مصیبت اس لیے نازل ہوئی تھی کہ تیری صحبت میں بعض بد طبیعت آدمی
بھی تھے ایک غزل کا مطلع ہے کہ

تو مگر رلب جوئے بہ ہوس بکشینی در نہ بر فتنہ کہ بینی ہمہ از خود بینی
عجب از لطف تو ای گل کہ نشینی با خار ظاہر مصلحت وقت ہاں کی بینی
سخن بے غرض از بندہ مخلص بشنو ای کہ منظور بزرگان حقیقت بینی
تا زینے تو پاکیزہ رخ و پاک بناد بہتر آن است کہ با مردم بد یعنی
تو بدیں و کشتی و نازکی ای مایہ حسن لائق بزرگم خواہر جلال الدینی
خواہر حافظ نے اس شعر میں کہ "تو وہ دانی ندون از دست درہ" ہم
خواجگی و منصب تو راں شایہ" اشارہ اس حقیقت کی طرف کیا ہے کہ
منصب وزارت سے مشکل تر فقر و قاق ہے، اور یہ کہ عبادت بجز
خدمت خلق نیست، اس وزارت میں بھی آپ بہت کچھ نیکی کر سکتے ہیں
مگر تو ان شاہ پر اب شان فقر واضح ہو چکی تھی۔ اس لیے خواہر حافظ کی
ایک غزل میں جس کا مطلع ہے

"درد خلد بریں خلوت درویشانت" ایک شعر میں کہتے ہیں کہ
من ظلم نظر آصف عہم کورا صدت خواجگی و سیرت درویشانت
تاریخ وفات کا ایک قطعہ لکھا ہے

آصف دوران جان جہاں تو راں شاہ کہ حدیں مرزومہ جزمانہ خیرات نکشت
کات ہفتہ بدو از ماہ حجب کاند ^{لف} کہ بہ گلشن شد گلشن پر دود بہشت
چونکہ میلش سوی حق بینی و حقگوئی بود سال تاریخ وفاتش بجواز نیل بہشت

اس زمانہ کا وزیر، جہاں کی روح رواں، توران شاہ جس نے اس مرز و دنیا میں نیکی کا بیج ہی بویا تاکہ آخرت میں اس کی جزا خیر ملے۔ ماہِ رجب کی اکیس تاریخ تھی کہ باغِ جنت کی طرف اس آتش کدہ دنیا کے دھوئیں کو پھوڑ کر سدبارا۔ چونکہ اس کی طبیعت ہمیشہ سخی بہنی اور سخی گوئی کی طرف مائل رہی اس لیے اس کی وفات کی تاریخ بھی میلِ بہشت سے طلب کر خواجہ حافظ نے سلاطین اور وزراء کی مدح میں قصائد کہے جو طویل نہیں اور ان کی تعداد جو موجود ہے چھ سات ہی ہے۔ لیکن عمداً غزل میں ایک دو شعر کسی کے سخی میں مدحیہ کہتے رہے اور یہ بھی اپنے خاص انداز و طرز میں۔ قصیدہ گوئی کے مناسب آپ کی طبیعت نہ تھی لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ جس کسی نے آپ سے اچھا سلوک کیا آپ نے اس کا احسان فراموش نہ کیا۔ اس کے مرنے کے بعد بھی اس کے سخی میں کلمہ خیر ہی کہا۔ قصیدہ اور غزل کے ضمن میں آپ نے شیخ سعدی کی روش پر ناصحانہ مشورہ بھی دیا۔ لیکن لطیف پیرا یہ اختیار کیا کہ اگر مدوح میں کوئی عیب کی بات نظر آئی تو اسے اپنی طرف منسوب کرتے ہوئے اپنے ہی دل کو ملامت کی اور تنبیہ کیا کہ یہ بات اچھی نہیں۔ مثلاً جب دیکھا کہ توران شاہ فقر اختیار کرنا چاہتا ہے تو اتنی بات تو بد ملا تھی کہ "تو در فقر مدانی زون از دست مدہ مسندِ خواجگی و منصبِ توران شاهی، مگر ساتھ ہی مقطع میں کہا کہ "حافظِ خام طبع شرے ازین قصہ برآمد" عملتِ چہیت کہ فرودس بریں می خناری

اس شعر میں مدوح کو نہیں بلکہ اپنے آپ کو مخاطب کرتے ہیں لیکن وہ سخی مدوح کی طرف سے۔ دوسرے مقام پر کہتے ہیں کہ

سخن بے غرض از بندہ مخلص بشنو ای کہ منظوم زندگان حقیقت بینی

تو کہ حقیقت و حق آگاہ بزرگوں کا منظوم نظر ہے اس لئے تو فتح یہ ہے
کہ سچی بات تجھے ناگوار خاطر نہ ہوگی۔ میں جو بات کہتا ہے بے غرض
کہتا ہوں اور یہ بھی مسلم ہے کہ میں تیرا بندہ مخلص بھی ہوں جو کچھ کہوں
گا خلوص دل سے کہوں گا۔ اتنی طویل تمہید کی اس لیے ضرورت تھی کہ
اسی غزل کے مطلع میں یہ کہہ دیا کہ

تو گر برب جوئی بہوش بطنی دہن ہر فتنہ کہ بینی ہمہ از خود بینی

تھان شاہ کو قید و بند کی مصیبت اور ذلت بھلینی پڑی تو دراصل قصہ
اس کا اپنا تھا۔ اگرچہ بظاہر ایک حاسد اس کا موجب ہوا۔ کہ اس
کی مجلس میں بدکردار جو مصاحب بھی تھے۔ اس لئے کہتے ہیں کہ
بخدائی کہ قوی بندہ بگزیدہ او کہ میں چاکر دیرینہ کے نگر بینی

قسم کا کہتے ہیں کہ تو اللہ تعالیٰ کا انتخاب شدہ بندہ ہے۔ اس
لیے تیری صحبت کے لائق میرے جیسے پرانے مخلص و قادر نوکر ہی
مناسب ہیں۔

غرض خواجہ حافظ کسی مسخ مدح کی مدح تو کرتے ہیں مگر محض خوشام
نہیں ہوتی کچھ پتہ کی بات بھی بتاتے ہیں۔ شیخ سعدی تو جو کچھ فرماتے
ہیں بے لومہ لائم بر ملامتہ پر کہتے ہیں مگر خواجہ نے لطیف ہیرا
میں نصیحت اختیار کی ہے۔ شیخ سعدی نصیحت بغرض نصیحت نہیں
کرتے۔ اور نہ کسی کے عیوب بیان کرتے ہیں، آپ عل و داد اور
نجات اور تقویٰ کی تلقین کرتے ہیں اور بس، خواجہ حافظ کی نظر
مدح کے عیوب پر ہے وہ عیب اپنی طرف منسوب کر کے اس کی

خدمت بیان کرتے ہیں۔

قصیدہ گوئی میں مستقدین عنصری و فرخی و الوری وغیرہ اور خواجہ کے معاصرین خواجہ لود سلیمان وغیرہ کو جو شہرت حاصل ہے اس لیے انہوں نے اپنا زور طبع اسی پر صرف کر دیا۔ بلاشبہ تشبیب میں وہ مناظر قدرت اور بعض حکمت کی باتیں بھی کہہ جاتے ہیں مگر زیادہ تر یہ خوشامدی شاعر تھے اور ان کا روزگار ہی یہی تھا۔ علم ادب کی خدمت بلاشبہ انہوں نے نادانستہ کی۔ لیکن خواجہ حافظ ان باتوں سے کوسوں دور تھے۔ حکمت کے بیش قیمت جواہرات جو وہ پیش کرتے ہیں بالخصوص نکات تصوف و معرفت جس حسن و خوبی لود پیراہ میں واضح کرتے ہیں بقول مولانا جلی، وہ کسی لود نے بیان نہیں کیے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ فطرت اپنے حسن و خوبی کا اظہار چاہتا ہے لہ کسی نہ کسی صورت میں اس کا اظہار ہو رہا ہے یہ حسن صورت دراصل اسی فطرت کا حسن ہے جو صورتوں میں جلوہ نما ہو رہا ہے، اسی طرح شاعر اپنے افکار کو الفاظ کی موزوں بندش میں واضح کرتا ہے۔ لود یہ بھی حقیقت ہے کہ اس حسن کا دیکھنے والا کئی ہونا چاہئے۔ حسن کا تقاضا ہی یہی ہے۔ شاعر اپنے تمیلات لود افکار کو کسی صاحب نظر کے سامنے رکھ کر کچھ اس کی توجہ کو جذب کو جذب کرنے کے لیے اس کی مدد بھی کرتا ہے۔ تاکہ وہ خوش ہو کر متوجہ ہو۔ مگر مدد گو شاعر میں یہ باتیں تحت الشعاع ہوتی ہیں، بظاہر دوست سوال و بانہ کرنا ہے۔ ایک گنا دعائیں دیتا ہے، چاہلا کر تیرا بھلا ہوگا۔ لود یہ خوشامد کرتا ہے۔ خواجہ حافظ اس تماسس

کے اُمی نہ تھے، کچھ شک نہیں کہ پیٹ کا دھندا لود اہل دیال کا
 تعلق مجبور کرنا تھا کہ روزی کا سامان بھی ہونا چاہیئے اس لیے آپ
 نے مدھیہ قصائد اور غزلیں بھی لکھیں لود صلہ بھی ملتا رہا مگر یہ آپ
 کا پیشہ نہ تھا اور آپ نے اپنی وضع کو کبھی نہیں چھوڑا۔ تصیدہ گو
 شاعر تو مالدار بھی تھے مگر آپ کو ہمیشہ مفلس کی شکایت رہی، کبھی
 اپنے دل کو تسلی دیتے کہ

حافظ از مشرف قسمت گدے باتھایت طبع پھول آب وغزلبائے حال ہااہیں

ایک لود مقام پر کہتے ہیں کہ

حافظ از یم وزرت نیست بردشا کر باش پیر از دولت لطف سخن و طبع یلم

حافظ از فقر مکن مالہ گر شعرا ہیں است بیخ خوشدل نہ پسندو کہ تو محذوں باشی

دفعداری لود شان فقر کا یہ حال ہے کہ کہتے ہیں

ما برے فقر و قناعت نمی بریم باپاوشہ بگوئے کہ دعویٰ مقلدا است

تھم عصر شعراء خواجہ حافظ کا کلام جتنا مقبول ہے یہ کسی لود

شاعر کو نصیب نہیں ہوا۔ معلوم ہوتا ہے کہ

بادجو و مرغاں و مرغ فطرت تھی مگر آپ کی زندگی ہی میں حاسد

بھی پیدا ہو گئے تھے لود آپ کا کلام قبولیت عام حاصل کر چکا تھا

چنانچہ کہتے ہیں کہ

حسد ہی ہلکا اگاست نظر بر حافظ قبل خاطر و لطف سخن خدا داد است

معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی شاعر ہی تھا جو آپ کی کلام کی قبولیت پر جل

ہن کر کوٹہ ہو رہا تھا خواجہ حافظ نے بالکل سچی بات کہی ہے کہ

قبول خاطر و لطف سخن خدا داد است، ہمارے زمانہ میں بھی ایک شاعر نے خواجہ کے کلام پر تنقید کی، ایک دوست نے بطور قال دیوان کھولا تو یہ شعر نکلا۔

کے گیر و خطا بر نظم حافظ کہ بیچش لطف و گوہر بنا شد

اس حقیقت پر کل محققین کا اتفاق ہے کہ دونوں باتیں قبول خاطر اور لطف سخن خدا داد ہیں۔

خواجہ کے کلام میں چند متقدمین اور بمعصر شعرا کا ہم آہنگی ہے۔ ان میں سے ایک حکیم سنائی غزنوی ہے حکیم سنائی کی مدح انوری اور خاقانی اور مولانا دہلوی بھی کرتے ہیں۔ عارف رومی تو یہاں تک کہہ رہے ہیں

نیم بوشی کردہ ام من نیم خام از حکیم غزنوی بشنو تمام

خواجہ حافظ کی ایک غزل کا مطلع ہے

پدید آور رسوم بیوفائی
اس غزل کے دو شعر ہیں

اگر شاعر بخواند شعروں آپ

کہ دل رات و فرا بد روشنائی

ببخشدش چوئی از بخل و امساک

اگر خوبی المثل باشد شائی

یعنی زمانہ اتنا بے دانا خود غرض ہے کہ کسی میں وہ مروت نہیں جو دستوں میں عاجب ہے اور لوگوں کے بخل کا یہ حال ہے کہ اگر شاعر خواہ وہ سنائی ہی کیوں نہ ہو کوئی شعر دعائی کے ساتھ موزوں کرے کہ جس سے ویدہ کا اور زیادہ ہو تو اسے ایک جو بھی نہ دینگے چونکہ سنائی مشاہیر اسلام میں داخل ہے اور اس کا تذکرہ ہم آگے چل کر کر رہے ہیں اس لیے اس مقام پر زیادہ لکھنے کی ضرورت

نہیں دوسرا نام شیخ سعدی کا ہے آپ کے نام نامی سے بچہ بچہ واقف ہے، میں شعر کو پیغمبر سخن مانا گیا ہے۔

کس پر سخن پیغمبر اند
پر چند کہ لا نبی بعدی

ابیات و قصیدہ و غزل را
فردوسی و اوردی و سعدی

آنحضرت خاتم النبیین کی ایک صحیح حدیث ہے کہ "لا نبی بعدی" میرے بعد کوئی نبی مبعوث نہیں ہوگا۔ قطعاً

سعدی

اسی حدیث کی طرف اشارہ ہے کہ اگرچہ آنحضرت کے بعد کوئی پیغمبر نہ ہوگا۔ لیکن پیغمبران سخن ہیں، ابیات میں فردوسی اور قصیدہ میں اوردی اور غزل میں سعدی، خواجہ حافظ بھی کہتے ہیں۔

استاد غزل سعدی است پیش ہم کس ناما
خادم سخن حافظ طرز سخن خواجہ

اس میں کچھ کلام نہیں غزل کا استاد سعدی، کسی سے اور ہم سب یہ حقیقت تسلیم کرتے ہیں مگر حافظ کا طرز کلام خواجہ جیسا ہے، یہ بھی حقیقت ہے کہ انسان کوئی کام نہیں کر سکتا جب تک اس کے سامنے کوئی نمونہ نہ ہو۔ اسی عملی نمونہ کی طرف اشارہ قرآن میں بھی ہے کہ تمہارے لیے اسوہ حسنہ رسول اللہ کی زندگی میں ہے۔ اسی طرح ہر ایک شاعر خواہ متقدمین کا کلام اذیر کر لے۔ مگر طبیباً اس کو کسی ایک استاد کے کلام کو نمونہ بنانا پڑتا ہے۔ خواجہ حافظ یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ سعدی مسلم الثبوت استاد غزل ہے مگر آپ کو خواجہ کا کلام پس آیا لہذا اسی کو نمونہ بنایا۔

کرامان نے کمال الدین ابوالعطا محمود بن علی شخص بہ خواجہ
خواجہ کرمانی بابا کمال شاعر پیدا نہیں کیا۔ اس کے کمال کی سند خواجہ

حافظ کا شعر تذکرہ بالا ہے۔ ۶۴۹ھ میں کرمان میں پیدا ہوا۔ ابتدا میں آل مظفر کا ملاح رہا۔ پھر کرمان سے دوران سفر میں حارث وقت علاء الدولہ سمٹائی (۴۳۶-۶۵۹ھ) کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مدت تک بنگلہ میں رہائش رکھی سلطان ابو سعید بہادر لود خواجہ غیاث الدین محمد رشیدی کی شان میں مدحہ قصائد کہے، آخر شیراز میں آیا اور شاہ شیخ ابوالسحاق کے دربار میں خواجہ حافظ سے بھی شناسائی ہوئی ۶۵۲ھ میں فوت ہوا لود شیراز میں مدفون ہوا۔ خود خواجہ غزول میں شیخ سہلی کا اتباع کرنا ہے لود شیخ کے کلام سے اتنی بہت اور منہ بہت پیدا کر لی کہ اس کو "وزو سہلی" کہتے تھے مولانا مظہری کا خمسہ مشہور ہے۔ یہ پانچ مثنویاں ہیں۔ اکثر شعرا نے طبع آزمائی کی اور خمسے لکھے چنانچہ مولانا جامی لود امیر خسرو دہلوی کے خمسے مشہور ہیں۔ خواجہ نے بھی خمسہ لکھا۔ اس کے علاوہ قصائد و غزلیات و مقطعات بھی اس کی کلیات میں موجود ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ کمال فن یہی ہے کہ جو نمونہ سامنے ہو بعینہ وہی بنا کر دکھا دے اس لیے اگر معاصرین خواجہ کو "وزو سہلی" کہتے ہیں تو یہ اس کی انتہائی تعریف ہے کہ اس کے کلام پر ایک پیغمبر سخن کا اشتباہ ہوتا ہے، کچھ شک نہیں لود خواجہ حافظ خود معترف ہے کہ آپ کا طرز کلام خواجہ کا ہے مگر خواجہ حافظ خواجہ سے بہت آگے بڑھ گئے گو طرز قائم رہی، چنانچہ کہتے ہیں۔

چہ جائے گفتہ من خواجہ و شریساں است کہ شعر حافظ شیراز بہ ز شعر نلبیر

خواجہ اور سلطان ساوی کے سخن کا کیا مذکور ہے حافظ شیراز کا کلام

ظہیر کے شعر سے بھی بہتر ہے ،

اس شعر میں خواجہ حافظ ظہیر کا مرتبہ خواجہ لود مہمان سے
بلند تر بتاتے ہیں لود اپنا مرتبہ ظہیر سے بھی اعلیٰ وارفع بتاتے
ہیں۔ ظہیر فارابی اکابر شعراء عجم میں شمار ہوتا ہے۔ مگر خواجہ حافظ
کا دعویٰ یہاں ہے کہ ظہیر بھی آپ کی بلندی تخیل اور افکار عالیہ کو
نہیں پہنچ سکتا۔ شیخ سعدی سے خواجہ حافظ کے کلام کا موازنہ نہ
ہے ادبی ہے لود خود خواجہ حافظ اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا کہ سلطنت
غزل سعدی ہی کی ہے۔ مگر خواجہ حافظ نے سعدی کی زمیں میں بھی
غزلیں کہیں ہیں۔ مولانا نظامی گجڑی کے بارہ میں خواجہ حافظ کی یہ رائے
ہے کہ

دنم نظامی کہ چسب عہن مملو چو او یسج زیبا سخن

مولانا نظامی کو "خدا کے سخن" کہتے ہیں۔ آپ کا مقابلہ کون کر سکتے
ہے مگر حافظ جلی زبان سے اتنا کہہ گئے کہ

چو ملک در خوشابست شعر نظم تو حافظ کہ گاہ لطف سبق می بود نظم نظامی

یعنی کبھی میرا شعر لطف پیدا کرتا ہے کہ نظامی کے اشارے سے بھی
لطیف تر ہوتا ہے، موازنہ و مقابلہ مقصود نہیں مگر ہم یہاں
مولانا نظامی لود خواجہ حافظ کی ایک ایک غزل درج کرتے ہیں۔

مولانا نظامی فرماتے ہیں۔

دوش رقم بخرابات مرارا نبود کل میں خرابات کی طرف جانکلا مگر

میزوم تالہ و فریاد کس از من نشنود کسی نے اندھا نکل نہ ہونے دیا میں نادر

فریاد کرتا رہا مگر کسی نے نہ سنی۔

یا بادہ فروشوں میں سے کوئی جاگتا
ہی نہ تھا یا میں کوئی شے نہ تھا کہ
کسی نے دروازہ نہ کھولا۔

ایک پہرات گذر چکی تھی یا اس
سے کچھ زیادہ یا کم ایک زندے
دریچے سے سر نکالا اور اس کا چہرہ
دکھائی دیا۔

بولا خیر تو ہے، اس وقت تو کے
بلا رہا ہے لیے وقت بیمار دروازہ
کھٹکھٹانا کس غرض کے لیے ہے
میں نے کہا کہ دروازہ تو کھول جو اب
دیا جا جا بکواس مت کر ایسے
وقت میں بھلا کسی نے کسی کے
لیے دروازہ کھولا ہے۔

یہ بھی تو نے مسجد سمجھ رکھی ہے کہ
جس کا دروازہ ہر وقت کھلا رہتا
ہے جہاں خواہ تو دیر سے آئے
فورا جگہ مل جائے۔

خرابات میں یہ خرابات میں
لہدیہ پانڈوں کا مقام ہے شاید اور
شمع و شراب و فکر لہ ناگ رنگ ہے

یا نبود هیچ کس از بادہ فروشان بیاید
یا نہ من هیچ کس هیچ کس در نکشود

بل سے از شب بگذشت بیشترک یا کمتر
رندی از عرق بردن کرد سرورخ نمود

گفت خیر است دریں رفت کرامی بنما
بے محل آمدت برد ما بہر چه بود

گفتمت در بکشا، گفت برو ہرزہ لگو
کاندیں وقت کے بہر کے در نکشود

ایں نہ مسجد کہ بہر لحظہ دلش بکشاید
کہ تو دیر آئی و اندر صف پیش آئی زود

اں خرابات میں است در و رنداں اند
شاہد و شمع و شراب و شکر و نائے و سرود

ہرچہ حد حملہ آفاق در آنجا حاضر
مومن وارمی و گبر و نصاریٰ و یہود

جو کچھ دیتا جہاں میں ہے یہاں موجود
ہے یہاں ہر ایک رنگ اور تماش
کے آدمی ہیں مسلمان بھی ہیں جرمین
بھی ہیں انگریزی ہیں، عیسائی بھی ہیں
یہودی بھی ہیں۔

گر تو خواہی کہ دل از صحبت انہاں بزدنی
خاک پائی ہر شوہا کہ بیابی مقصود

اگر تو چاہتا ہے کہ ان کی صحبت میں
دل لگائے اور فیض حاصل کرے
تو پہلے ان سب کے نقش قدم پر چل
پھر تیرا مقصد حاصل ہو گا۔

کسی واقعہ یا منظر کا چند لفظوں میں نقشہ کھینچ دینا مولانا نظامی ہی
کا حصہ ہے۔ مولانا شاعر بھی ہیں مصور بھی وہ خیالات اور خدمات
جو کسی مصور کا قلم ظاہر نہیں کر سکتا مولانا کا کلک بے تکلف اس کے
ہر ایک پہلو اور گوشہ کو نمایاں کرتا ہے۔ خواجہ حافظ بھی قادر الکلام
ہیں اور آپ کی طبع کی دعائی تکلفات سے معرا ہے۔ مولانا اور خواجہ
دو دریا ہیں مانند اور غرور قار سے بعید رہے ہیں۔ ایک
کرتا ہوا دعا ہے اس کی لہریں مسکراتی ہوتی چلی جاتی ہیں۔ دوسرا کبھی
کبھی طعناتی پر آتا ہے، دونوں کا دامن موتیوں سے بھرا ہوا ہے
جن کی آب و تاب بے مثل ہے۔ خواجہ نے رندارہ و قلندرانہ
وضع اختیار کر رکھی ہے اور مولانا کی ثقاہت کی صورت اس سے
بہت مختلف ہے۔ خواجہ فرماتے ہیں

می فروشی کی سرائے عاف ستھری
 خاک و غصہ و غا شاگ سے پاک تھی
 پیرمناں بیٹھا ہوا تھا اور بڑے
 بوڑھوں اور جوانوں کو مے نوشی کی
 دعوت سے رہا تھا۔

تمام شراب نوش اس کی خدمت
 میں کر باندھ کھڑے تھے لیکن
 دماغ آسمان پر تھا۔
 جام و ساغر کی چمک دمک کے سامنے
 چاند کی چاندنی ماند پر رہی تھی شراب
 پلانے والے مع نیچے آفتاب کی
 باٹ مار رہے تھے۔

رحمت کا فرشتہ ساغر ہاتھ میں
 لیے سورد پری کے منہ پر گلاب
 کی طرح پھڑک رہا تھا۔
 معشوقوں کی ہانسی نوک بھونک اور
 شور و خل نے شکر بیٹھے توڑی۔
 سن گرایا، رباب توڑا۔

میں نے سلام عرض کیا تو مجھے ہنسنے
 ہوئے کیا کہ اسے غمار کے غم زدہ،
 مجلس شراب کے ماسے ہوئے

در سرائے مہمان رفتہ بود آب زودہ
 نشسته پیر و فلاکے بر شیخ و شای زودہ

سیو کشان ہمہ در بندگیں لبستہ کمر
 ملے زطرت کد نیمہ بر سحاب زودہ

فروغ جام و قلع نور ماہ پوشیدہ
 عندا راہ آفتاب زودہ

گرفتہ ساغر عشرت نوشہ رحمت
 زجر عم بزرخ سورد پری گلاب زودہ

ز شور و عریبہ شایداں شریں کار
 شکر شکستہ سخن دینختہ، بباب زودہ

سلام کردم و بامن بروئے خنداں لغت
 کہ لے غمار کش مجلس شراب زودہ

کہ کر داینکہ تو کر دی یہ ضعف بہت درائے
جو کچھ تو نے کم بہتی اور حماقت سے
زگنچ خانہ شدہ خیمہ بر خراب زدہ
کیا ہے کیا کسی اور نے بھی ایسا کیا
سے کہ گھر میں خزانہ موجود تو نے

اے پھوڑ کر ویرانہ میں ڈیرہ بجا دیا
بھے ڈر ہے کہ دولت بیدار تیرے
کہ خفتہ تو در انخوش بخت خواب زدہ
پاتھ نہیں اُسے گی اس لیے کہ تو
بخت خفتہ کی گود میں سویا ہوا ہے

شیخ سعلی ارشاد فرماتے ہیں کہ

مردودلم دہچنے مردودمانے
ندیں کرے بھیرے مہمئی پیلنے

ایک باغ میں بلند و بالا قامت والا مردود کی مثل میرا دل پھین کر لے گیا
لیکن مرد تو چل پھر نہیں سکتا یہ مردوداں ہے مگر میں طلائی پٹی باندھے
ہوئے تھا۔ لود پٹی مگر کالا جیسے پار یک بال سے

خوشبو سے، ماہ رنخے زہرہ جیسے
یا قوت بے سنگ وے رنگ دانے

سورج کی چمک دمک والا چاند سا فکھڑا، ماتھا زہرہ سناہ جیسی، یا قوت
کی طرح سرخ لب، پتھر کا دل، تنگ و صحن سے
جیسی نفعے ہنجر ہے یوسف عہد
عجم مرہبہ تاج حد سے شاہ نشانی

جیسے کی طرح اپنے دم سے مردوں کو زندہ کرنے والا، خنجر کی طرح راہ
سے واقف، اور اپنے وقت کا یوسف صاحبین ہمیشہ کی طرح بلند مرتبہ
والا، صاحب تاج، شاہی علم کا مالک۔

خشتی شکرینے پو شکر در دل خلق
شوخے نیکے پو نیک شور جہانے

ایسا چالاک کہ نہیں میٹھی بانوں سے لوگوں کے دل کو موہ لیتا ہے۔ ایسا

شوخ کہ اس کا حسن ملیح نمک کی طرح جہاں کو پر شور بنا رہا ہے سے
 جادو کئے عشقہ گئے فتنہ پرستے آسپ و لے رنج مٹنے آفت جانے
 جادو کر رہا ہے، عشقہ گر ہے، فتنہ کو پرورش کرنا ہے، دل کے
 لیے آسپ، جسم کے لیے بیماری، جان کے لیے آفت ہے، سے
 بیدا کرے کچھ کچھ، غریب جوئے شکر شکن، تیرقے، سخت کلمے
 بیدا کر۔ ترپھی ٹوپی سر پر، لڑائی پر آادہ، شکر شکن، تیر کی طرح قد سیدھا
 کان کی طرح سخت ہے

دچشم امل مجزہ آب حیاتے مدآب سخن نادرہ سحر بیانے
 امیدوار توقع کی آنکھ میں تو آب حیات کا مجزہ ہے یعنی زندگی میں تمام
 امیدیں دس غالب ہیں، کلام کے باب میں بے نظیر جادو بیان ہے
 بے زلف مدخ و لعل و لب اور رخ سہا آسے و سر شکر و عبادے و دقلمے
 سہی کا حال اس زلف اور رخ اور یا قوتی لبوں کے بخیر ہو گیا کہ
 اہ لور آنسو لور خاک لور دھڑاں بن کر رہ گیا۔

خواجه حافظ کا ارشاد ہے کہ ہے

ماں کٹاں بھی تند و شراب ندکشیہ صدابروز رشکس جیب نصب صبیہ

مجھ سے ماں بچانا بیوا چلا گیا جو زردی تالوں والا تھا۔ سینکڑوں چاند
 سے لکڑے فالوں نے اپنے کٹان کی جیبیں پھاڑ دیں یعنی شرمندہ
 ہوئے۔

از تاب آتش سے ہر گدھا دشمن ہے پہل نظر بے تبسم ہر گ گل چکیہ

شراب کی عورت لور میزگی سے اس رخسار پر پسینہ ہے اس طرح جس
 طرح گلاب کی پتھریوں پر شبنم کے قطرے رہتے

یا قوت جانفرائش از آب لطف زاده شمشاد خوشخوش از ناز پر مدیدہ

اس کے سرخ پا قوت جیسے جان بخش لبوں کی پرورش آب لطف سے
 ہوئی ہے، اس کا مرد جیسا قد خوش رفتار ناز سے پلائیے سے
 لفظ فصیح نثر میں قد بلند چابک دم کے لطیف نازک چشم خوشکیشہ
 کلام فصیح لور بیضا، قد بلند لور پھریہ، پھرہ لطیف نازک - آنکھ خوبصورت
 کیسی ہوئی -

ہیں لعل و گلشن ہیں جاں خندہ پر آشوب ہاں رفتن خوشش ہیں ماں گم از مدیدہ
 وہ سرخ لب دل کو کھینے طے دیکھ اور وہ اس کا ہنسنا جو لوگوں کو لانا ہے
 لور وہ اس کی خوب صورت چال اور وہ اٹھلا کر چلا دیکھ -
 ہل آہوئے سے چشم از عالم پر دل شد پاناں پر چاہہ مازم با ایں دل مدیدہ
 وہ سیاہ آنکھوں مالا آہو میرے پھندے سے نکل گیا - دوستو اب
 اس دل کا کیا علاج کروں جو بدک کر بھاگ رہا ہے،
 گرفتار شریف رنجیدہ شد حافظ باز آ کہ تو یہ کر دیم از گفتہ و شنیدہ
 اگر تیری خاطر شریف حافظ سے رنجیدہ ہوئی تو لوٹ آ میں نے جو کچھ
 کہا مناسب سے توبہ کی۔

اگرچہ خواجہ حافظ ابتدا میں خواجہ کی طرز پر شعر کہتے رہے مگر
 یہ اندازہ اصل شیخ سہلی کا ہے جس کا اتباع خود خواجہ کرنا رہا شیخ
 اور خواجہ کی ایک ایک نثر بال مقابلہ درج کی جاتی ہے جس سے یہ حقیقت واضح ہو
 چلے گی۔ شیخ سہلی
 خواجہ حافظ رح

ہایاں آمد این دفتر کا بیت پیمان باقی
 بسد دفتر نشاید گفت حسب الہل مشائی
 سیمی منذ صلت بال عراق
 الہی فی لا مالاتی

کتاب بالغ منی جیباً موعظاً معنی
 ان افعل ماتری انی علی عبیدی و میثقی
 نکویم نسبتے دارم بنزدیکان مدگاہت
 کہ خود را بر تومی بزم لباطوسی زلفاتی
 افلائی و اجبائی و ذوا من سبیه مائی
 مرین النفس لاہری و لایکوالی اراتی
 نشان عاشق اں باشد کہ شب بوزہ بوند
 ترا گھر خواب می گیر و نہ صاحب درویشانی
 تم املا و اسقنی کا سادوع مانیہ مسما
 اما انت الذی تسقنی فیض السم تریاتی
 قسح چوں درد باشد بہ ہشیاران مجلس وہ
 مرا بگذار تا حیران بہمانہ چشم درد ساقی
 سعی فی ہنگی الشانی دلمابده ماشانی
 انا لہنون لا اعیاء باحراق و اغراق
 مگر شمش ملک باشد بدیں فرخندہ دیدار
 مگر نفس ملک باشد پاکیزہ اخلاقی
 نقیبت الاسدی الغایب لا تقوی علی مرید
 و عنا لیبی فی شیراز لیبی ہا صدق
 نہ صنت آنورے دار و نہ سعی را سخن پایا
 بمیر و تشہ مستقی درد با ہچمان باقی

الا ای ساد بان ممل دوست
 الی زکبا حکم طال اشتیاتی
 بسانای مطرب خوشخوان و خوشگوئے
 شعر پارسی صوت عراقی
 بیاساتی بدہ اطل گرانم
 متاک اللہ من کاس وصالی
 جوانی باز می آرد پیادوم
 مدائے چنگ و نوشاوش ساقی
 مے باقی بدہ تا بر نشانم
 بیاران مست و خوشدل عمر باقی
 و دو نم خوں شد از نادیدک دست
 الا تعسا لایام انفسرادکی
 و مے بانیک خواہاں متفق بخش
 خیمت داں امور انصافی
 میلے مجہد را ہرانہ
 کہ بانو شید اندہم دمانی
 عوسی بس خوشی اسے دختر از
 وے کہ کہ سر وار طلالی
 ربیع العمری مری حکم
 حکم اللہ با عہد التلاقی

خود از رندہ رود اندازد لے نوش
 بگیا ننگ جوانان عسارتی
 نہانی الشیب من کل الغداری
 سی تقبیل ضد احتشالی
 وصال دوستاں چوں مات
 مگر فاعظ سخن ہائے فراقی
 مفت فرض الوصال ما شعرنا
 بگو حافظ غزلہائے فراقی

ذیل میں ہم ایک ایک غزل ظہیر قاریابی اور خواجہ کی درج کرتے ہیں
 مطالعہ سے واضح ہو جائے گا کہ خواجہ کا رتبہ ظہیر سے بہت بلند ہے
 لہذا اگر خواجہ کی رائے صحیح ہے کہ ظہیر کا مرتبہ خواجہ اور سلمان سے اونچا
 ہے تو فیاس ہو سکتا ہے کہ خواجہ کا درجہ سب سے ارفع ہے۔

خواجہ حافظ

بعزم توبہ سحر گفتم استخارہ کنم
 بہار توبہ شکن می رسد چہ چارہ کنم
 سخن درست بگویم نمی تواند دید
 کہے خورد حریفان و من نظارہ کنم
 بدور لاله صاع مرا علاج کنبد
 گراں میانہ بزم طرب کنارہ کنم
 اگر شے بہ نام حدیث توبہ رود
 زبے طہارتی آن رابے غرارہ کنم

ظہیر قاریابی

چو غنچہ مردہ دل تہیکے نظارہ کنم
 نسیم وصل تو کوتا کہ جاہ پارہ کنم
 بیاد عشوہ اُن چشم و پچیش زلفش
 سخن ہمیشہ ز الہام و استخارہ کنم
 بوصل او چو طہیدن شود فراموشم
 نظر بمر و یک دیدہ سناہہ کنم
 چو ترک خواب کنم شب تینین بیداری
 تہمتے ست کز ان زندگی دوبارہ کنم

مرا کہ نیست رہ در رسم لقمہ پر ہمیزی
 ہماں یہ است کہ میخانہ را اچارہ کم
 گنائے میکند ام لیک وقت مستی ہیں
 کہ ناز بر فلک و حکم بر ستارہ کم
 اگر ز لعل لب یار بوسہ می طلبیم
 بجاں شوم ز سرو زندگی دوبارہ کم
 نہ کا فیم نہ مدس نہ محتب نہ تقیہ
 مرا چہ سود کہ منع شراب بخوارہ کم
 زیادہ خوردن پہناں طول شد حافظ
 بیانگ بر بطوے رازش اشکارہ کم

معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ حافظ نے ظہیر کے بارہ میں اپنی رائے
 بدل لی تھی۔ اگرچہ صاف لفظوں میں اس کا نام نہیں آیا مگر ایک شعر
 میں اشارہ اسی کی طرف ہے یا کسی لہو کی طرف جس کی اسنادی کے
 لوگ مائل تھے۔

آں را خواندی استاد گری بہ تحقیق صنعت گیت املجع رواں نلد
 ظہیر کے کلام میں تصنع زیادہ پایا جاتا ہے۔ لیکن یہ حقیقت بھی یاد رکھنی
 چاہیے کہ شاعری ایک فن ہے صنعت کم و بیش واجب ہے مگر تصنع
 اتنا نہ ہونا چاہیے کہ فطری سادگی پر غالب آجائے۔ فطری حسن و خوبی
 کو زبرد لہو نمایاں کرتا ہے مگر غرض فطری حسن کی تلاش ہے نہ کہ
 تلبذکی۔

خواجہ کمانی اور خواجہ حافظ کے اکثر اشعار میں بظاہر توارو پایا

جانا ہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دونوں ہمعصر شعرا تھے
خواجہ حافظ نے خواجہ کے اکثر اشعار پر تفسیریں کی اور بہتر خیال پیدا کیا
چند اشعار بطور نمونہ ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔

خواجہ کرمالی

خواجہ حافظ

خرقہ رحمن خانہ شمار دار و پیر ما
ای ہمدیا راں مرید پیر ساغر گیر ما
گو شدم از بادہ بدہام جہاں تدبیر عدیت
ہم چہیں رفتہ است از روز ازل تقدیر ما
ماہل دیوانہ درز بجز زلفت بستہ ام
ای بسا قائل کہ شد دیوانہ لہ زنجیر ما
از خندنگ آہ عالم سوز ما غافل مشو
کز کماں برم ز غمش سخت باشد تیر ما

دوش از مجد سوئے میخانہ آمد پیر
چیت یا ماں طر لقت بعد از میں تدبیر
عد خرابات مٹاں مانیز ہمدساں شہ
کایں چہیں رفتہ است از روز ازل تقدیر
عقل اگر داند کہ طل در بند بلفش چوں خوش
عاقلاں دیوانہ گردند از پے زنجیر ما
تیر آہ ما ز گردوں بگذرد حافظ نحوثر
رحم کن بر جان خود پر ہیز کن از تیر ما

خرم آن روز کہ از خط کرمال بر دم
طل و جاں دادہ ز دست از پے جاناں بر دم
تنگویند کہ چوں سوسن ازو آزادم
بچو باد از پے آن سرور خراباں بر دم
گرچہ از ظلمت جہراں بزم جاں بکار
چوں سکند ز پے پشمہ حیطان بر دم
بچو خواجو گرم از گنج نصیبے مدد
دخست بر بندم و زریں منزل دیراں بر دم

خرم آن روز کہ زریں منزل دیراں بر دم
راحت جان طلبم وز پے جاناں بر دم
چوں صبا بادل بیار و تن بے طاقت
بہواداری آن سرور خراباں بر دم
طم از وحشت دندان سکندر گرفت
رفت بر بندم و ما ملک سلیمان بر دم

تیم صبح سعادت بران نشان کہ تو دانی
گند بکوسے فلاں کن بدلاں زماں کہ تو دانی
تو بیک خلوت رازی و دیدہ بر مہر بہت
برومی نہ بعزماں، چناں براں کہ تو دانی
یگو کہ جان عزیزم ز دست رفت خدارا
زلزل روح فزایش نہ بخش اُن کہ تو دانی
من این حروف نوشتم چنانکہ غیر نہاست
تو ہم ندوی کرامت چناں بخواں کہ تو دانی

موجودی عہد از جہاں سبے بنیاد
کہ این تجوزہ عروس ہزار داماد است

ہم کس طالب بارانہ چہ ہشیار چہ مست
ہمہ جاخانہ عشق است چہ مسجد چہ کنشت

می دمد صبح مکہ لیستہ سحاب
الصبوح الصبوح یا اصحاب

نعیاست و موسم گل و یاراں در انتظا
ساقی بروسے یار بر ہیں ماہ و می بیار

ایسا خبری کن مرازاں کہ تو دانی
اں زمیں گزرے کن بدلاں زماں کہ تو دانی
مرغ در طیراں اکی وچوں باوج رسیدی
بول ساز داراں اشیان چناں کہ تو دانی
چناں مرد کہ غبارے بدور سد گذارت
باں طرف چو رسیدی جہاں براں کہ تو دانی

دل دریں پیر زن عشوہ گرد ہر میند
ہاں عزولیت کہ در عہد سبے داماد است

نزل از یار قرین است چہ دوزخ پر بہشت
بہدہ گر چہ نیاز است چہ مسجد چہ کنشت

طلح الصبح من عداد سحاب
عجلو ابالرحیل یا اصحاب

ہائیم عشق و کنج خرابات دردی یار
ساقی ز جام لعل لببت بادہ بیار

چوں کو تہ است رسم ازاں کیسوی درانہ
 ای سرو ناز حسن کہ خوشی کی روی نہ
 زیں پس من و خباش و شہبای دیر باز
 عشاق را نیاز تو ہر لحظہ صد نیا

ہرگز از چرخ بد اختر نشدم روزے شام
 کوکب بخت مرا پیچ منجم نہ ساخت
 مادر و ہر مرا خود بچہ طالع زاد است
 یارب از مادر گیتی بچہ طالع زاد

بادہ می نوشم و از آتش دل می جوشم
 گرچہ از آتش دل چوں نم می در جوشم
 مگر آن آب چو آتش بنشانند جوشم
 مہر رلب زوہ خون میخورم و خاموشم
 ان اشعار کے موازنہ سے اہل نظر دیکھ سکتے ہیں کہ ایک ہی مضمون
 دونوں ہمعصر شعرا کے اشعار میں ہے لیکن خواجہ حاکم کی بندش بہت
 ہے اور تخیل میں زیادہ بلندی ہے اور لطیف تر ہے۔

خواجہ جمال الدین سلمان بن خواجہ علاء الدین محمد
 کی پیدائش "سادہ" میں واقع ہوئی۔ خانمان آس

سلمان ساویجی

حال تھا سلمان کے ایم جوانی خواجہ غیاث الدین محمد فزیری کی مدح میں گذرے
 جب در جوانی اور ممدوح کا زمانہ وزارت سلطنت ایل خانی اور مرگ ابوس
 کے ساتھ ختم ہوا تو امرا جلایر پیر شیخ حسن بزرگ اور اس کی زوجہ
 ولط و خاتون کی مدح میں عمر بسر کی اور بغداد ہی میں اقامت اختیار کی۔

نشاہ سے آخر عمر تک اس نے تصاید شیخ حسن بزرگ اور اس
 کے بیٹے سلطان اولیس اور سلطان نجیب کی مدح میں لکھے۔ اور اولیس کے
 میں اکثر اہم تبریز میں گذرے جب شاہ فجاج کا قتل شاہ
 برنیر پر ہوا تو سلمان وہیں تھا۔ لہذا شاہ فجاج کی شان میں مدحیہ تصیفات

سلطان نے قصائد میں بعض تواریخی واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ایک سال بعد ۱۲ ماہ صفر سال ۱۱۸۸ھ میں "سادہ" میں وفات ہوئی، خواجہ حافظ سلطان کے علم و فضل اور بزرگی کے معترف ہیں۔ چنانچہ اس کی تعریف میں لکھتے ہیں۔

سرآمد فضلا کی نمانہ عالی کسیت زردی صدق و یقین نے دراہ کز سادگان
شبشہ فضلا بادشاہ ملک سخن جمال ملت و دیں خواجہ جہاں سلطان
سلطان نے غزلیات و قصائد و مقطعات و شہزادوں میں واد سخن

دی ہے۔ اس کی بعض غزلیں اور خواجہ حافظ کی بلیقہ ایک ہی ہیں۔

معلوم نہیں کہ خواجہ حافظ کے ویوان میں کب اور کس نے داخل کیے۔

سلطان اور خواجہ حافظ کی زبان ایک دوسرے سے قریب تر ہے

یہاں تک الفاظ کی ترکیب اور اصطلاحات دونوں ہی ملتی جلتی ہیں اور

سلطان کے اشار اور خواجہ حافظ کے اکثر اشار میں تمیز کرنا مشکل ہو

جاتا ہے، ذیل میں دونوں کے اشار بطور نمونہ درج کیے جاتے ہیں۔

خواجہ حافظ

سلطان

بنا کہ گفتم از شوق با دو دیدہ خویش

نہاں زماں بدل و جاں خویش می گفتم

ایا منازل سلی و ایں سلا کی

ایا منازل سلی و ایں سلا کی

آن شب قدرے کہ گویا دل معنی امشب است

عاشقانرا از جمالت روز بازار است امشب

یارب ایں تاثیر دولت از لہامی کو کب است

لبیۃ القدرے کہ می گویند پندار است امشب

نخابی کہ بدشنت شود احوال ورد من
 وہ گیر شمع رادز ہر تابا پیا پیر سس
 نخابی کہ بدشنت شود احوال ہر عشق
 از شمع پیرس قصہ زیاد صبا پیرس

از ازل عکس می لعل تو در جام افاد
 عاشق سوختہ دل در طبع غم افاد
 جام نام ز لعل لب تو لعلی کرد
 راز سر بستہ غم در دهن جام افاد
 حال مشکین تو بر عارض گندم گوں دید
 آدم آندزیے دانہ در دهن جام افاد
 چار غزلیں خواجہ حافظ لور سلمان کے دیوان میں بلفظ موجود ہیں۔
 ان غزلوں کا مطلع ہے۔

۱۔ زلفیں سے غم نجم آمد زودہ باز
 ۲۔ نیر غم ہر نفس از دست فراقت فریاد
 ۳۔ برو بکار کار خود الی و عظیمیں چه فریاد است
 ۴۔ نبارغ وصل تو یا بدریا من رضواں آب
 وقت من شوریدہ بہم زدہ باز
 اہ اگر نالہ زارم نہ ساند بتو یاد
 مرا فادہ دل از کف ترا چه افاد است
 ز تاب بجز تو دار شہرار دوزخ تاب

خواجہ حافظ کے معاصر میں شعرا میں ایک خواجہ عماد الدین
 کہانی بھی ہیں۔ بلوچ زبید و علم فقہ امیر مبارک الدین

عماد فقیر کہانی

شاہ شجاع کے عہد میں مشہور تھے ایک روایت با حکایت ہے کہ
 خواجہ عماد نے ایک بلی پال رکھی تھی بعد اس کو نماز میں قیم و کوع و
 سجدہ سکھایا ہوا تھا، جب خواجہ عماد نماز پڑھتے تو وہ بھی متابعت کر کے
 شاہ شجاع اس کو خواجہ عماد کی بڑی کرامت تصور کرتا اس لیے اس سے

خاص عقیدت تھی۔ اور بنایت احترام سے پیش آنا۔ خواجہ عماد نے کرمان
 میں ایک زاویہ تعمیر کیا ہوا تھا وہاں اپنے مریدوں کے ساتھ بیٹھ ان کو
 اپنے ارشاد سنایا کرتے۔ حقیقت یہ معلوم ہوتا ہے کہ یار دوستوں نے
 یہ قصہ گھڑا ہے۔ اور خواجہ کے اکثر اشار کی شان نزول ایک حکایت
 دعایت کرتے ہیں۔ خواجہ کی ایک غزل کا مطلع ہے۔

صوفی نہاد ہم وعدہ حقہ باز کرو بنیاد مکر باطلک حقہ باز کرو

اگرچہ صوفی نے حال بچھا رکھا ہے اور مکر و فریب کا دروازہ کھول رکھا ہے
 یہاں تک آسمان سے بھی گولیاں کھیں رہا ہے۔

بانہی چرخ بکشندش بیفتد کلاہ زہرہ کہ عرض شجبدہ با اہل باز کرو

آسمان تو خود ایک مداری ہے بھلا ایسے فاقف راز مکر و فریب سے
 بانہی کیسے لے جا سکتا ہے، آسمان اس کی ٹوپی میں اٹلا توڑ کر رکھ دینگا
 اور ان کو شکست دے گا۔

ساقی بیا کہ شاہد رعنائی صوفیاں آمد و گرجلہ و آغاز ناز کرو

اے ساقی اے صوفیوں کا رنگیلا پھیلا معشوق جلوہ گر ہو رہا ہے اور ناز و
 کرشمہ شروع کر رہا ہے۔

ای کل بیا کہ ما بہ پناہ خدا بعیم آں چہ آستیں کو تہ دست مداز کرو

اے دل ان کو تہ آستین صوفیوں کی دست دہانی سے خدا کی پناہ ڈھونڈیں
 ای لیک خوش خرم کہ خوش میری بند غو مشو کہ گہ عابد نماز کرو

اے چکو تو اطمینان اور خوشی خوشی نماز سے چلتا ہے، اس بات پر نہ
 جانا کہ عابد بھی نماز پڑھتی ہے۔

فرما کہ پیش گاہ حقیقت شود پدید ٹمر منہ رہوئے کہ نظر بر مجاز کرو

کل جب حقیقت منکشف ہو جائے گی تو وہ سخت نادم ہوگا جس
کی نظر مجاز یعنی دنیا اور اس کی زینت پر تھی۔
حافظ مکن ملامت دلاں کہ حد ازل ماخذ از حد ہد پلے نیاز کرو
لی حافظ تو زندگیوں کو ملامت دکر کہ ہمیں خدا نے لونا ازل سے وحداد
یا سے بے نیاز کر رکھا ہے۔

کچھ شک نہیں کہ اس تمام غزل میں ریائے سخن یا کار صوفیوں کی
طرت ہے ام عماد فقیر اور صوفی بھی اسی زمرہ میں تھا۔

خواجہ عماد صوفی بھی تھے اور شاعر بھی تھے۔ اور خواجہ حافظ سے میدان
شاعری میں گونے سبقت لے جانا چاہتے تھے اس لیے ان میں لوگ
جھونک بھی رہتی، تذکرہ نویس یہ بھی کہتے ہیں کہ خواجہ عماد خواجہ حافظ کے
مضامین سرقہ کیا کرتے اسے میں کچھ شک نہیں کہ وہ خواجہ کے شاعرانہ
تخیل اور حکیمانہ نظر کی بلندی کو تو نہیں پہنچ سکتے تھے مگر شراہے کہتے ہیں
اس نے خواجہ حافظ کی زمیں میں اکثر غزلیں لکھی ہیں، اور خود خواجہ حافظ
نے خواجہ اور سلمان اور ظہیر و سعدی کی زمیں میں زور طبع دکھایا ہے
یہ کوئی عیب کی بات نہیں ذیل میں ہم چند اشعار بطور نمونہ پیش
کرتے ہیں۔

خواجہ حافظ

عماد قصیدہ

نامہ زلف تو در دست نیم افتاد است

علم از تیغ فراق بدو نیم افتاد است

حل سوزاز وہ از غصہ در نیم افتاد است

در میان غمت از غصہ جو نیم افتاد است

بناں بلبل دگر بالست مہربان لیت

امید بلبل ز گل دنا دار لیت

کہ مادر عاشق نادیم و کار بازار لیت

ولے دنا دکنہ شاعرے کہ بازار لیت

تو حاکمی و مراسم بر آسمانہ تست
مکن خرابی ملک علم کہ خانہ خانہ تست

تہنہ خورم بادہ صافی کہ حرام است
و ایں عیش کہ دوست جلال است کلام است

گل در بر دمی در کف و معشوقہ بہام است
سلطان جہنم بچنیں روز غلام است

اسی قبل کے اشارہ بھی ہیں مگر فہم و تفہیم کے لیے یہی کافی ہیں۔ یہ
حقیقت بھی ذہن نشین کوئی چاہئے کہ عمداً بلند پایہ شعرا کے کلام میں توارد
پایا جاتا ہے، اشارہ میں مضمون بھی ملتا جلتا ہے، دیکھنا یہ ہے کہ
کس نے بہتر باندھا ہے۔ شاہ شجاع کو اگر عماد کا احترام ملحوظ تھا تو اس
کے چند وجوہ اور بھی ہیں اور عماد فقیہ بھی تھا اور والدہ کی طرف سے
شاہ شجاع کا تعلق بقراختا بیاں کرمان سے تھا۔ عماد صوفی صاحب
خانقاہ تھا اور اس کے لیے شمار مرید تھے قائدان مظفر میں کرمان
متنازع فیہ تھا۔ شاہ شجاع کی سیاسی غرض تھی کہ ان لوگوں کو اپنا گردیدہ
بنائے۔ عماد سکاٹلہ میں فوت ہوا۔

کمال مجتہدی
شیخ کمال الدین مسعود بھی خواجہ حافظ کا ہم عصر ہے
شیخ مجتہدی میں پیدا ہوا۔ اور عرفاً اور شعراً عصر میں
مشہور تھا۔ مجتہدی سے لعل مکانی کے تبریز میں رہائش اختیار کی، سلطان
حسین جلایری کا درباری تھا اور سلطان نے اس کی آسائش کے اسباب
بھی فراہم کر دیے تھے، اور ایک صدمہ بھی تعبیر کر دیا تھا تذکرہ ہرات النبی
ہم مذکور ہے کہ دونوں ہم عصر شعرا کی ملاقات تو نہ ہوئی مگر کمال نے ایک

غزل خواجہ کے پاس بھیجی تھی، خواجہ نے اس میں غزل تو
 لکھی مگر دلیف چشم پر خواجہ کی بھی ایک غزل ہے۔ ہم دونوں ذیل میں
 درج کرتے ہیں۔

کمال بخشگی خواجہ حافظ

یار گفت از خیر ما پوشاں نظر گفتم چشم
 فانگہ وز دیدہ درمای نگر گفتم چشم
 گفت اگر بانی نشان پائے ما بر خاک راه
 بر زماں آنجا بدامن ہاگر گفتم چشم
 گفت اگر گویا شبہ از حدی ہوں مامم جدا
 تا سحر گاہاں ستارہ کی شمر گفتم چشم
 گفت اگر گرد و لبت خشک از دم سلاں
 باز عیب بخش چو شمع از دیدہ تر گفتم چشم
 گفت اگر سرحد بیاباں خم خواہی نہاد
 تشنگاں ما مژدہ از ما بسر گفتم چشم
 گفت اگر بر آستانم آب خمایی زوداشک
 ہم بزرگانت بدوب آنجا گذر گفتم چشم
 گفت اگر حالی خیال حد وصل مالکال
 قہرایں دیدیا بہ پیماسر بسر گفتم چشم
 جب یہ غزل خواجہ حافظ کی نظر سے گئی تو فرمایا کہ یہ مشرب اور
 بزرگوار عالی است ۔

خیال دے تو گر بگنجد بہ گلشن چشم
 دل از سپے نظر آید بسے مدزن
 بیا کہ لعل و گہر و نثار مقدم تو
 دگر خانہ دل می کشم بہ مخزن چشم
 منزلے تکیہ گیت منظرے نمی بزم
 منم لعالم دایں گوشہ میں چشم
 سحر سر فلک ادہم سر خرابی داشت
 گرم نہ خون جگر می گرفت دامن چشم
 نخست دوزخ دیدم رخ تو دل می گفت
 اگر زرد خلیے خون من یہ گردن چشم
 بیوی مژدہ وصل تو ما سحر ہم شب
 براہ باد بہ نام چراغ بخش چشم
 بر روی کہ دل درد مند حافظ را
 مزن نبادک دل دوز مردم انگن چشم
 جب یہ غزل خواجہ حافظ کی نظر سے گئی تو فرمایا کہ یہ مشرب اور

ذیل میں ہم خواجہ کمال کی ایک غزل جو دونوں نے ایک ہی

کی بغرض موازنہ پیش کرتے ہیں۔

کمال

خواجہ

آنچہ تو داری بحسن ماہ ندارد
جاہ و جلال تو بادشاہ ندارد
جانب دلہا نگہدار کہ سلطان
ملک نگیرد اگر سپاہ ندارد
ماشوق اگر سے کشتی بجز محبت
بیشتر از من کس این گناہ ندارد
رقت قلب آشکار کرد محبت
جان تنگ راز دل نگاہ ندارد
صوفی ما ذوق رقص دارد و حالت
اے کہ سوز عدوں و آہ ندارد
زحمت مهرچوں برد کمال بدیں در
زانکہ خبر این آشناں پناہ ندارد
کمال کا یہ شعر کہ جانب دلہا نگاہدار کہ سلطان ، ملک نگیرد اگر
سپاہ ندارد «خواجہ حافظ کے دیوان میں بھی سب سے بڑے شعر کمال
کا ہی ہے۔ غلطی سے خواجہ سے منسوب کیا گیا ہے۔ کمال اپنے
معاصرین کے حق میں کہتا ہے کہ

مرا بہت اکثر غزل بہت بیت

چو گفتار سلطان زلفت زیاد

میری اکثر غزل کے ابیات سات ہیں۔ جو بسبب سہولت حافظہ میں محفوظ

ہو سکتے ہیں، سلمان کی طرح میں طویل غزلیں یا قصائد نہیں کہتا کہ یاد نہ ہو سکیں۔

پہر حافظ بھی خواہدش در عراق بہ بندو لداں ہجو سہج شداد
جب حافظ اسے عراق میں پڑھے گا تو سہج شداد یعنی سات سات سموت
آسمانوں کی بندش کی طرح اس کی روح کو اس سے بلند پرداز کرنے
کا راستہ بند ملے گا۔ یعنی میرے فکر کی بلندی کو حافظ کا خیال بھی نہیں
پہنچ سکتا، سے

بہ بنیاد ہر ہفت چوں آسماں کزیں جنس بیٹے نادر و عماد
میرے ہر ایک شعر کی بنیاد سات، آسماں کی طرح مضبوط ہے اس
جنس کا شعر عماد فقیر کے ہاں نہیں ملے گا۔
کمال کی تاریخ وقات میں اختلاف ہے۔ غالباً ۹۳ھ میں فوت ہوئے۔

غالب حافظ کا ہم عصر اور دوست
مولانا شیخ ابوالحسن شیرازی
مولانا شیخ احمد ابوالساق بلقب

بہ غزالدین "اطمہ" کے نام سے مشہور ہے۔ وہ یہ ہے کہ اشار
میں طعم ہی کا ذکر خیر کرتے ہیں اور اکابر شعرا سعدی و حافظ وغیرہ
کے اشار پر تعین اسی مزاجید رنگ میں کیا کرتے۔ خوش طبع تو ضرور
تھے مگر عارف عہد شاہ نعمت اللہ دلی کے مرید بھی تھے، غائبہ کو بھی
عقیدت تھی۔ مولانا نے اپنی طبیعت کے موافق کتاب "کنز الاستہبات لکھی
دیباچہ میں کہتے ہیں کہ سے

خونے کشیدہ ز سخن تاف تالقات ہم کاسہ کجاست کہ آمد برابرم
اپنے کلام کا ایک وسیع و سرخوان بچپایا، ہم پیالہ کہاں ہے کہ میرے

برابر بیٹھے، یعنی کوئی برابری نہیں کر سکتا۔

شاہ نعمت اللہ کے اشار ہیں۔

گوہر بحر بکراں مایم گاہ موبہیم و گاہ دریا یم
ما بناں آدمیم در عالم کہ خدا را بخلق بنا یم
اس پر مولانا نے کہا

رشتہ لاک معرفت مایم گنمیریم گاہ بغزایم

ما اناں آدمیم در ملیح کہ بما بیمیر قلیہ بنا یم

لاک، محفہ ہے، لا عرفناک، کار میں نے مجھے نہیں پہچانا

اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ لاک، کار رشتہ معرفت خود میرے
ایسے بندے ہیں۔ ذات الہی کی معرفت تو ممکن نہیں مگر اس کی نعمت،

کا عرفان ہمیں حاصل ہے، اس دنیا میں ہم اس لیے آئے ہیں کہ
پھوٹی پھوٹی پھلیوں کے کباب بنا کر کھا میں شاہ نعمت اللہ نے اپنے
آپ کو دریا اور موج لود گوہر سے تشبیہ دی شیخ نے خمیر لود پلاؤ
لہ پھوٹی پھوٹی پھلیوں سے بغزایم چادل لود گوشت کی آمیزش سے
شاہ خوارزم خان نے ایجاد کیا تھا۔ لاک، عربی میں خوناک چبانا لود
فاری میں گنگ کو کہتے ہیں۔

شاہ صاحب نے بھی یہ پیروڈی، (سنی، شیراز میں وارد

ہوئے تو ایک مجلس میں ابوالسحاق لہی موجود تھے۔ شاہ صاحب نے فرمایا
کہ کیا رشتہ لاک معرفت آپ ہیں۔ جواب دیا کہ اللہ کی نسبت تو میں کچھ
کہ نہیں سکتا البتہ نعمت اللہ کے بارہ میں بھی کچھ کہا کرتا ہوں۔ شاہ صاحب
پھر اُسٹھ اور شیخ بھی آپ کے حلقہ ارادت میں شامل ہو گیا۔

شیخ سعدی کی غزل کا مطلع ہے

مثنوی کا دست کہ غیر از تو مرا یا سے ہیست، یا شب روز بجز نگر توام کارے ہیست
شیخ ابوالسحان نے تفسیر کی۔

مثنوی جاں کہ بجز و نید مرا یا سے ہیست۔ یا بجز مالش چنگال مرا کارے ہیست
خواستم پردہ ناں از سر نتماج کسٹم
چہ عیب گنگر اگر ہمنفس بریاں شد
بہمہ دانند کہ در صحبت گل خاسے ہیست
خواجہ حافظ کے اکثر اشعار پر
شیخ نے تفسیر کی ہے

شیخ

خواجہ

آنانکہ خاک را بہ نظر کیمیا کنند
آیا بود کہ گوشہ چشمتے ہما کنند
کیا بزاں سحر کہ سر کلمہ وا کنند
آیا بود کہ گوشہ چشمتے ہما کنند

چوں از دروں خریزہ آگ نشد کے
ہر کس حکایتے بہ تصور چرا کنند
طلعت فرس پیر ماہ مدارد
حیات تاں، چہر بادشاہ تبارد
دشمنی طلعت تو ماہ تبارد
پیش تو گل رونق گیاہ تبارد

روہ عالی و قاعیت جو سم بود دل
چشمکے کی زواں ابرہ بریاں کہ پیرس
ہام از زلف سیاہ گل چنداں کہ پیرس
کہ چہاں نود شدہ ام بے سرد ساں تو پیرس

پس از ہی پلہ بر من کشف شدایں لاز پنیہا
کہ بورانی است باو نجاں و باد نجان بورا
ہوخواہ توام جانا و میدقم کہ میدانی
کہ ہم نادیدہ میدانی ہم ننوشتہ میخوانی

اگر اس ترک شیرازی بدست آرا دل مارا
 بخال ہندویش بختم سمرقند و بخارا را
 پہلیم چوں خراسانی گرائی صحن بخارا
 بھوی تکیہ اشش بختم سمرقند و بخارا را
 مدح زرد و صابونی اگر حاری غنیمت داس
 کنار آب رکن آباد و گلگشت مصلی را
 پیر آرائی بمشک و زعفران رخسار پالودہ
 رنگ دہوی و خال و خط پیر حاجت علی زیا
 جمال بجزو بریاں و حسن و نیر کشک
 چناں بروند میرز دل کہ ترکان خوان ہنوا
 بگالحتی و صفت خوشہ انکور مشالی
 کہ بر نظم تو انشاء فلک نظم ثریا را
 شیخ اسحاق کا انتقال ۸۳۰ھ میں خواجہ حافظ کی وفات کے
 تیس سال بعد ہوا۔

علی دناکانی
 خواجہ نظام الدین عبید اللہ قزوینی خاندان ناکانیاں
 کے ممتاز فرد ہیں۔ قابل عرب سے خاندان کو
 نسبت ہے۔ اس خاندان کے افراد علم و دولت میں بھی قزوین میں امتیاز
 رکھتے تھے، بعض مرتبہ عدالت پر بھی متمکن تھے، لہذا خواجہ عبید بھی ایک
 وقت وزارت کے رتبہ پر فائز تھے۔ اسپنے زمانہ کے مشہور علما میں آپ
 کا شمار ہوتا ہے، ہر ایک مذکورہ لوہیں نے آپ کا ذکر کیا ہے، عبداللہ
 منوقی صاحب "گزیدہ" آپ کا ہم فہری لہذا ہم عصر تھا، لکھتا ہے کہ
 "صاحب معظم خواجہ نظام الدین عبید اللہ خوب اشعار کہتے ہیں لہذا رسائل
 بے نظیر لکھے ہیں، دولت شاہ سمرقندی مذکورہ اشعار میں لکھتا ہے کہ

• اصل الظرفاء و رتبة الفضلاء عبید زاکانی مرد خوش طبع و اہل عقل
 تھا۔ ہر چند اہل علم و فن اس کو ہزل گو کہتے ہیں لیکن علوم و فنون سے
 خوب واقف تھا۔ شاہ شیخ ابوالاسحاق کے عہد میں شیراز میں تحصیل علوم
 میں مشغول تھا۔ علم معانی میں ایک کتاب تصنیف کی اور شاہ کو پیش
 کی۔ بعض درباریوں نے کہا کہ مسزہ آیا ہے اور بادشاہ اس کی طرف
 متوجہ ہے۔ عبید نے جواب دیا کہ اگر بادشاہ کا قرب مخزنی سے حاصل
 ہو اور ہزل مقبول ہو تو عطاء و فضلاء کو کون پوچھنے والا ہے۔ کے پڑی
 ہے کہ بیہودہ جارح لطیف کو چراغ مدسہ کثیف کے دیو میں سے سیاہ
 کرے۔ کسی دوست نے کہا کہ افسوس ہے کہ اس علم و عقل کے ہوتے
 تو ان ہنریات میں پڑا ہے عقل سے بعید تر ہے، جواب دیا ہے
 ای شاہر مکن تا بنوالی طلب علم کا مد طلب ماتب ہر مدہ بمانی
 و مسزگی پیشہ کن و مطربی آموز تا داد خود از کبتر و متہر شبانی

بات اصل میں یہ ہے کہ ملک کے طفل و عرض میں فتنہ و فساد اور
 بد نظمی کے علاوہ اہل دین و میں فروش اور صوفی ریاکار اور منافق جاہل پارسی
 میں بہت پیدا ہو گئے تھے اور سادہ لوح لوگوں کی جیبیں خالی کرتے۔
 عبید اور خود خواجہ حافظ ان کا پول کھول رہے تھے تاکہ لوگ ان
 کے دم زدیر میں نہ پھنسیں۔ خواجہ عبید نے جو کچھ لکھا اپنی لوگوں اور
 عیش پرست امرا کی خدمت میں لکھا۔ اور ایسا عریاں ہو کر لکھا کہ زبان
 زو خلایق ہو گیا اور اس زمانہ کی مشہور شخصیتیں بھی اس سے خوف زدہ
 تھیں۔ ایک دفعہ خواجہ سلمان ساویجی قزوین میں وارد ہوئے۔ امیرانہ
 ٹھاٹھ کے ساتھ نہر کے کنارے خیمہ میں ٹھہر گئے، عبید زاکانی کو اطلاع

ہوئی تو پیا پیا وہاں پہنچے۔ ایک دفعہ خواجہ سلمان نے عبید کی شان میں ایک
قطرہ لکھا تھا۔

جہنمی و ہجاگو عبید ناکانی مقرر است بہ بیدلہی و بدینی

اگرچہ نیست قزوین عدوت ناداست ولیک می شود اندر حدیث قزوینی

عبید ناکانی جہنمی اور ہجاگو نو بیدلہی اور بے دینی میں مشہور ہے۔ اگر
شہر قزوین کا رہنے والا نہیں ایک گنوار کا بیٹا ہے لیکن کہتے ہیں
کہ قزوینی ہے۔

بھلا خواجہ عبید اتنی بات سن کر خاموش کیسے رہ سکتا تھا۔ سلمان
کی مجلس میں اُدھکار سلمان نے پوچھا کہ بھائی کہاں سے آنا ہوا۔ کیا
قزوین سے پوچھا کہ کچھ سلمان کے شعر بھی یاد ہیں، کہا کہ ہاں ایک دو
نہیں بہت یاد ہیں۔

من حرا بانیم و بادہ پرست مدخلات مناع عاشق دست

می کشتم چو صبوحش بدوش می برزم چو قدح دست بدست

یہ اشعار پڑھ کر کہا کہ خواجہ سلمان تو بزرگ فاضل آدمی ہے،
میرا گمان ہے کہ یہ شعر سلمان نے نہیں کیے۔ اس کی بیوی نے کہے
ہوں گے کیونکہ ایسے اشعار کو اسی سے نسبت دی جائے تو مناسب ہے
سلمان بھڑک اٹھا مگر فوراً سمجھ گیا کہ یہ عبید ناکانی ہے، تم دے کر پوچھا
کہ پرچ کیو تم عبید ناکانی ہو، کہا ہاں، تو عجیب، جو لوہے سے کہ نا دیدہ
میرے سخی میں ناشائستہ کلمات کہے، میرا ارادہ تو یہ تھا کہ بغداد میں جا کر
تیری مزاج پر سی کرنا اور وہ پھلک سنا تا کہ تو لوگوں میں ذلیل خوار ہوتا
تو اپنی خوش قسمتی سمجھ یہاں ملاقات ہو گئی اور احد میری زبان سے

کوئی حرف ایسا نہ نکلا تو تجھے اپنے کہے پر ندامت ہوتی۔ ملان
نے محنت کی اور نقد و پاس پیش کیا۔ دونوں میں مصالحت کے بعد
دوستی بھی ہو گئی۔ عبید کی بیوہ اور ہزلیات سے ہر ایک شخص ہر سال
لٹا۔ اور ہر ایک کچھ نہ کچھ خدمت کرتا۔

خواجہ عبید کی یہ غزل مشہور ہے۔

مردم بعین خوشدل من مبلایے قرض ہر کس بعین شغل من مبلایے قرض

قرض خداد قرض خلایق بگردنم آیا اولے قرض کم یا اولے قرض

قرض اور قرض میں تم نہیں ہے۔ میری گردن پر خدا کا قرض اور لوگوں کا
قرض ہے۔ اب قرض ادا کروں یا قرض۔

دو کچھ قرض دادم محلہ قرض و شہر قرض دادم واندہ لڑے قرض

ہر طرف سے قرض میں گھرا ہوا ہوں کچھ اور محلہ اور شہر اور لڑے
میں مجھے قرض خواہ ہی نظر آئے ہیں۔

عوضم چو آیم سے گدایاں بیادوت ازیکہ خواستم زود ہر گدائے قرض

جس طرح فقیروں کی آبرو سہال سے برباد ہوئی ہے اس طرح میری
عوض کا حال ہوا کہ میں نے ان سے سہال کیا جو خود مقروض ہیں۔
میں نے بھیک منگتوں سے بھیک مانگی۔

گر خواجہ تربیت نہ کند مر عبید را مکیں چگونہ بار بار ہزار جملے قرض

اگر خواجہ عبید کی ربوبیت نہ کرے تو بے چارہ قرض کی مصیبت سے
کیسے بچھڑے گا۔

عبید ناکالی کی وفات ۱۰۱۰ھ میں واقع ہوئی۔

مولانا جامی "نعمات الانس" میں اولیاء اللہ کے
بمعصرو اولیاء اللہ کے ضمن میں خواجہ حافظ کا ذکر کرتے ہیں
 کہ آپ لسان الغیب اور ترجمان الاسرار ہیں، اکثر اسرار غیبی اور معالی حقیقت
 کو لباس الفاظ میں جلوہ دیا، اور صورت مجاز میں پوشا کر لیا۔ اگرچہ
 یہ معلوم نہ ہوا کہ آپ کا مرشد کون تھا مگر آپ کا کلام صوفیہ کلام کے
 مشرب پر اس طرح قانع ہوا ہے کہ اس سے بہتر آج تک کسی نے
 نہیں لکھا۔ ایک نقشبندی بزرگ فرمایا کرتے تھے کہ دیوان حافظ سے بہتر
 کوئی دیوان نہیں،

عبدالغادر بدایونی اولیاء عہد اکبر بادشاہ کے تذکرہ میں شیخ نظام الدین
 ابھیٹھ والا کا ذکر کرتا ہے کہ ایک روز بوقت شام آپ صحن مسجد میں
 تصوف کے حقائق بیان فرماتے تھے اور اسی تقریب میں خواجہ حافظ
 کے کئی شعر پڑھے، حسین خان کے ایک صاحب نے پوچھا کہ خواجہ حافظ
 کس کے مرید تھے فرمایا خواجہ حافظ بہاول الدین نقشبند کے مرید تھے۔
 ملفوظات شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی میں مذکور ہے کہ ایک
 روز شاہ صاحب نے فرمایا کہ حافظ اکثر فریاد سلوک شعر میں بیان کرتا
 ہے عالم اور متقی تھا اور جیسا کہ ہم لوگوں کا خیال ہے شراب نہیں پیا
 تھا۔ اور شاہ بیرنگ نامی کا مرید تھا۔ امیر تیمور نے شیراز فتح کیا تو
 عادتاً ہم امدان شہر کو اپنے ساتھ لے گیا۔ ان میں خواجہ حافظ بھی
 تھے۔ حضرت خواجہ نقشبند اس وقت بقیہ حیات تھے، خواجہ حافظ سے
 ان کی ملاقات ثابت اور مشہور ہے، لیکن استفادہ کی نسبت معلوم نہیں۔
 اگر خواجہ حافظ خواجہ نقشبند کے مرید ہوتے تو مولانا جامی جو اسکی

سلسلہ کے ایک بزرگ ہیں ضرور اس کا ذکر کرتے لہذا مولانا جامی کا زمانہ
 بھی اقرب ہے۔ وہ ملاقات کا حال یہ ممکن تو ہے مگر قرآن سے معلوم
 ہوتا ہے کہ یہ بھی صحیح نہیں کیونکہ شیراز پر تیمور کے حملے کے بعد
 خواجہ حافظ ایک دو سال ہی زندہ رہے۔ لیکن اس میں کچھ شک نہیں
 کہ خواجہ حافظ کا مرشد ضرور کئی صاحب کمال بزرگ تھا۔ مگر حافظ نے
 اس کا نام اپنے کلام میں نہیں لیا۔ خواجہ حافظ خود کہتے ہیں کہ
 قطعاً میں مرحلہ بے ہمہری ہنرمیں غلامت است تبرس ادا گراہی

کہتے ہیں کہ "اب چشم اب حیواں دروں تاریکت" (دستی) اگر مجھ راہ
 سلوک میں گراہی سے بچنے کا ایک ہی دید ہے کہ کسی خضر وقت
 پیر طریقت کی متابعت کرے۔

ہوئے عشق منبے دلیل راہ قدم کہ من بخولیں نمود مصداہ تمام دلشد

عشق کے کوپہ میں بغیر رہتا کے پاؤں نہ رکھ کہ میں نے اس کے
 بغیر سو جتن کیے مگر کام نہ بنا۔

یا ہنر خود کہ مقصد گم کنی یا منہ پا اندیں نہ بے دلیل

یا تو پہلے ہی سمجھ لے کہ تیرا مقصد حاصل نہ ہو گا یا اس راہ سلوک
 میں بغیر پیشوا قدم نہ رکھ۔

شبان علی امین گے رسد مراد کہ چند سال بجان خدمت شعیب کند

عادی امین کا چر داہا یعنی حضرت موسے جو اپنے خسر کی بھیڑ بکریاں
 دس سال عادی امین چراتے رہے، آپ کو اس وقت مراد ملی
 جب اتنے سال دل و جان سے شعیب کی خدمت کی،

گرد و سرت ہمارے حال است حافظا یا بکہ خاک ہنگاہ اہل بضر شوی

اگر تیرے سر میں دھال کی خواہش ہے تو اسے حافظ مناسب ہی ہے کہ اہل بصر و بصیرت کی درگاہ کی خاک بن

عارفِ باری فرماتے ہیں کہ

قال لا یکنارو مردو حال شو پیش مردو گامے پامال شو

غرض خود حافظ معترف ہے کہ مرشد کے بغیر یہ پرخطر راستہ طے نہیں ہو سکتا لہذا تاکید ایزدی مقدم ہے۔

مہم سخت است مگر یاد شود لطف خدا ہذا آئم نبرہ صرہ ز شیطان رحیم

زیب نفس کی کچھ انتہا ہی نہیں اللہ کا فضل شامل حال ہو لہذا اسی کا لطف و کرم۔ یاد رہے کہ شیطان راہِ درگاہ سے پناہ مل سکتی ہے اس لیے اس میں کچھ شک نہیں کہ خواجہ کا بھی کوئی مرشد ضرور تھا۔ معاصرین ادیان اللہ کا ہم مختصر حال لکھتے ہیں۔

خواجہ حافظ نے ایک قطعہ میں جو ہم نقل کر چکے ہیں پانچ اشخاص کا ذکر کیا ہے

شیخ امین الدین محمد

جن کے وجود سے فارس آباد تھا ان میں سے ایک شیخ امین الدین محمد بن علی بن مسعود ہے جس کو حافظ بقیہ ابدال کہتے ہیں۔ کارہائے بستہ اس کی زمین بہت سے کھلتے رہے۔ اگر بہت سے مراد وہی اصطلاح صوفیہ ہے جس کا مفہوم خواجہ اکثر اشعار میں واضح کرتے ہیں تو ممکن ہے کہ یہی خواجہ کا مرشد بھی ہو۔ شیخ کا مولد تازمان ہے، اپنے عم بزرگوار شیخ عبداللہ بلیانی سے فرقہ و خلافت پائی۔ خواجہ کو ماں اس کی مدح میں کہنا ہے کہ

ابن ملت میں شیخ اعظم مہر برج حقیقت کبف عالم

الای پیک و بخوران مشہور کہ چوں موسیٰ تہمت طایر طور

گرت برکانہاں افتد گزارے بکن بہرمن و نحتہ کارے

بہیں در ملک وحدت تاجدارک ہمیدان حقیقت شہسوارے

زبرج بوعلی و تاق مابے ونا قلم ابوا سحاق شاسبے

شیخ کی وفات کارزان میں ۱۲۵۰ھ میں واقع ہوئی۔ اور خانقاہ میں جو

آپ ہی سے منسوب ہے وہی ہوئے۔ آپ کی ایک ربانی مشہور ہے

ایدل پس زنجیر چو دیوانہ نہیں و دعا من حد و خویش مراد لیں

نہا مشنک ہمیدہ خود را پے کن معشوق چو غافلگی است مدقاز لیں

سید کے حالات مفصل معلوم نہیں، اتنا

معلوم ہے کہ شیراز میں رہائش تھی اور

خواجہ حافظ آپ کی خدمت میں اکثر آتے رہے، چنانچہ ایک غزل

کا مطلع ہے۔

سوزیل حکایت با صبا کرد کہ عشق روئے گل با ما پہا کرد

صبح بل صبا سے یہ کہہ رہی تھی کہ دیکھا گل کے عشق نے میرے ساتھ

کیا کچھ کیا۔

اس غزل کے اشار ہیں۔

گر اد سلطان طمع کردم جفا بود و باز دلبر وفا جستم جفا کرد

اگر سلطان سے کچھ طمع انعام و اکرام کی خاطر کی تو جفا تھی اور دلبر سے وفا

کی طلب کی تو جفا کی ہے

وفا از خواجگان شہر یامن کمال دولت و دین یو الوفا کرد

اگر کسی نے خواجگان شہر میں سے مجھ سے وفا کی تو کمال الدین یو الوفا کرنے کی۔

اپ کی کنیت ابو بکر ہے، مولانا جامی
شیخ زین الدین تاجیادی نعمات میں آپ مکر لویا اللہ میں
 کرتے ہیں آپ کی ملاقات خواجہ بزرگ خواجہ بہاؤ الدین نقشبند سے اس
 طرح ہوئی کہ خواجہ سفر جج کے دوران میں آپ سے ملے۔ مولانا نے کہا کہ
 میرے لیے نقش باندھو فرمایا کہ میں تو آپ کی خدمت میں اس لیے آیا
 کہ نقش لے کر جاؤں۔ مولانا خواجہ کو اپنے گھر پر لائے اور دو تین روز جہان
 رکھا، تو ذک تیموری میں بھی تیمور نے آپ کا ذکر کیا ہے، آپ کی امد خواجہ حافظ
 کی وفات ایک ہی سال ۱۹۳۶ء میں ہوئی۔

شاہ صاحب کی ولادت ۱۳۳۶ء قصبہ کوہ بنان قلعہ
شاہ نعمت اللہ کرمان میں واقع ہوئی۔ آپ نے اصول فقہ حنفی عند الدین
 سے سیکھے، قاضی خواجہ حافظ کا مدرسہ ہے۔ بعد ان پانچ اشخاص میں
 سے ایک ہے جس کا مکر ہم قطعہ میں کرچکے ہیں۔ کئی بار حج بیت اللہ
 امد زیارت مدینہ منورہ سے مشرف ہوئے۔ خرقہ شیخ عبداللہ یافعی
 عارف عصر سے ملا۔ شاہ صاحب خود کہتے ہیں۔

شیخ مابود در حرم محرم قطب وقت دیگانہ عالم
 نعمت اللہ مرید حضرت اوست شیخ عبداللہ است اعفانہم
 خواجہ حافظ اور شاہ نعمت اللہ کے اشار میں لوک بھونک پالی جاتی ہے۔
 معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ حافظ شاہ صاحب کے اشار کی تردید کر سہیں
 شاہ صاحب کے اشار میں پالی جاتی ہے۔
 شاہ صاحب کا ارشاد ہے کہ

ہاٹاک راہ لا بنظر کیمیا کتم صد درد را بگو شد چشمتے دعا کتم

خواجہ از راہ انکار فرماتے ہیں

اُنانکہ خاک را بنظر کیما کنند
ایا بود کہ گوشہ چہے با کنند

لہذا اس کے بعد تعریف کرتے ہیں کہ

مدم نفیقتہ بہ زطبیاں مدعی
بشد کہ از خزانہ نمیش دعا کنند
شاہ صاحب فرماتے ہیں

ما را نفس چو از دم عشق است لاجرم
خواجہ حافظ کا جواب ہے

بے معرفت مہاش کہ در من بزید عشق
اہل منظر معاطہ با اشا کنند

شاہ صاحب کا ارشاد ہے کہ

در صلب صورتیم و چنیں شاد و خیم
بنگر کہ در سہرا پڑ معنی چہا کنیم
خواجہ صاحب فرماتے ہیں کہ

طلے عدوں پردہ بے فتنہ می رود
تا اں زماں کہ پردہ برافتہ چہا کنند
شاہ صاحب کا دہلی ہے

دناں لا ابالی دماں سر خوشیم
بیشار را بہ مجلس خود کے رہا کنیم
خواجہ حافظ فرماتے ہیں

پوں حسن عاقبت نہ برندی فدا حدیث
اں بہ کہ کار خود بے یث رہا کنیم

خواجہ حافظ کے اکثر اشار میں صوفیوں کے دلق بلع اور ریا کاری
کا مذکور ہے، روئے سخن ایسے ہی صوفیوں کی طرف ہے۔ شاہ صاحب
نے ایک قطعہ خواجہ حافظ کے طعن میں کہا ہے۔

گر معنی تنزیل بدانہ حافظ
تمتزل بعشق دل بخواند حافظ

او کہ نعل ما ترقی کردیم
تحقیق کجا چنیں بدانہ حافظ

شعر و شاعری کے میدان میں شاہ صاحب خواجہ حافظ کا کیا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اہل نظر دیکھ سکتے ہیں کہ خواجہ حافظ شاہ صاحب کے بلند آہنگ صلائی کا جواب وہی کچھ دیتے ہیں جو ایک موجد سے توقع ہے، ماراچہ گونہ زید میں دعویٰ خدائی،

خواجہ حافظ کے ہم عصر اولیاء اللہ بھی تھے مگر خواجہ کی نہ تو ان سے ملاقات ہوئی اور نہ آپ کے کلام میں ان کا کچھ مذکور ہے،

خواجہ حافظ کا علم و فضل ایک عالم ہے جب تک اس کو اپنے

جیل کا شعور ہے، جب یہ سمجھتا ہے کہ میں عالم ہوں تو جاہل بن جاتا ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ علم ظم جیل کا ہم ہے۔ جہاں تک ہمیں اپنے جیل کا علم ہو گا اسی حد تک ہم عالم ہیں، حقیقت تو پہلے ہی موجود ہے کچھ ہماری اختراع نہیں جو بات ہم نہیں جانتے اس کا جانا علم ہے، خواجہ حافظ اس بات سے خوب واقف تھے، آپ نے اس کا اظہار اپنے کلام میں لطیف پیرایہ میں کیا ہے اور اس حد تک کیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا مذہب "جمیریہ" ہے۔ فرماتے ہیں کہ

ما فضل و علم بینی بے معرفت نشینی یک نکتہ ہم بگویم خود را بہرین کہ معنی

جب تک تجھے اپنے علم و فضل پر فخر و تازہ ہے سمجھ لے کہ معرفت حقیقت سے تو بالکل جاہل ہے۔ ایک نکتہ میں تجھے بتانا ہوں وہ یہ کہ خود بینی ترک کر بس تیری نجات ہو جائے گی۔

خود بینی و خود لائی عند مذہب ندان نیست کفر است مدین مذہب خود بینی و خود لائی

لذوں کے مذہب میں خود بینی اور خود راہی نہیں ہے بلکہ ان کے
 مذہب میں دونوں کفر ہیں، قرآن مجید کی آیات سے واضح ہوتا ہے
 کہ اللہ تعالیٰ ہر ایک اور اپنی طرف منسوب فرماتا ہے، خیر و خوبی تو
 سب اس کی طرف سے ہے۔ لیکن کثر لود فتنہ و فساد سب ہماری
 نفسانیت ہے، اس کا امکان بھی اسی کا پیدا کردہ ہے۔ انسان
 تصرف کسب کرتا ہے، یہ اس کا اختیار ہے کہ خیر و خوبی کسب
 کرے یا بدی، وہ دینہ السبع، ماشا کتل و ما کفورا، خواہ حافظ کہتے ہیں
 تو مگر لب بوی بہوس بلشی

وہ نہ ہر فتنہ کہ بینی ہمارا خود بینی

خواجہ حافظ کو علوم مستدادہ پر کامل عبور تھا۔ مراتب علوم و حکمت
 شمس الدین عبداللہ شیرازی اور علامہ میر سید شریف جرجانی اور
 قاضی عضد الدین سے سیکھے، خود کہتے ہیں کہ چالیس سال تحصیل علوم
 میں بسر کئے۔

علم و فضل کے پہلے سال علم جمع آورد

ترجمہ آں زگس متارہ بیک جا ببرد
 یہ علم و فضل جو میں نے چالیس سال کے عرصہ میں جمع کیے، ڈر ہے کہ
 محبوب حقیقی کی ایک نگاہ سب ایک دفع ہی پھین کر لے جائے گی۔
 حفظ قرآن باچارہ رعایت کیا۔

ندیدم خوشتر از شعر تو حافظ

بقرآن کہ اندر سینہ داری
 قرآن کی قسم جو تیرے سینہ میں محفوظ ہے تیرے اشارے سے خوشتر
 شے میں نے کوئی نہیں دیکھی۔

عشق سد بفرادگر خود سہا حافظ

قلآن زبر بخوانی باچارہ رعایت
 میرا عشق ہی تیرا کار ساز ہے، خواجہ حافظ کی طرح تو قرآن از بر چارہ

لغات کے ساتھ تلاوت کرتا رہے۔
 چاروں لغات سے مراد وہ قرآن کے سات فارسی ہیں جن کی قراءت
 مستند مانی گئی ہے، ان کے دودھ راوی تھے اور ان کا مجموعہ پہا ہے
 ان کے نام حسب ذیل ہیں:-

ہم قاری	راویاں اول	راویاں دوم
۱- تاج بن عبدالرحمن مہدی	قانون	درس
۲- ابن کثیر کی	بزی	قبیل
۳- ابو عمرو بن الطلاہ مصری	دوری	موسیٰ
۴- ابن عامر شامی	ابن زکوان	صنم
۵- علم کونی	ابوبکر	حضر
۶- حمزہ کونی	خلف بخزادی	خلاد کونی
۷- کسر کونی	دوبلی (نامبروہ)	ابوالحارث بخزادی

خواجہ حافظ کو تفسیر قرآن بالخصوص کثرت، زرخیزی کا بھی علم تھا
 اور اس پر انہوں نے حاشیہ آٹالی بھی کی تھی فرماتے ہیں یہ
 بخوار دفتر اشار و لہا مہرا گیر پر وقت مدرسہ بحث کشف کثات

زحافظان جہاں کس پر بندہ جمع نہ کرو لطائف علمی یا نکات قرآنی
 نکات قرآنی کے ساتھ اپنے تفسیر سے لطائف علمی جمع کرنا کسی فاضل اہل
 ہی کا کام ہے، منطق و فلسفہ میں بھی دستگاہ تھی۔ اس علم کی اصطلاحات
 آپ کے کلام میں عام ہیں۔
 ساقیاد گوشہ غزل تا بچند
 تعدہ ہوں با محفل افندہ تسلسل بامیش

بعد از تیم نبود شائبہ در جوہر فرد" کہ وہاں تو بدیں نکتہ خوش استلالی

بیا کہ تو بر ز لعل نگار و خندہ جام "تصور لیت، کہ عکس نمی کہ تصور

توئی کہ صورت، جسم ترا ہیولی، نیست پو جوہر، مکی در لباس انسانی

ز اتحاد، ہیولی، و اختلاف، صور، خرد زہر گل و بر نقش صد نشان گیر

آرکان، پر عدد پو تو گوہر، یخ قرن گردوں بنا در پو تو اختر بصد قرن

جمال و خیر از نور چشم، ناست مگر کہ در نقاب، زیبائی، پر پردہ عنی است
 "عنب، انگور کو کہتے ہیں اور فارسی میں، نذہ ای کا شیرہ شراب
 ہے جو ساغر بلور میں اور انگور کے پردہ میں ہوتا ہے۔ حکماء کے
 نزدیک آنکھ میں تین رطوبتیں اور سات طبقے ہیں۔ رطوبت ایک زجاجی
 اور طبقہ ایک "عنی" ہے، شعر کا مطلب یہ ہے کہ شراب پہلے
 عنب پھر شیشہ کے پردہ میں آتی ہے پھر کہیں آنکھوں کو نور بصر
 بصیرت عطا کرتی، اشارہ "سورہ نور" کی طرف ہے۔

وی گفت طبیب از مرحدت پو مرادید حیات کہ عدد و قانون شمارت

و قانون، اور شفا ابوالیسیا کی مشہور تصانیف علم طب میں ہیں۔

خواجہ حافظ کی زبان فارسی تو مادی تھی۔ لیکن اگر متقدم میں اور ماخرین
 کے کلام سے معاذتہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ آپ الفاظ کی ترکیب میں

کس حد تک جدت سے کلام یا بے لود زبان میں کہاں تک لطافت پیدا کی ہے۔ عربی پر بھی قدرت تھی۔ اس کو آپ ہنر سے موسوم کرتے ہیں۔

اگرچہ عربی ہنر بیحد باری ادبی است زبان خموش و لیکن وہاں پر عربی است اشار میں آپ بے تکلف عربی کے الفاظ اس خوبی سے باندھتے ہیں کہ غیر مانوس معلوم نہیں ہوتے۔ عربی شعر اور مصرع سنی وغیرہ کی طرح استعمال کرتے ہیں۔

خواجہ حافظ علم ہیئت اور موسیقی سے بھی واقف تھے۔ چنانچہ ان علوم کی اصطلاحات آپ اپنے کلام میں استعمال کرتے ہیں۔
ناخترام نظر سعد در بہت کہ دوش میا پی ماہ و نس یا در من مقابلہ بود

باہماں نظر شیر آفتابہ بگیر باہر وان دو تا قوس سہ ششی بلکن

آفتاب گرفت، محاورہ میں سورج گرہن کو کہتے ہیں، بظاہر معنی یہ ہیں کہ گرہن سے شکار کا شکار کر مگر کسوف و خسوف کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے۔

ایں مطرب ادب کجاست کہ ساز عراق کو دآہنگ ہار گشت، بلکہ حجاز کو عراق، اندھ حجاز، دو راگینوں کے ہم ہیں۔ ساز لور آہنگ، لور بازنت (دپٹا) بھی موسیقی کی اصطلاحات ہیں۔

شطرنج اور لور بانلی کا مذکور بھی آپ کے کلام میں ہے۔

ایں بعد نرد، حسن و خوباں معذگار تہت برسی جو سہی مرد جو
منصبہ ہوائے تو حافظ کنول تو یافتہ کوشش خدمت دلش افتاد مہر و مار

لسان العیب

لسان العیب خواجہ حافظ بلاشک و شبہ ہیں۔

مذکوروں میں تقاضا کے قصہ تو مشہور و معروف ہیں مجھ سے ثقہ لوگوں نے اپنی واردات بیان کی۔ خود میں نے بھی تجربہ کیا۔ لہذا خواجہ کو لسان العیب پایا، ۱۹۱۲ء میں نے دیوان حافظ کا ترجمہ اور مختصر شرح لکھی جو ۱۹۱۶ء میں سالیح ہوئی۔ ترجمہ اور شرح قلم برداشتہ لکھی تھی اس لیے اس میں خامیاں لہذا غلطیاں بھی بہت تھیں۔ مگر نصیح دوسری ایڈیشن میں کی گئی۔ خواجہ کے سوانح حیات کا مجھے علم نہ تھا۔ مگر ان میں بھی کوئی مطلب کی بات نہ ملی۔ میں نے خواجہ ہی سے حیات کیا تو اس مصرع نے مشکل حل کر دی کہ "اے کس کہ گفت قصہ ماہم زما شنید" میں نے آپ کے دیوان ہی سے آپ کے سوانح حیات اخذ کیے۔ سلاطین لہذا و ذرا وغیرہ کے حالات جن کا نام آپ کے کلام میں ہے تاریخوں میں مذکور ہیں، یہ کمی تو ارمیخ سے پوری ہو گئی۔ خواجہ کے اشار لہذا نصائح شیخ سعدی کی طرح ضرب المثل ہو گئے ہیں چونکہ ہم نے ان کا حوالہ ترجمہ و شرح میں دیا ہے اس لیے اعادہ کی ضرورت کہیں نہیں۔ معنیہ شہنشاہ جلال الدین اکبری نسبت یہ عام غلط فہمی ہے کہ پڑھا لکھا نہ جانتا تھا۔ بمعصم مورخ بدیع اللہ اور مزک جہانگیری سے اس کی تائید نہیں ہوتی، علم حدیث اس نے شیخ عبدالمصنف الصدوق سے سیکھا۔ دیوان حافظ سید عبداللطیف قزوینی سے پڑھا۔ یعنی اس کے مطالب لہذا و قائل کا حل سید سے معلوم کیا۔ چونکہ اس کے ہزار میں منتب روزگار عالی پایہ کے ادیب لہذا ساعر ابوالفضل اور فیمنی وغیرہ تھے اس لیے ان کے سامنے اپنے علم و فضل کا دعویٰ محض

لات نئی تھی۔ علاوہ انہیں جو کام فنی متصدی وغیرہ کر سکتے تھے وہ خود
 کیوں کرتا۔ اس کے عقائد کے بارے میں علامہ عسکری نے بہت کچھ شور مچایا بدایونی
 میں مذمت کرتا ہے لیکن ان ملاحوں کو معلوم نہ تھا کہ اکبر نے کیا سیاسی ڈیوننگ
 کھڑا کیا ہوا ہے اور کس حد تک وہ کامیاب ہوا۔ علامہ دین کے دین دایا
 اور بلند آہنگ دعاوی کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ ایک مجلس خاص
 میں لہرا ووزرا لہ قاضی ممالک ہند موجود تھے۔ اکبر ساغر نے تاج پیش
 کر دیا تھا۔ قاضی صاحب کی باری اُلی تو بے تکلف پی گئے۔ اکبر نے مکرانے
 ہوئے کہا۔

در عہد بادشاہ خطاب بخش جرم پوش حافظ قرابہ کش شد قاضی پایہ لوش
 یہ واقعہ بدایونی نے لکھا ہے۔ کیا بر محل خواجہ حافظ کا شعر چسپاں کیا۔
 خود نغز گو شعرا ہر ایک نمانہ میں اپنی مشکلات کا حل خواجہ سے ہیانت
 کرتے اور خواجہ ہی کے ناخن نگر سے ان کا عقدہ حل ہوتا۔ احمد لاغر
 اچھا شاعر گذرا ہے۔ سپانہ میں شاہ کی محفل سے رنجیدہ خاطر
 ہو کر نکلا۔ ایک قطعہ شاہ کی خدمت میں ارسال کیا۔

شہنشاہ بکرم عند بندہ لا پذیر ز صحبت دوم لازمے اگر کارہ کم
 زیادہ منخ تو نتوانم و نگویم نیت کہ مے خورد حریفان و من نظارہ کم
 مولانا لسانی کا ایک شاعر شریف و نامی ہے۔ مولف متذکرہ
 آتشکدہ آذنی و مراتب شاعری میں شاگرد کا پایہ استاد سے بلند تر لگتا
 ہے۔ اس نے شاہ نعمت اللہ بڑھلی کی مدح میں قصیدہ لکھا مگر صلہ
 خاطر خواہ نہ ملا۔ ایک قطعہ لکھ کر ارسال کیا۔

نعت اللہ اختر مدح استاد شہ یزدانکہ چرخش سمرنی ہمیدظن

محل بہ تبریز آمد اباب من گشتہ اور بر مراد خویش قاصد جز شریف نامراد
 باوجود اس کے کہ گفتم صبح روشنی از ہمہ از ہمہ کمتر در العام بر روٹم کشاد
 گرچہ محتاجم لیکن بیش انانم بہت است کہ عطا ثانی کم کرد و دل نمیدہ شاد
 کشتہ ہم ندوے تا جو حافظ گفتم ہ شاہ یزعم دیدم خوش گفتم و ہم ندو
 خواجہ کے ایک مصرع کی تاثیر دیکھئے کہ العام توقع سے زیادہ ملا
 خواجہ امیر بیگ شیخ غیاث الدین تبریزی کی تسلسل سے شعرا تبریز
 میں ممتاز رہتے کا شاعر ہے، شاہ طہاسب صفی کے عہد میں خدمت
 طرابلسی پر سرفراز تھا۔ کچھ عرصہ بعد شاہ کی نظروں سے گر گیا۔ اور
 خراساں میں مقید ہوا۔ عبداللہ خان روز بک اس کی جگہ مسند خانی
 پر متمکن ہوا تو یہ شعر خواجہ کے پاس لکھ کر بھیجا۔

ای خواجہ بعد ازین طبع از زندگی بر
 ناں رو کہ گشتہ مسند خانی بنام ما

خواجہ امیر کے جواب میں لکھا ہے کہ
 سے یاد اگر بابل خراساں گند کنی
 دانگہ بگو ذراہ وفا آن گروہ دا
 کلک غرہ جہل شامبت کردہ بود
 لکے خواجہ بعد ازین طبع از زندگی ہر
 ای علی مگر نشینی کہ می رسد
 باشد جواب دعوی خانی کہ کردہ
 چنانک بود کہ شہ و ناتر ہی عدال
 ما بندگانم حضرت شاہ ملا یتیم
 ذہنہا عرضہ ہر ایساں ہم ماہ
 لکے گشتہ کینہ خواہ شامافس و عام
 حد رقم کہ بود و لاں رقم نام ما
 تان رو کہ گشتہ مسند خانی بنام ما
 شاہ سارہ خیل و سپہر اختتام ما
 بیتے کہ گفتم حافظ شریں کلام ما
 کاید بکلہ مہر دستور خرام ما
 ثبت است بر جریہ عالم علم ما

مولانا لسانی کے شاگردوں میں سے سیدی بھی ہے۔ عمر کا اکثر حصہ
ایران و ہندوستان کی سیاحت اور امر و سلاطین کی مدد میں بسر کیا
ایک دفعہ شاہ ہند کی مدد میں قصیدہ لکھا۔ لیکن مدد خاطر خواہ نہ ملا
ایک قطعہ لکھ کر پیش کیا۔

مدد مرچ پاؤ شاہ سخن سنج ملک ہند
نناناں قصیدہ کہ بگاہ نوشنش
ماچو ہند گار مددگار من نہ بود
لشیدہ شاہ عقدہ کا مصرعے زمن
مردم نہ آب ویدہ خود غرق بحر سخاں
کہ غیب اس ترانہ بگوش ولم رسید

و حافظ وظیفہ تو دعا گفتن است و بس
در بند اں مباش کہ نشید یا شنید

صلہ کے ساتھ خلعت بھی ملا

خواجہ حافظ کا مذہب
خواجہ حافظ کے مذہب پر اہل مذاہب
نے طویل اور بے معنی بحث کی ہے

گرفتاروں ابو بکر و علی اس کو سنی اور شیعہ کہتے ہیں۔ آپ کا ارشاد
ہے کہ سے قد املا و اتفق کا سار و دع ما فیہ ہمتا۔ رواہ ابن ابی عمیر عن ابن مسعود

جنگ ہند اور ملت ہمہ را عند بنہ ہل امید حقیقت رہ افانہ زند

خواجہ حافظ کے کلام سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ اہل سنت والجماعت
میں سے تھے، بھائی کی وفات پر قطعہ لکھا۔

برادر خواجہ طالب طباطب شاہ ہم سنت و بعد از ماتش
بسوئے بوضوہ رضاں دعاں شد پس از پنجاہ و نہ سال از عیاش

خلیل عادلش ہویستہ برہنوں دنا نجا ہم کن سال و ما کش ۵۵۵
 خواجہ کے تمام ممدوح سلاطین اور امرا وہ ترا سنی ہی تھے۔ بات اصل
 میں یہ ہے کہ شیعہ حضرات نے جو غلو اپنے مذہب میں پیدا کر
 رکھا ہے خواجہ حافظ کے زمانہ میں نہ تھا۔ سنی لاد شیعہ ان دنوں
 میں شہر و شکر تھے۔ بنو ماطہ سے عقیدت عدلوں رکھتے تھے۔
 لیکن یہی بھگڑوں نے جب خلافت کے اسحاق پر بحث کا
 مدوانہ کھول دیا تو صحابہ کیا لود بھی سب رستم کی تو ہیں اگئے۔ جب
 صفی خاندان ایران پر مسلط ہو گیا لود سنیوں کا قتل عام ہوا اور تبرا
 لود دیگر امور منطقہ کا علائقہ راج ہوا تو کوشش یہ بھی کی گئی کہ تمام
 اکابر کو کسی نہ کسی طرح شیعہ ثابت کیا جائے۔ خواجہ نے ایک غزل
 کہی ہے جس کا مطلع ہے۔

ی علی علم شاہ جہاں باش و شاہ باش پیوستہ حمایت لطف الہ باش

از غزل کے بین اشعار حسب ذیل ہیں

اں ما کہ ہستی علی عیست کافر است گونا گونا گونا و گور شیخ ما باش

بہر ذمہ ہم لولائی تو یا علی فرہام مع پاک اماں گواہ باش

قراہم ہشتم سلطان دین رضا از جاں ہوس و برداں یا نگاہ باش

میں نے ترجمہ اور شرح کی ادل ایڈیشن میں یہ غزل لکھ کر اتنا کہہ دیا کہ
 یہ غزل خواجہ حافظ کا کلام نہیں۔ لود نہ خواجہ حافظ کی زبان کی روح شناسی اور
 اسلوب بیان اس میں پایا جاتا ہے۔ سخن فہم تو بسہولت سمجھ سکتے ہیں
 کہ میں نے صریح لکھا ہے۔ لیکن عام کے لیے سمجھنا مشکل ہے، اس لیے
 ایک بھرے مجمع میں ایک شاعر خوش بیاں سید مرثیہ گو نے میرے

منہ پر کہا کہ آپ نے ہم لوگوں پر بڑا ظلم کیا کہ کہتے ہیں کہ یہ غزل خواجہ
 کی نہیں ہیں۔ کیا کہ آپ کو تو معلوم ہے کہ میں فرقہ لاد تفرقہ سے
 بالا ہوں، آپ سخن فہم ہی نہیں سخن گو بھی ہیں اگر آپ جیسے اتنا کہہ
 دیں کہ یہ غزل خواجہ کی ہے تو میں دوسرے ایڈیشن میں آپ کا حالہ
 دے کر معذرت بھی کروں گا۔ سید صاحب شاعر تھے اتنا سن کر خاموش
 ہو گئے۔ مشکل یہ تھی جو سخن فہم نہیں لاد اعلیٰ دادنی پایہ کے شعرا کے کلام
 میں امتیاز نہیں کر سکتے انہیں کس طرح یقین دلایا جائے۔ دوسرے
 ایڈیشن کے لیے پرانے نسخوں کی تلاش ہوئی اور مجھے چند قلمی نسخے
 مل گئے۔ ان میں سے شہنشاہ اکبر کے کتب خانہ کا نسخہ تھا۔ اس
 پر فیضی لاد ابو فضل کی مہریں بھی ثبت تھیں۔ لاد غالباً یہ وہی نسخہ ہے
 جو اکبر نے سید عبداللطیف قزوینی کے سامنے پڑھا۔ یہ نسخہ خاندان
 فاد کے ایک ممتاز رکن اہم حیات خاں ڈسٹرکٹ جج کے پاس تھا۔ آپ
 کے والد محمد حیات خاں کو غدر مہلی کے ایام میں غالباً کتب خانہ شاہی سے
 ملا تھا۔ غرض کسی نسخے میں یہ غزل موجود نہیں۔ خوش قسمتی سے ان دنوں
 میرے ہاتھ کتب خانہ حافظ شریں، ائی۔ یہ محمد سعید ایرانی کی تالیف ہے
 لاد ۱۳۱۹ء میں بنگا بالاد گانی پر دیں۔ تہران نے نشر کی وہ لکھا ہے کہ
 میں غزل ہ نسخہ قدیم عیسے دعاری ازمانت دیگر غزلیات خواجہ است

ایک لاد غزل کا مطلع ہے

یوسف گم شد باز آید بگمان غم غم
 کہہ اہراں شود بعدے گلستان غم غم

اس کا ایک شعر ہے کہ

شمع جمع آفرینش شاہ موہان است لیس
 گرتی از جہاں غلام شاہ مرغان غم غم

محمد معین لکھا کہ "غزل از حافظ است و لے بیت مسطور از مضامین است
 ہدیچ لفظ قدیمی ثبت نشہ"

یہ غزل جس کا مطلع ہے اسی دل غلام شاہ جیاں باش و شاہ باش
 الخ خاتمان صفویہ کے عہد میں خواجہ کے لوح مراد پر کندہ کی گئی۔ اور
 غالباً اپنی ایام میں خواجہ سے منسوب بھی کی گئی۔
 یزید کا شعر ہے

انا المصروع عندی بترباتی دلالاتی اور کاساؤ فارلھا الایا الیا الساتی

اس شعر کا دوسرا مصرع خواجہ حافظ کے دیوان کی پہلی غزل کا پہلا
 مصرع ہے۔ یعنی دیوان کا آغاز اسی شعر سے ہوتا ہے اسی مضمون کو
 شیخ سعدی ایک شعر میں اس طرح ادا کرتا ہے

ترا ملا واستقی کاساؤدع مانیہ صبراً وصانت الذی سعی مغین السمر ترباتی
 ایک شیعی شاعر نے لکھا ہے کہ

خواجہ حافظ را شبے ویم بوزاب
 گفتش ای عقل و دانش بے مثال

میں نے خواجہ حافظ کو ایک رات
 خواب میں دیکھا میں نے اسے کہا
 کہ تو عقل و دانش میں بے مثال ہے
 تو نے یزید کے شعر کو اپنی ترکیبوں
 منسوب کی ہے باوجود اس امر کے

تو صاحب فضل و کمال ہے

جواب دیا کہا تو اس مسئلہ سے

واقف نہیں کہ کافر کا مال مومن پر حلال ہے۔

از پیر بر خود نشینی شعر یزید
 کا وجود این ہمہ فضل و کمال

گفت واقف نیستی زین مسئلہ
 مال کافریت بر مومن حلال

جواب لا جواب ہے مگر مجھے یہ تحقیق نہیں تھا کہ مال کافر مومن

پر حلال ہے۔ سہمی فرماتے ہیں سے
 شہیدیم کہ مرغان را خدا
 دل دشمنان ہم نکر دند تنگ
 کرا کے میسر شود این مقام
 کہ دو تانت خلافت است و جنگ
 عادت روی کا ارشاد ہے سے
 کے شود آمد دولت حق منحل
 ای گرفتار ابو بکر و علی
 تیرے دل میں نور حق کب جلوہ افروز ہو سکتا جبکہ تو ابو بکر و علی کی شخصیت
 میں الہما ہوا ہے۔

۲۶۸

امام ابو حامد محمد بن محمد بن محمد

احمد غفر له

پیش لفظ

مشاہیر عالم کی شہرت کے اسباب کا جب تک علم نہ ہو یا سمجھنا مشکل ہے کہ اپنے ہمعصر اشخاص بالخصوص علماء و حکما میں ان کو کیا امتیاز حاصل تھا کہ ان کا نام آج بھی زندہ ہے۔ یہ آخر بشر ہی تھے اور بشر اور دیگر حیوانات میں یہ بات ایک جیسی ہے کہ پیدا ہوتے، پرورش پاتے، سوتے جاگتے، مٹاؤں معاش کے لیے کچھ نہ کچھ کام یا محنت کرتے ہیں اور آخر مر کر خاک میں مل جاتے ہیں، عالم انسانی میں بھی یہ قدر مشترک ہے کچھ ایسی بات ضرور ہونی چاہئے کہ مشاہیر اپنے زمانہ کی عام ذہنی سطح سے بلند مقام پر نظر آتے ہیں۔

ہم نے سلطان محمود غزنوی کے حالات کے شروع میں لکھا ہے کہ کسی انسان کا ذہنی درجہ خواہ کتنا ہی بلند ہو وہ اس ماحول کے اثر سے بے نیاز نہیں ہو سکتا جس میں اس کی پرورش و تعلیم و تربیت ہوتی ہے۔ امام محمد غزالی رحمہ اللہ کے بارہ میں دیکھنا یہ ہے کہ آپ کس ماحول میں تھے۔ اور آپ کے زمانہ کے حالات کا اثر آپ پر اور آپ کا اثر

پر کیا ہوا۔ جب یہ تاریخی اور اچھی طرح ذہن نشین ہو جائیں گے تو آپ کا مقام شاہیر عالم میں اچھی طرح واضح ہو جائے گا۔

اہم صاحب کا تذکرہ اکثر اہل قلم نے لکھا ہے۔ مولانا شبلی نعمانی نے "الغزالی" اردو میں اور جلال حمالی نے غزالی نامہ فارسی میں د کتاب خانہ تہران نے ابوریحان بیرونی کتاب الآثار الباقیہ عن القرون الخالیہ۔

لد کتاب تحقیق الہند ابن اثیر نے اپنی تاریخ کامل لد خواجہ نظام الملک طوسی نے "سیاست نامہ" میں لد صدر الدین ابوالحسن حسینی نے کتاب "انیا السولۃ السلیمیہ" اور ابن طکان نے "دنیات" میں غرض تمام مورخین مذکورہ لد دیگر تذکرہ نویسوں نے جو کچھ اہم صاحب کے بارے میں لکھا ہے اردو اور فارسی اور عربی میں ہمارے سامنے ہے۔ مولانا جلال حمالی نے یہ تمام مواد ایک جگہ اپنی کتاب غزالی نامہ میں جمع کر دیا ہے۔ ہمارے مقالہ کا مائد زیادہ تر یہی ہے مگر ہم نے دیگر کتب سے بھی کم و بیش استفادہ کیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہم نے اہم صاحب کی تصانیف سے بہت کچھ اخذ کیا ہے۔

ان اوقات میں ہم نے کسی ایک طبقہ کی ممتاز شخصیت کا انتخاب کیا ہے لد اس شخصیت کے عصر کے شاہیر حین کا تعلق دوسرے طبقات سے ہے ان کا بھی تذکرہ فرمنا کیا ہے، عموماً سلاطین لد وزراء و امراء ادبار و شعراء عطا و حکما کا تذکرہ ایک ہی شخصیت کے تذکرہ کے ضمن میں آگیا ہے، اسی طرح تاریخین کو ہر ایک کے عصر کے حالات کا علم مجلاً ہو سکتا ہے۔

امام محمد غزالی

حجۃ الاسلام امام زین الدین ابو حامد محمد بن محمد بن محمد بن احمد غزالی طوسی لور آپ کے بھائی احمد غزالی طوس کے شہرہ طایران کے ایک خاندان کے دو مشہور افراد تھے، امام غزالی ۳۹۵ھ / ۱۰۰۵ء طفول بیگ سلوئی کے آخر عہد میں طایراں میں پیدا ہوئے۔ باپ محمد بن محمد کا پیشہ یافتگی تھا۔ لور بالکل ہی تھا۔ لیکن دولتیں لور مستحق تھا۔ دوزی حلال سے اپنا لہذا ایں و عیال کا پیٹ پاتا تھا۔ ۴۶۵ھ میں فوت ہو گیا۔ محمد لہذا احمد دونوں بچوں کو اپنے ایک دوست ابو حامد احمد بن محمد نادکاتی کے سپرد کر گیا۔ دوست صوفی مشرب زاہد لور عابد فقیر لور گوشہ نشین آٹھا تھا۔ بچوں کی تعلیم و تربیت صحتی الوسع کی، باپ کے ترک لور اپنی دوزی حلال سے جب تک ہو سکا دریغ نہ کیا لکھا پڑھنا لہذا مسائل دینی لور مبادیات علوم ادبی و دینی سے جہاں تک خود واقف تھا تعلیم کیے۔ اس کے بعد مدرسہ میں داخل کرویا۔ ایک غرض یہ بھی تھی کہ تادار طلبا کو لوقات ملحقہ مدرسہ کی آمدنی سے وظائف ملتے تھے۔ دونوں بچوں کا گزارہ بھی اس صورت میں خاطر خواہ ہو

جلئے گا، غزالی کو اللہ تعالیٰ نے ذہن راسعطا فرمایا تھا۔ مستند
 اسناداں عصر کی خدمت میں تحصیل علم کے لیے جانا اور جو کچھ سبق ملتا
 لکھتا رہتا تھا۔ ام ابو نصر اسماعیل کی خدمت میں پہنچا، پھر اپنے وطن
 طوس میں آیا اور تین سال یہاں رہا جو کچھ پڑھا لکھا تھا وہرانا رہا۔
 خواجہ نظام الملک وزیر خاندان سلجوقیہ ام محمد غزالی سے روایت کرتے ہیں
 کہ جب میں جرجان سے طوس کی طرف جا رہا تھا۔ راستہ میں ڈاکہ پڑا
 میرا ایک قبیلہ میں کاغذات تھے جن پر میں استادوں سے سیکھیں ہوئی
 یادداشت لکھی رہتا تھا۔ چور پر بھی لے گئے میں ان کے پیچھے گیا۔ لہذا
 ان کے سردار کی منت خوشامد کی کہ کہا کہ میں طالب علم ہوں، یہ کاغذ
 تو تمہارے کسی کام کے نہیں مگر میری چند سالوں کی محنت کی کمانی ہے،
 مجھے واپس دے دو، سردار کو میرے حال پر ترس بھی آیا اور
 جس کے پاس قبیلہ تھا اس سے واپس دلا دیا لہذا مجھے کہا کہ یہ کیا
 علم و ہنر ہے جو تو سیکھ رہا ہے، علم و ہنر تو ایسی چیز ہے جو
 کئی پھین نہیں سکتا۔ تیرا مبلغ علم ان لوراں میں ہے چوروں نے
 چھین لیا لہذا کورا رہ گیا۔ ہم صاحب کہتے ہیں پیشوائے وزداں میرا
 پہلا پیشوا ہے، میں نے سوچا کہ پچ کہا ہے علم در جلد خویش باید
 نہ در حرم پیشوا۔ اس کے بعد جو کچھ میں سیکھا اذیر کرتا۔

طوس سے ہم صاحب پھر تحصیل علم کے لیے نیشاپور میں آئے
 جو اس وقت حاکم خراساں کا علمی مرکز تھا۔ نیشاپور میں مشہور و معروف
 استاد ہم الحرم ابوالمعالی جوینی تھے جن کا نظیر اس وقت
 خراساں میں نہ تھا۔ حلقہ درس و بیع تھا۔ غزالی بھی شامل ہو گیا۔

تھوڑے عرصہ میں اپنے ہمدرس طلباء میں ممتاز نظر آنے لگا۔ استاد بھی بھانپ گیا کہ یہ جوہر قابل ہے اس لیے غزالی کی طرف توجہ زیادہ سے زیادہ کی۔ بعض ہمدرس حد بھی کرتے گئے۔ غزالی کے ہمدرس اکثر علماء و فضلاء عصر شمار ہوتے ہیں، ان میں سے کیا ہی ہر اسٹی۔ لہذا ابوالنظر غزالی وغیرہ مشہور ہیں مگر جو مرتبہ غزالی کو حاصل ہوا وہ اسی کا حصہ تھا۔

غزالی کی عمر اس وقت اٹھائیس سال تھی، ادبیات و فقہ و اصول و حدیث و کلام و مناظرہ وغیرہ میں کامل دستگاہ بہم پہنچا چکا تھا۔ اور ہر ایک موضوع پر سلسلہ تالیف بھی نیشاپور میں شروع کر دیا۔ لیکن استاد کی خدمت میں ہمیشہ حاضر رہتا۔ ^{۲۸}۱۰۰۰ھ میں اہم الحرمین کا انتقال ہو گیا۔ استاد کی رحلت کے بعد اس کی ملاقات وزیر خواجہ نظام الملک طوسی سے ہوئی۔ نظام الملک کے گوش گزار غزالی کے علم و فضل بالخصوص فن مناظرہ کا شہرہ ہو چکا تھا۔ وزیر نیشاپور کے قدح میں دودھ کر رہا تھا غزالی کو طلب کیا۔ نظام الملک کی ملک ملازمت میں لور بھی علماء و فضلاء تھے، غزالی سے ان کا مناظرہ مختلف مسائل پر ہوا۔ غزالی نے سب کو نیچا دکھایا۔ خود علماء مجلس نے بھی غزالی کے علم و دانش کا اعتراف کیا۔ خواجہ نظام الملک کی توجہ بھی غزالی کی طرف بڑھتی زیادہ ہوئی گئی۔ یہاں تک کہ سلطان ملک شاہ سلجوقی ^{۳۸۰}۱۰۰۰ھ کا بھی تقرب حاصل ہو گیا۔ لور تمام علماء حکما سے غزالی کا مرتبہ برتر ہو گیا سات سال بعد مدرسہ نظامیہ کا اعلیٰ مدرس مقرر ہوا۔ اس وقت غزالی کی عمر پینتیس سال تھی۔ چار سال تک مدرسہ نظامیہ میں درس و تدریس

و دعوت و خطابت و مناظرہ اور تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رکھا۔
 اگر طلباء نے استفادہ کیا جو بعد میں علماء و فضلا مشہور ہوئے، اس
 عرصہ میں غزالی کے علم و حکمت کا شہرہ دور دور تک پہنچ چکا تھا اور
 طالب علم جذبہ ذوق و شوق میں مدرسہ نظامیہ کی طرف کھینچے چلے
 آتے تھے، اس عرصہ میں غزالی نے ایک کام یہ کیا کہ کتب فلسفہ کا مطالعہ
 بنظر غائر کیا۔ اور فلسفہ کے دلائل سے بخوبی واقف ہو گیا۔ اس وقت
 اس کی عمر انا لیس سال کے لگ بھگ تھی۔

سحرگاہ ہر دے در ہر زینے بھی گفت این محابا قرینے
 کہی صونی شراب انگہ بود عاف کہ در شیشہ نندار بلعینے
 چالیس کی زمگی میں غزالی ایک ذہنی انقلاب کی زد میں آ گیا۔ اور اس
 کی زمگی کا نیا باب کھلا۔ سب دنیوی عزت و احترام اس کی نظر میں
 بیہیج معلوم ہونے لگے اس لیے دنیا اور اس کی تمام ذہنیت
 سے منہ موڑ کر مالک الملک حقیقی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ بغداد سے نکلا،
 حج بیت اللہ کے بعد جامعہ دمشق میں مستکف ہو گیا۔ اسے تائید
 ایزدی اور جذبہ نبی سمجھتا چاہیے کہ علم و فضل و جاہ و عزت و احترام
 دنیوی سے کنارہ کش ہو کر مطالعہ قلب میں مشغول ہو گیا۔ مستکف اور
 فقیر صونی صافی بن گیا۔ شیخ سعدی نے تو ایک صاحب دل کا ذکر
 کیا ہے کہ خانقاہ چھوڑ کر مدرسہ میں آیا کسی نے پوچھا کہ ان دونوں
 میں کیا فرق ہے کہ تو نے ایک کو چھوڑ کر دوسرے فریق کو اختیار
 کیا ہے جواب دیا۔

ایں یک کلیم خویش بوں می بروز لوح ایں جیدی کند کہ بر آرد عزیز ما

خانقاہ کا گوشہ نہیں عابد تو اپنی ہی گودری کی خیر مانا ہے۔ لیکن
فقہ مدرسہ کو شش کرنا ہے کہ دوستے ہوئے لوگوں کو بچا کر کمانہ
بدلائے۔

لیکن غزالی مدرسہ پھوڑ کر خانقاہ میں آیا۔ اگر اس سے بھی
سوال ہوتا تو وہ بھی جواب دینا اور یہی کہتا کہ فقہ مدرسہ "ادخلتہن کم
است کرا رہبری کند"۔ اگر غزالی کو اطمینان قلب کا سامان مدرسہ میں ملتا
تو وہ خانقاہ کی طرف کیوں جاتا۔ حقیقت یہ ہے کہ خانقاہ کا گوشہ پہلے
اطمینان قلب حاصل کر چکا تھا اب یہ تقاضہ فطرت دوسروں کی رہنمائی کے
لیے مدرسہ میں آیا۔ غزالی کی مدرسہ میں یہ حالت تھی کہ
از قیل و قال مدرسہ حالے علم گرفت

غزالی بھی آخر خانقاہ پھوڑ کر پھر مدرسہ میں آئے۔ بغداد سے نکلے تو ایک
رفیق ابوالقاسم حاکمی، آپ کا ہم سفر تھا۔ ہم سفر ظاہری اور معنوی دونوں
حالات میں رہا۔

غزالی خود بیان کرتا ہے کہ جاہ و منال کا چھوڑنا میرے لیے سہل
تھا۔ لیکن ایک عمر جس علم و حکمت کی تحصیل میں صرفت کی اس کا ایک لذت
تک کرنا میرے لیے مشکل ترین امر تھا، یہ نہایت ہی فریب دینے والی
شے ہے اور اس سے مخلصی حاصل کرنے میں مجھے نہایت زحمت
اٹھانی پڑی، مفصل حالات ہم آگے چل کر بیان کریں گے۔

مراحل سلوک طے کرتے اور مقامات معنوی سے گذرنے کے بعد
اہم صاحب پھر نیشاپور آئے۔ نیشاپور میں بھی مدرسہ نظامیہ تھا، یہاں
دس تبدیلیں کا سلسلہ شروع کیا۔ لیکن اب خود علم صفتہ اللہ میں رنگین

ہو چکا تھا اور شاگرد بھی اسی رنگ کا اصطباغ لے رہے تھے۔ یہاں بیٹھ کر آپ نے سلاطین و امراء و ذرا وقت کو نامے لکھے، ان مکتوبات کو کسی بزرگ نے جمع کیا۔ لہذا کتابی صورت میں شائع کیا۔ اس کتاب کا ہم "فصائل الانام من رسائل حجتہ الاسلام" ہے، آگے چل کر ہم اس کا نمونہ بھی پیش کریں گے۔ ہم صاحب کو فارسی اور عربی پر کامل عبور حاصل تھا۔ عربی اس وقت دنیا اسلام میں رائج الوقت سکھاتا اور اکثر اہل علم خطابت اور تصنیف و تالیف عربی ہی میں کرتے۔ لہذا جو فارسی میں کچھ کہتے تو عربی الفاظ کثرت سے استعمال کرتے۔ ہم صاحب کی طرز تحریر فارسی سادہ اور سلیس ہے، عربی میں فصاحت اور بلاغت کی داد دی ہے۔

ہم صاحب کے استاد علوم مروجر میں تو بہت ہیں لیکن پیر طریقت حضرت ابوعلی فاروقی فضل بن محمد بن علی لود ابو بکر بن عبداللہ نقاش مشہور مثنیٰ صوفیہ ہیں۔ فارمد طوس میں واقع ہے۔ لود حضرت فاروقی دو واسطہ سے مرید شیخ ابوالحسن خرمانی رہتے تھے۔ آپ لود ابو بکر نصاح رح ہوں مثنیٰ صوفیہ خراساں میں ممتاز تھے، حضرت فاروقی کا انتقال ۷۸۷ھ میں ہوا۔ ابن طکان نے آپ کا تذکرہ لکھا ہے۔ اور مولانا جامی نے نجات الانس میں لود دیگر منکروں میں بھی آپ کا ذکر خیر کیا ہے۔ آپ جب کبھی خواجہ نظام الملک طوسی سے ملنے جاتے تو ہر وقت تعلیم کے بعد عزت و احترام سے بھاتا حالانکہ غزالی کے استاد امام الحرمین ام مشہور صوفی بزرگ ابوالقاسم قشیری بھی ملتے تو محض قیام پر اکتفا کرتا، کسی نے اسرا تیار کی وہ ہر دریافت کی تو کہا کہ ہر وہ بزرگوار مجھے

بجائت وزیر مالک ملتے ہیں مگر حضرت فاروقی محض خلق خدا کی بہبودی کے لیے ملتے ہیں، میرے عیوب بتائے ہیں لہٰذا بندگان خدا کے ساتھ انصاف لہٰذا رحم کی تلقین کرتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اہم غزالی نے اپنے طالب علمی کے زمانہ میں آپ کے دست حق پرست پر بیعت کی تھی۔

شیخ ابوبکر نساج شیخ ابوالقاسم گرمانی دمشقی ۱۲۵۵ھ کے مرید تھے، ۱۲۸۵ھ میں وفات پائی۔ شیخ کی وفات سے ایک سال بعد غزالی بغداد سے نکلے لہٰذا اپنی جگہ مدرسہ نظامیہ میں اپنے بھائی احمد غزالی کو متعین کیا۔ ۱۲۹۵ھ میں سفر حجاز و دمشق و بیت المقدس و مصر سے واپس وطن کی طرف مراجعت کی۔ اثنائے سفر میں مقامات مقدسہ کی زیارت سے بھی مشرف ہوئے۔ اس طرح دس سال آپ وطن سے باہر رہے لیکن زیادہ عرصہ جامع دمشق لہٰذا بیت المقدس میں گوشہ خلوت میں مجاہدہ اور ریاضت میں بسر کیے۔ جب طوس میں واپس تشریف لائے تو اوقات کا اکثر حصہ خلوت ہی میں بسر ہوتا رہا۔ ۱۲۹۹ھ میں سلطان بخر لہٰذا اس کے وزیر نخر الملک بن خواجہ نظام الملک دمشقی ۱۲۵۸ھ نے آپ کی خدمت میں درخواست کی کہ مدرسہ نیشاپور میں درس و تدریس کا سلسلہ جاری کریں، اہم صاحبِ رضا مدد نہ ہوئے مگر بعض دوستوں کے اصرار لہٰذا استخارہ اور دعایہ صادقہ کی بنا پر آپ نے یہ خدمت دینی قبول کی، ایک سال طالبانِ دین کی تعلیم و ہدایت میں مشغول رہے پھر طوس کی طرف مراجعت کی، لہٰذا اپنی شہرہ آفاق کتاب المنقذ من الضلال یہاں بیٹھ کر لکھی، آپ کی عمر اس وقت پچاس سال سے کچھ لوپر تھی۔

اس کتاب میں آپ نے اپنے سوانح حیات پر تعلق واردات قلبی
 بعض اجاب کے استفسارات کے جواب میں لکھے اور اسی کتاب میں
 یہ بھی واضح کیا ہے کہ علاوہ اصرار بادشاہ و وزیر مجھ پر خواب اور بیداری
 میں منکشف ہوا کہ ہدایت بندگان خدا کے لیے مجھے نیشاپور میں جانا
 چاہیے۔ مولانا جلال ہمالیٰ غزالی نامہ میں لکھتا ہے کہ اہم صاحب
 کا طرز تدریس و تعلیم و تربیت مدسہ نظامیہ بغداد اور نیشاپور میں
 بالکل مختلف تھا۔ بغداد میں تو یکتا عالم متکبر و یگانہ متکلم جلی تھے، اور
 نیشاپور میں سر ہا پا صاحب حال و آرام و سکون تھے، عارفوں کی زبان
 کے محاذہ میں یہ کہنا چاہیے کہ غزالی کا سفر بغداد سے من الحلق
 الی الحق، اور طوس سے نیشاپور کی طرف سفر تا آخر عمر من الحق الی الحق
 تھا۔ ایک عارف کہتا ہے کہ جو سالک سیر سلوک میں اس طرح عروج و
 نزول کرتا ہے، بے خبر ہو و زلہ و رسم منزل لیا، اور یہ کہ غرق سالکان
 است و دة الخارج۔ ایک اور عارف کہتا ہے کہ عارف دو قسم
 کے لوگ ہیں ایک تو بحر وحدت میں ایسے غرق ہوئے کہ پھر نہ
 ابھرے یہ مجنوب کہلاتے ہیں، یہ اقتدار کی صلاحیت نہیں رکھتے،
 دوسرے سیر سلوک میں اعلیٰ مقامات تک پہنچتے ہیں۔ اور پھر نزول
 کرتے ہیں یہ سالک مجنوب ہیں اور یہی اہل تعلیم و تربیت خلق خدا
 کے ہوتے ہیں۔

مولانا ہمالیٰ نے پتہ کی بات کہی ہے کہ اب غزالی محض صاحب
 ہال نہ تھا۔ صاحب حال بھی تھا، اور اپنے مشاہدات اور تجربات کی
 بات کہتا اور یہی وجہ ہے کہ جو ارادت مند حقیقی تھے اور بہت تھے

وہ تو آپ کی صحبت بابرکت سے فیض یاب ہوئے اور آپ کی باری
 آپ کے دل سے نکلتی اور دلوں پر اثر کرتی تھیں، لیکن
 یہی باتیں جو محروم انہی تھے ان کی بھونک کا موجب ہوئیں۔
 غزالی کے ذہنی درجات اپنے زمانہ کے علماء کے فہم سے اعلیٰ و ارفع
 تھے، وہ سمجھتے تھے کہ دین وہی ہے جو عقیداً وہ سمجھ چکے تھے۔ اس
 لیے غزالی کے مرتبہ کو پہچان نہ سکے۔ اور اپنے ہی اعمال و اقوال کے خلاف
 میں غزالی کی رفتار و گفتار کو تسلیم نہ کر سکتے رہے۔ اس لیے فقہاء و دوسرے
 مذہبی عہد و بعض کی وجہ سے غزالی کے مخالف ہو گئے اور حتیٰ تو
 یہ ہے کہ دینداری وہی ہے جو غزالی کی تھی اور وہ سب ہل پرست
 تھے۔

• اتفاق دین الی و بانی ضلالت است

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم واقعات مذکورہ کو ذرا تفصیل کے ساتھ
 بیان کریں۔

مدارس نظامیہ

خواجہ نظام الملک طوسی وزیر ملک شاہ سلجوقی خود صاحب علم و فضل
 تھا۔ بعد مدت العمر اس کی خاص توجہ نشر علوم و معارف کی طرف رہی، اور
 طالبان علم کے لیے ہر ایک ممکن سامان حصول علم و آسائش مہیا کر رکھا تھا
 اس نے مدارس اور خانقاہیں مملکت کے طول و عرض میں تعمیر کیں اور
 مستند استادان شہر کی تحصیل میں دیں۔ بڑے بڑے شہروں مثلاً
 اصفہان اور تیسرا پور اور بلخ و ہرات اور بصرہ و بغداد میں مد سے تعمیر

کیے جو نظامیہ کے ہم سے موسوم ہوئے۔ ہر ایک مدرسہ کے ساتھ
 دو فاضل و احوال و ذخائر مخصوص تھے۔ جذبہ شوق کے تحت بعض طالب علم
 تاریخ التحصیل ہو کر مدرسوں کی اقامت گاہ میں ہی مدت العمر قیام کرتے
 اور وظیفہ مقررہ کی وجہ سے فکر معاش نہ رہتا تو لیسر علم و حکمت میں
 مشغول ہو جاتے مدارس نظامیہ کے نمونہ پر مصر میں جامع ازہر کا سنگ
 بنیاد قاضی خلیفہ کے وزیر "جوہر" نے دکھا جو آج بھی مرکز علم ہے،
 ان مدارس کا تنظیم و نسق متولیوں کے ہاتھ میں تھا جن کا مقرر حکومت
 وقت کی طرف سے ہوتا۔ ہر ایک مدرسہ کے طبقے ایک ایک کتب خانہ
 اور نظم کتب خانہ اور اس کے ماتحت اور کارکن ہوتے۔ ان کا کام یہ تھا
 کہ کتب خانہ کی فہرست مرتب کرتے اور ہر ایک طالب علم کے مطالبہ پر
 کتابیں جیا کرتے۔ ان کے علاوہ کتب خانے جو کتابوں کی نقل کرتے
 اور طالبان علم کو مطالعہ کے لیے دیتے۔ مدرسہ نظامیہ بغداد کے کتب خانہ
 میں ایک ایک کتاب کے کئی کئی نسخے تھے اور کتابوں کی تعداد اور
 کتب خانہ کی وسعت کا اندازہ اسی واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ جب
 ہلاکوں کے عملوں کے وقت بغداد کے محلوں سے آگ کے شعلے
 بلند ہو رہے تھے، تین دن تک دجلہ کا پانی سیاہ بکس پہننے
 ہوئے اسی علم و حکمت کا نام کرنا رہا، نظم کتب خانہ وغیرہ بھی بڑے
 پایہ کے علم مقرر ہوئے۔

مدینہ و مقرر ہوتے جن کے علم و فضل کا شہرہ مالک اسلام
 میں پھیل چکا تھا۔ مدرسہ عالی جس کو ہم "پرنسپل" اور نائب مدین
 پرونیہ کہتے ہیں مدارس نظامیہ میں جو بھی وقتاً فوقتاً مقرر ہوئے

ان کے نام نامی تذکروں میں مذکور ہیں۔ ان کا کیا تذکرہ ہے۔ جو
طالب علم فارغ التحصیل ہو کر نکلے ان میں سے چند ایک لوزی ابودرد
"طہیر قاریابی" جو مشہور شاعر فارسی ہے مدرسہ نظامیہ نیشاپور کے
وظیفہ خوار طالب علم تھے۔ نظامیہ بلخ کا ایک طالب علم۔ رشید الدین
و طباطبائی شاعر لود او بی لود السرخوارم شاہ کا دیوانی تھا۔ لود پیمبر سخن
سدا شیرازی دمتونی ۱۶۹۲ء مدرسہ نظامیہ بغداد کا وظیفہ خوار طالب علم
تھا۔ لود اگر تعلیم و تربیت کی کیفیت ذہن نشین کرنا چاہو تو خود مشہور
سعدی کی زبان سے سن لو۔

مراد نظامیہ اور اردو شب و روز تلقین و تکرار بود
میں نظامیہ (بغداد) میں ایک وظیفہ خوار طالب علم کی حیثیت رکھتا
تھا۔ جو کچھ استاذان مدرسہ تعلیم و تلقین ان کے وقت کے مدرسہ
میں فرماتے رات کے وقت اذیر کرتا۔

مراسد و الغم ای پر خرد۔ فلاں یاد بر من حسدی بود
مدرسہ نظامیہ کے مدرس اعلیٰ ام ابوالفرج ابن جوزی تھے ان
کی خدمت میں عرض کی میرا مدرس فلاں طالب علم ہے جو مجھ پر
حسد کرتا ہے۔

پومن داد معنی و ہم در حدیث۔ برآمد ہم اندویش خبیث
جب کبھی میں حدیث کا کوئی نکتہ بیان کرتا ہوں تو اس کے اندر سے
خناسی دلولہ مضطرب ہو کر باہر نکلتا ہے۔

شیدائیں سخن پیشوائی ادب۔ بر تمنی بر آشفت و گفت ای
میری شکایت سن کر پیشوائی ادب سخت برا فروختہ ہوا لہذا کہ عجیب

ہوا ہے یہ۔
 حسد ہی لذتِ نیا نہ دوستِ ندیم کہ گفت کہ غیبت نکوست
 تجھے اپنے دوست کا حد تو ناگوار گذرا مگر مجھے معلوم نہیں کہ تجھے
 یہ کس نے تلقین کی کہ «غیبت» اچھی چیز ہے سے
 گر لو راہِ دوزخ گرفت از حسی اندم راہِ دیگر دردی دکی
 اگر وہ کینٹ کی وجہ سے ایک راہ سے دوزخ میں داخل ہوا تو دوسرے
 راستہ (غیبت) سے داخل ہو گا۔

یہ پند و نصائح کا دفتر جو شیخ سعدیؒ نے کھولا اسی تعلیم و تربیت
 کا اثر ہے جو مدرسہ نظامیہ میں قبول کیا۔
 مدرسہ نظامیہ کی تاریخ خود ایک مستقل موضوع ہے۔ ان
 مدرسوں میں مدرس اور طالب علموں کے ناموں اور حالات کے بیان کے لیے
 ایک دفتر چاہیے۔

سلطان ملک شاہ سلوٹی کا مذہب حنفی تھا اور خواجہ نظام الملک
 وزیر شافعی تھے، اس مقام پر یہ حقیقت اچھی طرح ذہن نشین کر لی جائے
 کہ مذہب سے مراد ائمہ دین کا تعلق اور اجتہاد فی الدین ہے،
 جب ہم یہ کہتے ہیں کہ بلوچیف یا شافعی کا یہ یا وہ مذہب ہے تو
 اس سے مراد ان کا تعلق فی الدین اور اجتہاد دینی ہے جو اپنے
 نماز کے ذہنی اور خارجی حالات کے مناسبان حضرتان نے وضع کیا۔
 اور ایسے مناسب اسلامیہ بہت ہیں جو ائمہ دین سے منسوب ہیں۔
 ہم نے اپنی کتاب مذہب اسلامیہ میں ان کا تذکرہ مفصل لکھا ہے،
 حقیقت یہی ہے کہ ہر ایک مذہب ایک نظریہ فی الدین ہی ہے اور

کوئی ایسی شے نہیں کہ کوئی مسلمان مشکف ہو کہ اس کا اتباع کرے
 اگرچہ یہ نظریے نہایت قابلِ تقدیر ہیں مگر یہ ذہنی جمود کہ بے حسی
 کی دلیل ہے کہ ہم تعلیماً اپنی کو دیکھنا آسانی کا حجب دین۔ ضرورت اس
 امر کی ہے کہ ہر ایک زمانہ میں بو حنیفہ وغیرہ فقہا پیدا ہوں اور
 اپنے زمانہ کے ذہنی اور خارجی حالات کا جائزہ لیتے ہوئے اور ان
 اصول دین کو مد نظر رکھتے ہوئے جس کی جامع و مانع کتاب قرآنِ عظیم
 ہے "تفقتنی اللہ بن" کریں۔ ابو الفضل کہتا ہے کہ اگر بو حنیفہ در زبان
 مابودے فقہ دیگر کی نوشتہ۔ جس قوم کے حل و فاعل پر جمود چھا جائے
 ہے اور حسب ثنوی قرآن حکیم بے شعور معتد ہو کر وہ جاتی ہے اور
 پرانی لیکر پٹی رہتی ہے اور "اللہ کسی قوم کے معاملات نہیں بدلا جب
 تک وہ اپنی ذہنیت کو خارجی حالات کے مناسب نہ بدلے اور جب
 نہیں بدلتی تو اس کے پرے دن آجاتے ہیں اور نالے سے نہیں
 ملتے۔ مسلمانوں کے تنزل کا یہی سبب ہے۔

چونکہ خواجہ نظام الملک کا مذہب شافعی تھا اس لیے زیادہ تر
 مدارس نظامیہ میں شافعی مذہب کے علماء کا دخل رہا۔

نظامیہ اصقبان

نظامیہ اصقبان کی شہرت خاوادہ نجندی سے وابستہ ہے۔ صدرالدين
 نجندی المعروف "صدایہ" کا تذکرہ مفصل بن سعد بن حسین مازونی
 اصقبانی نے اپنی کتاب "مآسن اصقبان" میں کیا ہے۔ یہ تذکرہ
 اولین پانچویں صدی ہجری میں گذرا ہے۔ یہ خاوادہ مذہباً شافعی تھا

خواجہ نظام الملک نے مدرسہ نظامیہ اصفہان کا نظم و نسق اسی کے سپرد کیا۔
اس خاندانہ کے ممتاز ارکان چند ایک حسب ذیل ہیں جن کا تعلق تملیس
یا نظارت اوقاف مدرسہ سے تھا۔

۱۔ ابوبکر محمد بن ثابت بن حسن بن علی خجندیہ (متوفی ۵۸۳ھ) مولف
کتاب توضیح المناظر و نظائر الدار ہے علاوہ فقہا اصفہان میں ممتاز مرتبہ
کی شخصیت ہے۔ نظام الملک نے اس کو مدرسہ نظامیہ اصفہان میں
مدرس مقرر کیا۔ اس کے علم و فضل کا اعلان اس کے شاگردوں کے علم و
فضل سے ہو سکتا ہے۔ ان میں سے ایک ابو عبد اللہ بن ابوسعید دمشقی
۵۲۵ھ زریہ کا رہنے والا تھا، دوسرا ابو علی اصفہان حسن بن سلطان
بن عبد اللہ بن فنی مہرطائی دمشقی ۵۲۵ھ ہے اس نے کچھ عرصہ نظامیہ
بغداد میں بھی تملیس کی ہے (طبقات شافعیہ میں سلطان کی جگہ سلیمان
باپ کا ہم لکھا ہے) اس نے دس مجلدات میں کتاب القانون فی اللغۃ
اور ایک تفسیر بھی لکھی۔ نظامیہ اصفہان میں اسی کا درس ابوسعید احمد
بن محمد بن ثابت بن حسن بن علی خجندیہ پسر ابوبکر خجندیہ مذکور دیا کرتا جو ۵۲۱ھ
میں فوت ہوا۔ اس نے اپنے باپ ابوبکر سے تحصیل علم کی، تیسرا
صدالدین ابوبکر محمد بن عبد الطیف بن محمد بن ثابت خجندیہ دیہاتی سلطان
اور خلیفہ وقت کا مقرب تھا۔ مدرسہ نظامیہ بغداد میں بھی مدرس و مدرس
۲۲ شوال ۵۵۲ھ میں بغداد سے اصفہان کی طرف آتا ہوا ہمدان و کرج
کے درمیان اثناء سفر میں فوت ہوا۔ ابن اشیر نے اس کا تذکرہ کیا
ہے۔ چوتھا ابوالقاسم صدالدین عبد الطیف بن محمد بن عبد الطیف بن محمد
بن ثابت خجندیہ فقیہ ادب و شاعر تھا۔ جب ۵۲۵ھ میں پیدا ہوا اور

جمادی الاول ۱۲۵۸ھ میں فوت ہوا۔ پانچواں محمد بن عبداللطیف بن محمد بن عبداللطیف بن محمد بن ثابت نجفی ابو بکر نجفی کا پوتا اوقات نظامیہ بغداد میں نظارت کے عہدہ پر فائز رہا۔ ہم نے صرف ایک ہی خاندان کا ذکر خیر کیا ہے۔ اس کے علاوہ لد بھی علاء و فضلا نظامیہ اصفہان سے وابستہ تھے۔

نظامیہ تیشاپور

اس مدرسہ کا انتظام لارڈ ریس و منڈلیں خواجہ نظام الملک نے اہم الحزم ابو المعالی جوہنی کے سپرد کر رکھا تھا۔ یہ اہم غزالی کا استاد ہے غزالی کے بعد اس ابو نصر عبدالرحمن بن ابوبکر احمد سراج دولت شاہ دہات ۱۲۵۸ھ ابو الحسن کبھاری دستوفی ۱۲۵۸ھ تھے۔

نظامیہ بغداد

تمام مدارس نظامیہ میں مدرسہ بغداد سب سے بڑھ کر پایہ کا تھا اس مدرسہ کا سنگ بنیاد ذوالحجہ ۱۲۵۸ھ میں رکھا گیا۔ دو سال کے عرصہ میں عمارت مدرسہ مکمل ہوئی۔ لہذا روز شنبہ ۱۲ھ ذی القعدہ ۱۲۵۸ھ میں رسم افتتاح اٹھائی گئی۔ ابن خلیکان "وفیات" میں اس کا ذکر مفصل کرتا ہے۔ رسم افتتاح کے وقت خواجہ نظام الملک کی دعوت پر علماء اہلبان مملکت جمع تھے۔ ابو سعید احمد بن محمد تیشاپوری صلی کے زیر اہتمام عمارت مدرسہ مکمل ہوئی۔ امور مدرسہ کی تولیت شیخ ابو منصور بن یوسف کو تفویض ہوئی۔ ابن جبیر نے ۱۲۵۸ھ میں مدرسہ نظامیہ کو دیکھا تھا اپنے سفر نامہ میں اس کا ذکر کرتا ہے۔

کہ خواجہ تھے دو لاکھ دینار اس مدرسہ کی عمارت پر صرف کیے۔ اور
 پندرہ ہزار سالانہ شاگردوں کے نفقہ کے لیے خاص تھا۔ اور چھ ہزار
 طالب علم بیک وقت علوم فقہ و حدیث و ادب وغیرہ کی تحصیل میں
 لگے ہوئے تھے۔ اور بے بضاعت شاگردوں کو کتاہیں اور دیگر ضروریات
 کے مصارف بھی ملتے تھے۔ خازن دارالکتب کا ماہانہ دس دینار مقرر
 تھے اسی پر دوسرے ملازمین کی تنخواہوں کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ یہ
 تو یہ بے تعلیم قریب قریب مفت تھی اگر ہم اپنے ناز سے اس
 کا مقابلہ کریں تو معلوم ہوگا کہ حکومت کی بے توجہی سے تعلیم اتنی مہنگی ہے
 کہ ایک متوسط الحال خاندان تعلیم سے محروم ہے۔ اس لیے اکثریت
 جاہل ہے، اور عام جہالت کا نتیجہ ہے کہ ملک کے طفل و عرض میں
 فتنہ و فساد اور جرائم کی کثرت ہے۔

مدرسہ نظامیہ بغداد کا نظم و نسق خواجہ نظام الملک نے براہ راست
 اپنے ہاتھ میں رکھا تھا۔ ایک مدرس اعلیٰ ابو الفرج عبدالرحمن بن
 بوزی شیخ سہلی اور غیرہ کا استاد ہے۔ اس خاندان کے چند
 افراد کا ہم حسب ذیل ہے۔

- ۱۔ جمال الدین ابو الفرج عبدالرحمن بن ابوالحسن حلی بن محمد بن بوزی۔
 نجل مذہب کے بلند پایہ فقیہ میں سے ہے مؤرخ اور مشہور واعظ
 عصر تھا۔ اکثر کتابوں کا مصنف ہے۔ تاریخ میں اس کی کتاب
 المنتظم فی تاریخ الامم اور شذھا لقصود فی تاریخ العہود ہے۔
- ۲۔ علی الدین ابو محمد یوسف بن عبدالرحمن بن بوزی محتسب بغداد
 لہ مدرسہ مستغریہ تھا۔ بغداد کے مدارس کا اکرم نے اپنی

کتاب بغداد میں کہا ہے، ان میں سے ایک مدسہ مستصریہ خلیفہ
جہاں باللہ مستصر سے منسوب تھا۔ محی الدین خلیفہ کا مقرب بھی تھا
اور سفارت پر بھی کبھی کبھی جایا کرتا اور اس سلطان اور ملک سے
بھی اس کا واسطہ تھا۔ شب شنبہ فی القعدہ ۵۸۰ھ میں پیدا
ہوا اور محرم ۵۸۰ھ میں ہلاکو خاں کے قتل عام میں ملا گیا۔

۳۔ شرف الدین عبداللہ
۴۔ تاج الدین عبدالکرم

تھے اور مینوں بھائی بیک وقت بغداد میں مقتول ہوئے۔

۵۔ جمال الدین ابوالفرج عبدالرحمن بن یوسف بن جوزی محی الدین
ملوک کا بیٹا ہے۔ جب کبھی باپ سفارت کے ضمن میں باہر جاتا یہ
مدسہ مستصریہ میں باپ کی جگہ دیکھ دیتا۔ یہ بھی باپ کے ساتھ
ہی فتنہ مغول میں قتل ہوا۔ یہ اپنے جد کی طرح واعظ وغیرہ بھی
تھا۔ اس کی مجلس واعظ میں مامین پر ایک بے خودی کا عالم طاری
ہو جاتا۔ شیخ سعدی نے گلستان میں اسی ابن جوزی کا ذکر کیا ہے
کہ چنانکہ ملا شیخ اجل الفرج بن جوزی ترک سماع می گفت الخ
بہ ہی ابن جوزی ہے اسی کے زمانہ میں شیخ سعدی کا مقام بغداد
میں تھا۔

۶۔ شمس الدین ابوالمظفر یوسف بن قزغلی المعروف بسبط ابن جوزی

ساتویں بھری کا مشہور محدث ہے۔ اس کی تاریخ تراۃ الزمان کا
تھی نسخہ مولف کا دستخطی ابن خلقان نے دیکھا تھا۔ یہ بزرگ بخلات
دیگر بزرگان خانوادہ حنفی تھا ۵۸۲ھ میں پیدا ہوا اور وفات شب

۲۱ ذی الحجہ ۱۲۵۷ھ میں متع ہوئی۔

اس خاندان کے حالات ابن خلکان اور ابن اثیر نے کمال میں
 اور دیگر مورخین نے لکھے ہیں۔

۱۲۵۷ھ میں بازار نظامیہ میں آگ لگ گئی۔ لہذا عمارت مدرسہ
 کو بھی بہت نقصان پہنچا، اکثر لوگ ہلاک ہوئے۔ عطا محمد جو بہت ہی تامل
 مدرسہ کی محاسل سے مدرسہ کی عمارت از سر نو درست کر دی، ۱۲۵۷ھ
 میں شرف الدین بلاروں شمس الدین صاحب دیوان جو بہت ہی تامل
 سلسلہ تدریس جاری رکھا، اٹھویں صدی ہجری میں مشہور سیاح ابن
 بطوطہ بغداد میں آیا۔ اپنے سفر نامہ میں بغداد اور مدرسہ نظامیہ کی
 تعریف میں رطب اللسان ہے کہ دنیا میں اس کا مثل نہیں۔

مدیسین نظامیہ بغداد

خواجہ نظام الملک کو ابوالسحاق شیرازی سے بہت عقیدت تھی،
 آپ ان ایام میں علماء شافعیہ میں ممتاز تھے۔ خواجہ کی خواہش تھی کہ
 آپ ہی مدرسہ اعلیٰ ہوں۔ افتتاح کے دن شیخ مدرسہ کی طرف
 آ رہے تھے کہ ایک لڑکا سر بازار راستہ روک کر کہنے لگا: یا شیخ
 کیا آپ مدرسہ میں درس دیں گے جس کی عمارت لوگوں کے خون
 سے بنی ہے؟ ما شیخ صاحب لوٹے اور خواجہ سے معدت کے
 کے بعد کہا کہ کسی اور کو یہ منصب دیں۔ خواجہ نے سر دست ابوالنصر
 بن صباغ کو لولیں مدرسہ نظامیہ مقرر کیا۔ ابوالنصر صرف بیس روز
 مدرسہ رہا، اس عرصہ میں خواجہ نے شیخ ابوالسحاق کو ماضی کر لیا

مگر آپ نے مدرسہ کی عمارت میں قدم نہ رکھا، ایک چھوٹی سی مسجد قریب ہی گھر میں بیٹھ کر طالبان علم کو درس دیا کرتے۔ شیخ ابو اسحاق ^{۱۹۵۹} سے ^{۱۹۶۰} تک یعنی وفات تک مدرسہ رہے۔ بھان اللہ جب مدرسہ تقویٰ کے ایسے بلند مقام پر ہوں تو شاگردان کی صحبت میں کس حد تک فیض یاب ہوئے ہوں گے۔

تین سال یعنی ^{۱۹۶۱} تک ابو نصر بن صباغ اور شیخ ابو سعید کے بعد دیگرے مدرسہ رہے ان کے بعد شیخ ابو القاسم دہلوی سال وفات یعنی ^{۱۹۸۲} تک مدرسہ اعلیٰ کی خدمت سرانجام دیتے رہے۔ ان کے بعد حسین بن علی طبری مولف کتاب "عمدہ" مدرسہ مقرر ہوئے ان کا شریک لاہ ابو محمد علی شیرازی تھا۔ ان کا قور بھی ^{۱۹۸۲} میں ختم ہوا۔ ان کے بعد امام محمد غزالی جمادی الاول ^{۱۹۸۲} میں کسی تبدیلی پر ممکن ہوئے۔ مگر آپ نے چار سال بعد مدرسہ نظامیہ اور بغداد کو چھوڑا۔ آپ کا بھائی امام احمد غزالی آپ کی جگہ مسند ارشاد پر بیٹھا۔

مدرسہ نظامیہ بغداد کی مکمل تاریخ لکھی گئی ہے۔ مدرسین کی فہرست طویل ہے اور اس مدرسہ کے حالات کے لیے ایک علیحدہ کتاب کی ضرورت ہے۔ ہمارے موضوع کا تعلق امام غزالی تک ہے

ممنصر حکماء و مشائخ صوفیہ

ہم ذیل میں ان اشخاص کے نام لکھتے ہیں جو امام غزالی کے ممنصر حکماء و مشائخ صوفیہ میں سے تھے یہ شخصیتیں مشاہیر اسلام میں

شمار ہوتی ہیں۔ اور تاریخ سلجوقیہ عماد کاتب لہ تاریخ الحکماء شہر
ندوی و یافعی و طبقات شافعیہ و طرائق الحقائق و دنیاات ابن عسکان
و کمال ایس اشیر وغیرہ میں ان کا تذکرہ ہے۔ ان مشاہیر کے تذکرہ
سے ہماری غرض صرف اتنی ہے کہ ہم محمد غزالی کے زمانہ کی اعلیٰ
ذہنیت کا اندازہ ہو سکے۔ لہٰذا یہ کہ ہم صاحب کا مرتبہ اپنے معاصرین
میں کیا ہے؟

۱۔ خواجہ عبداللہ انصاری نعرونی، آپ شیخ الاسلام عبداللہ بن محمد
بن علی لہ بالاختصار پیر نعرونی کے ہم سے مشہور ہیں۔ مشائخ صدیقیہ
خراساں میں آپ کا مرتبہ بہت بلند ہے، ۵۲۸ھ میں وفات پائی۔
۲۔ خواجہ یوسف ہمدانی، ابویعقوب یوسف بن ایوب بن یوسف
مروہ کے مشائخ میں سے ہیں، ۹۴۴ سال کی عمر میں بہ ماہ ربیع الاول
۵۲۵ھ میں وفات پائی۔

۳۔ عین القضاة ابوالمطالی عبداللہ بن محمد حبیبی ہمدانی ہم محمد غزالی
کے بھائی امام احمد غزالی کے مرید اور تربیت یافتہ تھے ابوالقاسم وزیر
کو امام صاحب سے سخت دشمنی تھی۔ مگر گناہ مرید کا کسی جرم میں قتل
کیا کہ امام محمد غزالی کا طرفدار ہے، یہ واقعہ چہار شنبہ ہمدانی الاخر
۵۲۵ھ کا ہے۔

۴۔ احمد بن علی بغدادی معروف بہ ایس زہر صوفی متوفی ۹۶۷ھ
۵۔ عبدالعاحد بن اسحاق ابوالقاسم قشیری متوفی ۹۹۴ھ
۶۔ ابوسعید عبداللہ بن عبدالکریم رسلانہ ۱۰۰۰ھ، ابوسعید لہ
عبدالعاحد بلور الیہ عبدالرحیم بن عبدالکریم اسناد ابوالقاسم قشیری کے

خانوادہ سے ہیں۔ ابوالقاسم دکنی ۳۶۵ھ بمطابق ۹۷۵ء میں حوازن مشہر
صنی بزرگ ہیں مولانا جلی نعمات الانس میں لد اکثر ملکہ نو میں آپ
کے رسالہ "تشریح" کا حوالہ دیتے ہیں۔ تصوف میں یہ اعلیٰ پایہ کی کار
ہے۔

۷۔ زین الدین مکر بن سحلان مادی مولف کتاب "بصار" نظر یہ کتاب
تہمت نیشاپور میں تھی۔ کتابت پر گذر تھی۔ ابوالسینا کی کتاب "شفای
لوگوں کو کھڑا کر دینا۔"

۸۔ ابوالعباس نوکی ساگرد یعنی ابن مرزبان آذربائیجانی لد وہ شاگرد
ابوالسینا تھا۔ یعنی ایک واسطے سے شیخ الرئیس کا شاگرد ہے۔ خراسان
میں فلسفہ کو اسی نے پھریا۔

۹۔ ابو حاتم مظفر اسفرائینی۔ یہ شخص عمر خیام کا ہم عصر مشہور بیانی دان
تھا۔ اس نے حکیم ارضمیدس کا ترانو ایجاد کیا جس سے عزات لد دیگر اشیا
کے صح لونان معلوم ہو سکتے ہیں۔ ارضمیدس نے معلوم کر لیا تھا کہ پانی
میں ہر ایک چیز کا وزن خاص تناسب سے کم ہو جاتا ہے، ابو حاتم
نے ترانو بنایا لد ہر ایک شے خالص کا وزن دیا وقت کیا۔

۱۰۔ موصی بسیتی، محمد بن احمد فلسفی لد بیانی دان عمر خیام کا شریک کار
درد ملک شاہی ہیں تھا۔ تاریخ بسیتی میں اس کا مذکور ہے۔ غالی
جو حسن بن صباح نے تیار کیے تھے اکثر دن دارو اہلوائنکے ہاتھ سے قتل
ہو چکے تھے موصی ۳۸۵ھ میں مارا گیا۔

۱۱۔ حکیم علی بن محمد غزنوی منجم، بیانی لد نجوم میں کامل دستاورد تھی
سلطان الہامیم بن مسعود بن سلطان محمود غزنوی کا دبیر تھا۔ تاریخ بسیتی

میں اس کا بھی تذکرہ ہے۔ ۵۳۱ھ میں دہات پائی۔
 ۱۲۔ حکیم علی بن عمر کا امی، طبیب اور فلسفی تھا۔ ایک سو سال قلمی زندہ
 رہا، ۵۴۶ھ میں فوت ہوا۔
 ۱۳۔ میمون بن بختیب کا سنی، ام غزالی کے عہد کا مشہور طبیب اور فلسفی
 تھا اس نے عمر خیام کا ہاتھ بھی رسد اور تقویم جلالی میں بنایا۔ ظہیر الملک علی بھیسوی
 حران عہد کا مقرب تھا۔ تاریخ الحکا شہر ندوی میں اس کا تذکرہ ہے۔

بعض شعراء فارسی

ام غزالی کا ابتدائی زمانہ حکومت سلجوقیہ سے وابستہ رہا۔ خواجہ نظام
 آپ کا مہربی تھا۔ آپ کی زندگی کا اکثر حصہ اسی دور میں گزرا۔ جب تک
 خواجہ نظام الملک زندہ رہا شعرو شاعری کا بازار سرد رہا۔ خواجہ کی توجہ
 زیادہ تر علم و حکمت کے نشر کی طرف رہی شاعری کو وہ محض دینی تہذیب اور
 غیر مفید سمجھتا تھا۔ ان ایام میں ایک عزیز معنوی "شاعر تھا جس کو
 سلجوقی سلطان ملک شاہ کے دربار تک رسائی تھی اور اس کی بھی
 یہ حالت تھی کہ نظامی عروضی و چہار مقالہ میں لکھتا ہے کہ اس کا باپ
 امیر الشعراء بدلی ملک شاہ کے ابتدائی عہد میں فوت ہو گیا مرنے
 سے پہلے ایک قطعہ کہا اس کا ایک شعر مشہور ہے یہ

من رستم و فرزند من آمد خلف صدق لوما بخدا و بخداوند سپردم
 ملک شاہ نے امیر معنوی کی دستگیری کی مگر حالت یہ تھی کہ کبھی
 باریابی کا موقع ملا کبھی دور ہی سے سلطان کا سلام ہو جاتا نہ کچھ
 کھانے کو پیٹ بھر لیا اور نہ پوشش کے لیے کپڑا ہی ایسا تھا کہ

دربار سلطانی کے مناسب ہونا۔ قرض پر گزارہ تھا مگر تاجکے۔

دربار بلوچیہ تو شعرو شاعری کی زینت سے بے نیاز تھا مگر

ہمسایہ ممالک اسلامیہ غزنویہ و خضر خانہ و سلاجقہ کرماں وغیرہ میں

اس کا کچھ چرچا تھا۔ اگرچہ امام غزالی کو ادب فارسی پر پورا عبور

تھا مگر شعرو شاعری سے منور کار نہ تھا۔ ملک شاہ کے بعد دربار

نجر بلوچی لود بہرام شاہ غزنوی کے دربار میں شاعری زندہ ہوئی۔

امیر صاحب کے ہمعصر شعرا میں سے بعض سے مراسم دوستانہ امام

صاحب کے بھی تھے۔ ان میں سے ایک حکیم عمر خیام ہے جو مشاہیر

اسلام میں شمار ہوتا ہے لود اس کی شہرت محتاج تعارف نہیں۔

اس کی باعیات فارسی کا ترجمہ یورپ کی علمی دہانوں میں ہو چکا ہے

یہ ممتاز شخصیت ملک شاہ کے دربار میں بحیثیت شاعر وارد نہیں ہوئی

تھی۔ یہ اعلیٰ پایہ کا شاعر لود ادیب لود فلسفی لود ریاضی دان لود

علم ہیئت میں ماہر تھا۔ اس نے "صد گاہ" تیار کی لود "تقویم جلالی"

معدن کی، لیکن تعجب ہے کہ آج اس کا نام بحیثیت شاعر ہی زندہ

ہے۔ پروفیسر برادون ادبیات ایران کی تاریخ میں حکیم شفقائی

کے مدکرہ کے ضمن میں لکھتا ہے کہ شاعری شفقائی کیلئے موجب فخر نہ تھی

مگر شفقائی کو اگر کوئی جانتا ہے تو صرف شاعری کی وجہ سے، اور

اگر وہ شاعر نہ ہوتا تو اس کا نام بحیثیت حکیم صرف تذکروں کے کسی

گوشہ میں رہتا۔

امام محمد غزالی کی ملاقات کا ہے گا ہے حکیم خیام سے ہوئی۔ لود

مسائل حکمت پر بحث بھی رہی۔ ایک دفعہ امام صاحب نے حکیم سے

دریافت کیا کہ اس کا سبب کیا ہے کہ اجزاء فلک سے ایک نقطہ
 معین قطب کا ہی ہے حالانکہ ہم فیلسوف اس بات پر متفق
 ہیں کہ افلاک کے اجرام متشابہ ہیں۔ علم تکوین میں تریح بلا مرجح
 محال ہے، اس لیے قطب کیوں اس قاعدہ کلیہ سے مستثنیٰ ہے
 سوال ذرا ٹیڑھا تھا۔ حکیم صاحب چکرائے لور گردش اجرام سماوی کے
 حالات بطور مقدمات بیان کرنے لگے لہذا لمبی پوٹلی تشریح میں کھوئے
 گئے۔ کہ اتنے میں قریباً کی مسجد سے مؤذن نے اذان دی،
 ہم صاحب نے کہا کہ

جاو الحق وزهق الباطل

(حق آیا لہذا باطل نبرد ہو گیا)

اٹھے اور مسجد کی طرف رخ کیا۔

ایک لہذا شاعر مسعود سعد سلمان نام صاحب کا بمعصر تھا۔ یہ
 نخر پنجاب کے صد مقام لاہور کے لیے ہے کہ اس مشہور شاعر کی
 پیدائش اس شہر میں ۳۹۹ھ میں واقع ہوئی۔ لیکن اصل
 اس کی ہمدان ہے۔ اس کا تذکرہ ہفت اکہم لور یا من الشعراء وغیرہ
 میں مفصل ہے،

عثمان بن محمد مختاری غزنوی اور سلمان شاہ بن مسعود بن ابراہیم
 غزنوی درالاشہد۔ ۵۹۵ھ کا دہائی شاعر ہے۔ اس کے مرتبہ
 کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ حکیم سنائی غزنوی بھی اس کی
 تعریف کرتا ہے، اسی کا بمعصر جس سے اس کا مناظرہ ادبی بھی رہا۔
 رشیدی ہے۔ رفیعی ظہیر الدولہ بن ابراہیم بن مسعود غزنوی کا دہائی تھا۔

امیر معنوی نیشاپوری مجدد ملک شاہ سلجوقی میں مشہور ہوا ہے، امام غزالی سے بھی اس کی ملاقات تھی، ۳۸۵ھ میں قزوین میں فوت ہوا۔

الواجہ مجدد بن آدم سنائی غزنوی ہے وہ بلند مرتبہ شخصیت ہے کہ مولانا دہلی اس کے مداح ہیں، حکیم سنائی کی مشہور کتابہ کا ایک نمونہ مولانا دہلی کے سامنے تھا جس پر آپ نے "مثنوی معنوی" لکھی، فرماتے ہیں۔

نیم جوئی کردہ ام من نیم خام از حکیم غزنوی بشنو تم
بمذیک شبہ «شعبان» ۵۲۵ھ دولت فرمائی۔

تھم خضر و علی متخلص بہ، مجتہد ایران کے فلسفیوں اور شعرا میں سے ہے، اس کا سفر نامہ "لذات المسافرین" مشہور کتابوں میں۔ اسماعیلیہ قاطیہ کے بارہ قاصیوں میں سے ایک ہے ان کو جنت کہتے تھے۔ فی قصہ ۳۵۲ھ میں پیدائش اور ۳۸۵ھ میں وفات واقع ہوئی۔ تھم خضر نے اپنے "سفر نامہ" میں اپنے ایک ہم عصر شاہ "قطران آذر بائیگانی" کا بھی ذکر کیا ہے۔ دونوں کی ملاقات تبریز میں ہوئی تھی۔

ان شعرا کے علاوہ ام صاحب کے معاصرین شعرا فرغانی لوز معنی بخاری، دمنونی ۳۵۳ھ رشیدی سمرقندی بھی ہیں، عمیق، امیر الشعرا اور رشیدی سید الشعرا کے لقب سے مشہور ہیں، دونوں خضر خاں بن طغاس خاں ابراہیم ملوک خانیہ ماورالنہر کے درباری شاعر تھے۔ ایک روز خضر خاں نے رشیدی کی عدم حاضری میں عمیق

بخاری سے دریافت کیا کہ رشیدی کے کلام کے بارہ میں تمہاری کیا
 رائے ہے۔ جواب دیا کہ شعر تو اچھے کہتا ہے مگر ان میں ننگ
 کی چوٹنی نہیں، چند لفظ کے بعد رشیدی خضر خاں کی خدمت میں
 حاضر ہوا۔ تو خضر خاں نے باتوں باتوں میں کہا کہ میں نے عمیق
 سے تمہاری شاعری کے بارہ میں رائے دریافت کی تھی کہا کہ شعر
 اچھے کہتا ہے مگر بے ننگ ہیں۔ رشیدی نے اسی وقت ایک قطعہ
 لکھ کر خضر خاں کو دیا کہ عمیق کو میری طرف سے جواب دیں۔

شعر حالیٰ مرا بہ بے ننگی عیب کردی دعا بود شاید
 شرمین ہجو شکر و شہد است و ندریں دو ننگ نکو ناید
 غلغغہ باقلیت گفتہ تو ننگ لے قلیان ترا باید

ان شعرا کے علاوہ ابوالفرج دونی، اور ابو طاہر خالقی مؤلف کتاب
 مناقب الشراء اور ہارمخ آل بلوق، اور لامی جرجانی اور ابوالسعال
 اور شہابی سمرقندی اور اسدی طوسی مؤلف ہر شاہ سب نامہ وغیرہ
 اہم صاحب کے ہمعصر شعرا تھے، اسدی طوسی، فردوسی مؤلف شاہنامہ
 کا استاد ہے۔

ہمعصر سلاطین و وزراء و امراء

لفظ سلطان ایک خطاب ہے جو خلفاء عباسیہ کی طرف سے
 ان اشخاص کو عطا ہوتا رہا جو مملکت عباسیہ کے کسی حصے پر بطور
 نائب السلطنت یا ہماری زبان میں صوبہ دار مقرر ہوتے یا وہ خود
 ہی کسی حصہ ملک کو بزور باد و با بیٹتے مگر یہ ہم عقیدہ تھا کہ سلطنت

اور حکومت کا حق مسلمانوں میں صرف قریش کو حاصل ہے اس لیے مسلمان
 خواہ مجبوراً کسی غیر قریش کی حکومت عملاً تسلیم بھی کر لیتے اعتقاداً اسے
 جائز حکمران نہ سمجھتے۔ جب تک خلیفہ وقت اس کے تقرر کی تصدیق
 اور توثیق نہ کرنا اس طرح ہر ایک سلطان گوہ خود مختار ہی تھا لیکن
 کسی نہ کسی طرح خلیفہ وقت کی سند حاصل کرتا۔ ہمارے ہندوستان
 کے مغنیہ شہنشاہ حضرت اردنگ زیب عالمگیر نے بھی یہ سند حاصل
 کی تھی۔ حالانکہ وہ اہل کے بغیر بھی شہنشاہ ہی تھے اور ان کے
 بزرگ بے سند بھی شہنشاہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ غیر قریش
 صاحبان حکومت کو خلیفہ نہیں سلطان کہتے ہیں۔ سب سے پہلے
 جس نے اس رسم کو توڑا وہ تکی سلطان سلیم تھا۔ لیکن سلطان ان
 کو بھی سلاطین نام دہنام ہی کہتے ہیں، اگر یہ نظریہ صحیح ہو تو خلافت
 قریش خلفاء عباسیہ کے ساتھ ہی ختم ہو گئی تھی۔ مگر جسے حدیث
 نبوی "الا یمن من العرش" قرار دے کر غیر قریش کو سلاطین کہا جاتا
 ہے اگر صحیح بھی ہو تو اس کا مفہوم واضح ہے کہ حسب تک قریش
 خلافت کے اہل تھے، حکومت ان کے قبضہ میں رہی۔ اس کے بعد
 ترکوں اور دیگر مسلمان اقوام میں منتقل ہو گئی۔ اگر امامت اور خلافت
 ایک ہی شے ہے تو اس پر بحث تحصیل حاصل ہے، دیکھنا یہ
 ہے کہ عملاً کیا ہوا۔ غیر قریش بھی بڑے پایہ کے علماء و دین گزریں
 ہیں بلکہ بقول علامہ ابن خلدون ہر ایک علم و فن کے مستند استاد
 علمی ہی تھے۔ بلکہ لوٹلیوں کی اولاد تھے۔ بہر حال چونکہ یہ لقب اعتقاداً
 معراج پا گیا ہم بھی انہیں سلاطین کے ہم سے ہی یاد کرتے ہیں۔

اہم صاحب کا تعلق خاندان سلو قیدہ کے تاجداران ملک شاہ
 لہ محمد بن ملک شاہ اور سلطان بنجر سے بالخصوص رہا اور وہ بھی آپ
 کا واجب احترام اور عزت کرتے رہے، اہم صاحب نے ان کی ہدایت
 کے لیے مکتوب لکھے، بغداد میں ظفار عباسیہ سے بھی ایسا تعلق
 قائم رہا اہم صاحب کے وقت سلو قی سلطان قابل ذکر حسب ذیل ہیں،

- ۱۔ دکن الدین بن ابوطالب طفیل بیگ (۵۵۵-۵۲۹ھ)
 - ۲۔ سعد الدین بن ابوجراح الپ ارسلان (۶۵-۵۵۵ھ)
 - ۳۔ جلال الدین ابوالفتح ملک شاہ بن الپ ارسلان (۸۵-۶۵۵ھ)
 - ۴۔ ناصر الدین محمود بن ملک شاہ (۸۶-۵۲۸ھ)
 - ۵۔ دکن الدین بن ابوالمنظف (۹۸-۵۳۶ھ)
 - ۶۔ غیاث الدین ابوجراح محمد بن ملک شاہ (۵۱۱-۵۱۸ھ)
 - ۷۔ مقرر الدین ابوالحارث بنجر بن ملک شاہ (۵۵۳-۵۲۹ھ)
 - ۸۔ محمود بن محمد بن ملک شاہ بن الپ ارسلان (۵۲۵-۵۱۲ھ)
 - ۹۔ طفیل دم بن محمد بن ملک شاہ (۲۹-۵۲۵ھ)
- یہاں تک یہ سلاطین اہم صاحب کے ہم عصر تھے۔ اس خاندان کے
 دیگر سلاطین حسب ذیل ہیں۔

- ۱۰۔ مسعود بن محمد بن ملک شاہ (۴۶-۵۲۹ھ)
- ۱۱۔ معیث الدین بن ملک شاہ بن محمود بن محمد بن ملک شاہ (۵۲۶ھ)
- ۱۲۔ غیاث الدین محمد بن محمود بن محمد بن ملک شاہ (۵۳-۵۲۶ھ)
- ۱۳۔ سلیمان شاہ بن محمد بن ملک شاہ (۵۵۲-۵۲۶ھ)
- ۱۴۔ ارسلان بن طفیل بن محمد بن ملک شاہ (۵۵۶-۵۲۶ھ)

۱۵۔ طفل سوم بن اسلان بن طفل د ۹۰-۵۶۱ھ
 ۱۶۔ آخری سلطان نگش خوارزم شاہ کے مقابلہ میں مارا اور قاندان
 بلوچہ ایرانہ کا اس کے ساتھ فاتح ہو گیا۔

بمعصر خلقاء عباسیہ

- ۱۔ عبداللہ القائم بامر اللہ د ۶۷۲-۲۲۲ھ
- ۲۔ عبداللہ المقتدی بامر اللہ د ۶۸۶-۲۶۶ھ
- ۳۔ احمد المستظهر باللہ د ۵۱۱-۴۷۷ھ

بمعصر خلقاء قاطمیہ

- ۱۔ المستظهر باللہ ابو تمیم محمد بن الظاہر د ۴۸۶-۴۲۶ھ
- ۲۔ المستقل باللہ ابو القاسم احمد بن مستقر د ۴۹۵-۴۸۶ھ
- ۳۔ الامریا حکام اللہ ابو علی منصور بن مستقل د ۵۲۴-۴۹۵ھ

بمعصر سلاطین غزنویہ

- ۱۔ ابو المظفر ظہیر الدولہ رضی اللہ عنہ بن ابراہیم بن مسعود بن محمود غزنوی د ۵۰۰-۴۹۲ھ
- ۲۔ علاء الدولہ سلطان مسعود بن ابراہیم بن مسعود د ۵۰۸-۴۹۲ھ

سلاطین خانیہ ماورالنہر

سلاطین خانیہ کو خضر خانیہ اور خانانیاں ماورالنہر بھی کہتے ہیں۔ بمعصر
 حسب ذیل تھے۔

- ۱۔ سلطان خضر خان بن طفتاج خان ابراہیم (۸۸-۴۸۲ھ)
- ۲۔ فتح طفتاج خان مسعود (۳۹۴-۴۸۸ھ)
- ۳۔ ارسلان خان محمد بن بلیمان بن داؤد (۵۲۴-۴۹۵ھ)

بمصر سلجوقی کرمانی

- ۱۔ علاء الدین بن قرا ارسلان قادر بیگ بن جعفر بیگ (۶۵-۴۲۳ھ)
- ۲۔ کرمان شاہ بن قادر (۶۶-۴۶۵ھ)
- ۳۔ رکن الدین سلطان شاہ (۷۷-۴۶۶ھ)
- ۴۔ تونان شاہ (۹۰-۴۷۷ھ)
- ۵۔ ایران شاہ (۹۴-۴۹۰ھ)

بمصر وزرا و امرا

- ۱۔ عمید الملک کندی ابو نصر محمد بن منصور وزیر الپ ارسلان تھا۔
۴۵۶ھ میں معزول ہو کر مارا گیا اور ہزارت خواجہ نظام الملک طوسی کو
علی رعداد کاتب تادمیخ بلوق میں لکھا ہے کہ عمید الملک اولین وزیر
دولت سلجوقیہ تھا۔
- ۲۔ ابو علی قوم الدین حسن بن علی بن اسحاق الحی طیب بہ خواجہ نظام الملک
طوسی مشاہیر اسلام میں شمار ہوتا ہے صرف دس سال الپ ارسلان
کا اور بیس سال ملک شاہ کا وزیر رہا۔ بعد جمعہ ۲۱ ذی القعدہ ۴۷۷ھ
میں پیدائش مانع ہوئی کہ ماہ رمضان ۴۸۵ھ میں قلائیاں حسن بن
صباح کے ہاتھ سے مارا گیا

۳۔ تاج الملک ابوالعالم مرزبان بن خسرو فیروز معروف بہ ابن خارخاہہ نظم الملک کے بعد وزیر ملک شاہ ہوا۔ غلامان خارخاہہ نظم الملک کے ہاتھ سے چند ماہ بعد محرم ۳۸۶ھ میں مارا گیا۔

۴۔ محمد الملک ابوالفضل قمی وزیر برکیارق تھا۔ امراء دربار نے بادشاہ کی موجودگی میں ۳۹۲ھ میں قتل کر کے دیزہ دیزہ کر دیا۔ ام صاحب نے ایک مکتوب میں بوخرا الملک کے ہم لکھا محمد الملک تاج الملک کا ہم بھی یاد کیا ہے۔

۵۔ مویذ الملک ابو بکر عبید اللہ بن خارخاہہ نظم الملک بھی ۳۸۶ھ میں برکیارق کا وزیر مقرر ہوا۔ ایک لڑائی جو سلطان برکیارق اور سلطان محمد بن ہمدان میں ہوئی مارا گیا۔

۶۔ فخر الملک مظفر بن خارخاہہ نظم الملک ۳۸۸ھ میں وزیر برکیارق مقرر ہوا۔ اسی ۳۸۸ھ تک سلطان بنخر کا وزیر رہا بعد ازاں ۳۹۰ھ میں مارا گیا۔

۷۔ صد الدین ابوالسحاق محمد بن فخر الملک بن نظم الملک باب کے قتل کے بعد وزیر سلطان بنخر ہوا ۳۹۵ھ میں بلخ میں قتل کیا گیا۔ ہم صاحب کا تعلق خاندان خارخاہہ نظم الملک سے ہمیشہ رہا۔ صد الدین اور اس کا باپ فخر الملک آپ کا احترام اس حد تک کرتے رہے کہ یہ بات کسی لعد عالم دین کو ان ایام میں لیر نہ تھی۔ لعد فخر الملک ہی نے آپ کو نیشاپور کے مدرسہ نظامیہ میں سلسلہ مدرس جاری رکھنے پر مجبور کیا۔ امام صاحب نے جو مکتوبات ان دربار کو لکھے وہ اب بھی محفوظ ہیں۔

عبداللہ بن علی کی وفات کے بعد خواجه نظام الملک کے علاوہ زیادہ ابوالحسن
 شباب الاسلام عبدالنفاق بنجر کا وزیر مقرر ہوا۔ عبدالنفاق کا باپ عبداللہ
 بن علی بن اسحاق نعتیہ اجل تھا لہذا امیر معنوی شاعر کا مدوح ہے۔
 ان دنوں کے علاوہ اور بھی ہیں لہذا اگرچہ ہر ایک بیگانہ روزگار
 تھا مگر جہاں تک اہم صاحب کا تعلق ہے اپنی روزگار کا ہم
 مذکوروں کے تاریخ میں یا گیا ہے۔ اگر امر و مذا کو آپ نے اپنے
 مکتوبات میں مخاطب کیا ہے۔

عہد امام محمد غزالی

اہم صاحب کا زمانہ چند خصوصیات کی وجہ سے تاریخ اسلام میں
 نمایاں امتیاز رکھتا ہے، ان اہم میں ہر ایک علم و فن کے علاوہ حکمران
 کثرت سے پیدا ہوئے لہذا علم و حکمت کی اشاعت کی طرف سلاطین
 اور دنیا کی توجہ بھی زیادہ تر رہی چنانچہ مدارس ملک کے طول و عرض
 میں عام تھے۔ ان میں سے مدارس نظامیہ کا ہم ذکر کر چکے ہیں۔
 تالیف و تصنیف بھی بالخصوص فقہ و اصول و حدیث کلام و حکمت علین
 زیادہ تھی۔ اس کے ساتھ مذہب اہل سنت و الجماعت کی اشاعت
 بھی بہ نسبت دیگر مذاہب زور پر تھی۔ تمام سلاطین اور ان کے وزراء اور
 علماء و عبادت سنی تھے۔ حکومت کی سرپرستی میں علم و حکمت و مذہب
 تسنن کی اشاعت خاطر خواہ ہوئی۔ حقیقت میں یہی ہے کہ تسنن شروع
 سے تاریخ الوقت تک مذہبی تھا۔ لیکن زیادہ تر سیاسیات کی وجہ
 سے تفریق بعد میں پیدا ہوتی گئی۔ ہم نے اپنی کتاب "مذہب اسلامیہ"

میں اس موضوع پر مفصل بحث کی ہے اس لیے اس مقام پر
 اتنا ہی اشارہ کافی ہے کہ دوسری صدی ہجری میں جو خارجی تاثرات
 کار فرمائے ان میں سے میاسیات کے علاوہ حکمت یا فلسفہ ایرانی
 دینانی بھی تھا جس کی وجہ سے اختلاف سنی و شیعہ و معتزلی و اشعری
 و اہل و غیرہ پیدا ہوا۔ امام صاحب اس اختلاف کا سبب سے
 خوب واقف تھے۔ لیکن اس کے ضرر کو میاسیات تک محدود سمجھتے
 رہے، لہذا ان کو نظر انداز کیا۔ امام صاحب کی بارخ نظری نے
 بجا نہ لیا تھا کہ مسلمانوں میں عام اختلاف اصول میں نہیں فروغ
 میں ہے، لہذا ان میں سے اکثر جزو دین بھی نہیں۔ یہ اختلاف
 لہذا اس کی قدرت علم و حکمت کی اشاعت کے ساتھ کم ہوتی جائے گی
 لہذا چنانچہ مضر بھی نہیں۔ لیکن حقیقی خطرہ دین اسلام کو فلسفہ نظریہ یونان
 و ایمان کی طرف سے ہے اس لیے امام صاحب کی توجہ تا مگر
 اسی کے سبب کی طرف مبذول رہی، لہذا آپ نے نہایت کامیابی
 کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا۔ اس لیے آپ کا لقب "مجتہد اسلام"
 دین اسلام میں آج تک مشہور ہے۔

ابن ایم میں جملہ مسلمانوں کے مختلف فرقے مجادلہ و مباحثہ میں
 مصروف تھے۔ فن خطابت اور جدل اور خلافت بھی اختراع ہوا۔
 اس فن پر کتابیں بھی تصنیف ہوئیں لہذا امام صاحب کی تصانیف
 میں بھی اصول مجادلہ کا ذکر ہے۔ اس میں امام صاحب کے متقدمین
 لہذا بالخصوص بمنصر علماء اہم الحرمین الاموال جوہنی ابو شیخ ابوالسنان
 شیلانی اولین مدرس اعلیٰ ملکہ نظامیہ بغداد کی تصانیف مشہور

ہیں۔ ان میں ان مناظرات کی مفصل تاریخ مکرر ہے جو ان حضرات
 اور دیگر علماء کو اپنے معاصرین علماء سے پیش آئے بالخصوص جامع
 منصوبہ خلیفہ عباسی میں مناظرہ تافسی ابوالطیب و ابوالحسن طاقتالی اور
 مناظرہ ابواسحاق قیسری و ابو عبد اللہ دامغانی اور مناظرہ ابواسحاق و
 ابوالمعالی جوہنی نیشاپور میں اور مناظرہ ابواسحاق اسفراینی و تافسی جلالہ جبار
 معتزلی اور مناظرہ تافسی عبدالطیب و ابوالحسن حنفی وغیرہ ہم۔ شیخ ابواسحاق
 قیسری مدرس نظامیہ کے بارہ میں یہ دعایت مشہور ہے کہ مسائل
 خلافت اس کو اس طرح اذہر تھے جس طرح مسالوں کو سورہ فاتحہ حفظ
 ہے۔ فن خلافت فن مجادلہ کا ایک شعبہ ہے، "من جدل، منطق کی
 پانچ صفتوں "مدہان، اور، خطابتہ، لہ، شعر، لہ، جدل، و مغالطہ" میں سے
 ایک ہے۔ یہ فن ہم صاحب کے زمانہ میں اہم خیال کیا جاتا تھا۔ جو شخص
 اس میں ماہر ہوتا وہ فریق مخالف کو بسہولت نیچا دکھا سکتا تھا۔ ان اہم
 میں ہر ایک فرقہ کے علماء اپنے معتقدات کی تائید میں اسی فن سے
 کام لیتے تھے، یہی فن جدل یا مجادلہ فن خلافت و مناظرہ سے موسوم
 ہوا۔ اباب جدل و مناظرہ نے اس موضوع پر کتابیں لکھیں۔ یہ فن ہر
 ایک علم فقہ و نحو و کلام وغیرہ پر حاوی تھا۔ اور ہر ایک علم پر اسی فن
 کی مدد سے علماء نے کتابیں لکھیں۔ مثلاً خلائیات نحو، اس میں کوثر و بصرہ
 کے نحووں کے اختلاف کے وجوہ بیان کئے گئے۔ "خلائیات فقہ" وہ
 اختلاف حنفی و شافعی یا شیعہ و سنی کے عقاید میں اس کا بیان، اسی
 طرح و خلائیات کلام، میں اختلاف عقاید و مشاعرہ و معتزلہ وغیرہ کا
 مکرر ہے۔ فن جدل کو فن مواضع بھی کہتے ہیں اس لیے کہ جدل اور

مناظرہ تمام عقاید علمی و مذہبی و غیر مذہبی میں ہوتا ہے اور کسی خاص عقیدہ
 سے اس کی بحث محقق نہیں ہے۔ لیکن فنِ خلاف کا عموماً موضوع وہ
 فرعی اختلاف عقاید ہے جو فرقہ شافعیہ و حنفیہ سے تعلق رکھتا ہے
 بعض علماء شیعہ شیخ طوسی نے کتابِ خلاف، میں اور سید مرتضیٰ
 علم الہدیٰ نے کتابِ انتصار، فنِ شیعہ لہسنی کے اختلاف عقاید کو اپنی بحث
 کا موضوع بنایا ہے فنِ خلاف عام ہے لیکن مناظرہ بطریق خاص مجادلہ
 ہے، علماء اس کی تعریف اس طرح کرتے ہیں کہ کسی موضوع میں نظرو
 بحث سے اظہار حقیقت و صواب ہو۔ ہمارے گمان میں اس کو تنقید
 یا نقد نظر بھی کہتے ہیں۔ لیکن مجادلہ کی غرض تو محض اپنی فضیلت لہسنی
 لہ مخاطب کی فضیلت ہی ہوتی ہے۔ اس لیے قرآن میں اس سے منع کیا
 گیا ہے لہ ہدایت ہے کہ اگر ضرورت مجادلہ کی نوبت اُسی جائے
 تو جس کا طریق یہ ہے کہ حکمت لہ موعظتہ حسنہ سے کام لو۔
 مناظرین دو فریق کسی مسئلہ یا موضوع پر بغرض تحقیق بحث کرتے
 ہیں اگر سوال و جواب کی صورت میں بحث ہو تو ایک و سائل لہ دوسرا
 عجیب سے موسم ہوتا دوسری صد میں بھی ہیں ایک شخص اپنے عقیدہ
 یا نظریہ کی تائید میں استدلال عقیدہ و نظیہ سے کام لیتا ہے اور دوسرا
 جواب میں ایک تقریر اس کی تردید میں کرتا ہے ایک استدلال دوسرا
 تالیح سے تعبیر ہوتا ہے۔ لہ ایک دوسرے کا خصم کہلاتا ہے
 اس فن کی اصطلاحات بہت ہیں مثلاً مناقضہ، وہ معارضہ، و دوران دمار و
 ملہاء دلیل و رکن و علت و بشرط و لازم و ملزوم و تعلیل و جرح و غیرہ ہم
 فنِ جہل اہم صاحب کے زمانہ میں مدوں ہو چکا تھا۔ لہ ہم کہ چکے

ہیں کہ اسی فن کا حربہ ہر ایک فرقہ اور فرقہ پرست عالم بے تکلف استعمال
 کر رہا تھا، ابوالعالی جوہی نے کتاب مغیث الملقن فی اختیار الحق، لکھ کر مذہب
 ثانی کو حنفی پر ترجیح دی اور کتاب "فن خلافت میں لکھی۔ علامہ
 ابوالسحاق شیرازی کہتے ہیں کہ "ابن عباس نے یہ فقرہ چھپ
 کیا کہ اگر ثانی اور ابوحنیفہ باہم سازگار ہوں تو ابوالسحاق کا تمام علم نثار
 ہو جائے۔ ابوالسحاق نے اس فقرہ کے جواب میں کتاب "مہذب" تالیف کی
 ابوالسحاق کے علم و فضل کا شہرہ دور دور ہو چکا تھا۔ جب عباسی خلیفہ المقتدی
 بامر اللہ (۸۶-۹۶) نے آپ کو خراسان کی طرف بحیثیت سفیر بھیجا تو
 مرد و زن کا ہجوم شہر سے باہر استقبال کے لیے جمع ہو گیا۔ اور اس
 کی رگاب کو بوسہ دیتے تھے، اور پھر کے سموں کی خاک تبرکاً یتینا
 اٹھاتے۔

اہم محمد غزالی اس فن جملہ وغیرہ سے پورے واقف تھے۔ آپ
 کی تصانیف سے اس کا اندازہ ہو سکتا ہے ابتدا میں خواہ آپ کی
 غرض مجاہدہ عقیدہ توفیق (۱) ہی ہو، لیکن جب
 آپ تیل و مال مدسہ سے بیزار ہو گئے۔ اور طلب حق میں نکلے
 تو غرض تحقیق کے سوا اور کچھ نہ تھی۔ اس لیے آپ لکھتے ہیں کہ مجاہدہ
 میں جذبہ مخالفت کے تحت ایسی باتوں کی تردید پر بھی اتر آتے ہیں۔
 جن کی صداقت بہانہ ثابت شدہ ہے۔ یہ نہایت مذموم طریقہ مناظرہ
 ہے۔ اس لیے ہم صاحب کسی مسئلہ سے مناظرہ پسند نہ فرماتے
 ہو ہمیشہ عقیدہ کو بطور دلیل پیش کرتا ہے۔
 چہ نانی بحرف کساں خامہ فارحہ حریے ز تحقیق خود ہم برآہ

ہم صاحب تقلید کو اگرچہ ایک ناگزیر امر سمجھتے تھے مگر تقلید بہ نظر تحقیق
 اور شبہ سے اہل تقلید کو رانہ اور چیز ہے اس اندھا و حند تقلید کے
 ہم صاحب سخت مخالف تھے۔

انکاری غیر باش تصدق ایسا ^{ست} ماکر و بدل دلیل تو فنیق این است
 تبیت خلق از سخت غافل کہ ترک تقلید گیر تحقیق این است

د بینا

علاوہ مجادلہ و مباحثہ و مناظرہ علمی و مذہبی ہم صاحب کے زمانہ کی چند
 اہم بھی تاریخی خصوصیات ہیں۔ ایک رواج دعوت و باطنیہ ہے، باطنیہ یا
 اسماعیلیہ فرقہ شیعہ ہے۔ حضرت امام جعفر صادق تک تو تمام فرقہ شیعہ
 کا اتفاق ہے۔ مگر آپ کے بعد مسئلہ امامت و خلافت پر ان کا اختلاف
 بہت ہے۔ باطنیہ یا اسماعیلیہ یہ کہتے ہیں کہ امامت کا
 حضرت جعفر صادق کے بڑے بیٹے اسماعیل کو پہنچا ہے شیعہ امامیہ یہ
 کہتے ہیں کہ حضرت امام نے اسماعیل کو عاق کر دیا تھا اور وہ باپ کی
 زندگی ہی میں فوت ہو گیا تھا۔ بعد حضرت امام نے اپنا خلیفہ و جانشین
 بیٹے موسیٰ کاظم کو نامزد کیا تھا۔ حضرت موسیٰ کاظم کے بعد آپ
 کی اولاد سلاسل بعد نسل منصب امامت کی مستحق ہے اور اس منصب
 پر ممکن رہی فرقہ امامیہ و دوازده اماماں حضرت علی سے محمد المہدی بن
 ہم عسکریٰ کو اماماں برحق تسلیم کرتے ہیں، یہ سب ہم سیاسیات
 سے بالکل الگ تعلق ہے۔ لیکن اسماعیلیہ میدان سیاسیات میں
 کود پڑے ان کا حریت خلافت عباسیہ تھی۔ جس کا مذہب عجمت
 و سنت تھا۔ چونکہ وہ خلفاء عباسیہ کے مخالف سیاسی اغراض کی

بنا پر تھے اس لیے مورخین نے یہ بھیجا کہ وہ سہرے سے اس مذہب
 کے مخالف تھے جو خلفاء عباسیہ کا تھا۔ اسماعیلیہ سنیوں کے ایسے
 ہی مخالف تھے جیسے شیعہ امامیہ کے۔ ہم نے باطنیہ کے عقاید پر
 اپنی کتاب "مذہب اسلامیہ" میں مفصل بحث کی ہے اس لیے
 بتادہ کی ضرورت نہیں۔ اتنا اشارہ کافی ہے کہ اس فرقہ کے کئی نام
 مختلف بلاد اسلامیہ میں مختلف وجوہ پر مشہور تھے ان کو فاطمیہ اور
 علویہ اور باطنیہ و اسماعیلیہ و شیعہ (علی الرغم شیعہ اثنا عشریہ) اور
 ملاحدہ کہتے۔ حسن بن صباح انہی کا داعی تھا۔ اور اس کے مدعاویوں
 نے سوانح نظام الملک اور دیگر وزرا و امرا و بعض سلاطین کو قتل کیا۔
 ان کو "حاشین" بھی کہتے ہیں اور انگریزی میں بھی لفظ تھوڑے
 سے تغیر کے ساتھ (ASSASSIN) ہے جس کے معنی قاتل سفاک
 ہے۔ حبش بھنگ کو کہتے ہیں، غالباً حسن بن صباح کو اس بول
 اور اس کے نشہ اور اثر کا عظم ہندوستان کے جوگیوں کے ذریعہ
 ہوا۔ طمان تک وادی سندھ پر قبضہ مسالوں کا خلافت اموی
 میں ہو چکا تھا۔ سندھ میں بھنگ آج بھی عام استعمال ہوتی ہے
 یہی حبش پلا کر حسن اپنے مریدوں کو وہ سبز باغ دکھاتا کہ وہ اس
 کے نڈائی بن گئے، یہ ہم غزالی کا معصر تھا۔
 ہمیری خصوصیت اہم صاحب کے زمانہ کی حروب الصبیہ
 ہیں۔ یورپ کے مورخین کے علاوہ ملتان مورخین میں سے
 این اشیر نے "کابل" میں لود پانسی نے "مراۃ الجمان" میں اور ذہبی
 نے "دل الاسلام" میں ان کا تذکرہ مفصل لکھا ہے۔ یہ ایک مستقل موضوع

جے۔ ادھر جنگ صلیب کا آغاز ہو رہا تھا ادھر اہم صاحب اس
 فتنہ و شر و فساد سے گزارہ کش ریاضت و ذکر و فکر میں مشغول تھے
 عروب الصلیبہ بظاہر مذہبی مگر وہ اصل سیاسی جنگ تھا لہذا یورپ
 کے مسلمانان بلاد اسلامیہ میں تھی۔ مگر تحقیقی جنگ دینی فلسفہ یونان
 و اسلام کے درمیان تھی۔ اول الذکر جنگ میں اہم صاحب نے حصہ
 نہیں لیا مگر آخر الذکر جنگ میں مسلمانوں کی قیادت کی۔ اس
 ہر کے لا بہرہ کا سہ ماخذ افشش را درویش انداختند

فلسفہ

خلافت راشدہ اور تابعین کا دور اس دینی تہذیب سے متعلق ہے جو
 دسویں صدی ہجری کے آغاز میں شروع ہوا۔ مسلمان مصر اور شام
 اور ایران وسط ایشیا اور افغانستان اور بلوچستان اور داعی سندھ
 تا ملتان سفر کر چکے تھے خلافت راشدہ کے بعد اموی خلافت خالص عرب
 حکومت تھی۔ ان کی زندگی سپہ بیاض تھی، بلحاظ عقاید موجود تھے، توحید
 پر پختہ ایمان تھا اور میدھے سادہ ارکان اسلام صلوات صوم و حج و زکوٰۃ
 کے سوا اور کچھ ان کے اعمال میں تصنع نظر نہیں آتا تھا۔

جب غیر مسلم اقوام سے ان کا تصادم ہوا۔ اور حکومت ممالک
 مذکورہ پر بالاستقلال قائم ہو گئی لہذا اس کا دور شروع ہوا تو ان
 کی توجہ ان غیر مسلم اقوام کی تہذیب و تمدن و ثقافت کی طرف بھی ہوئی
 ان میں سے یونانی اور ایرانی لہذا ہماری فلسفہ قابل فکر ہے۔ ان
 تینوں اقوام کا فلسفہ دور اسلامی سے بہت عرصہ پیشتر ایک دوسرے

یہ اثر انداز ہو چکا تھا۔ مسلمانوں کی توجہ بالخصوص یونانی فلسفہ کی طرف
 ہوئی جس کو افلاطون اور ارسطو مدون کر چکے تھے، اس کی ایک
 خاص وجہ یہ تھی کہ یونانی جو خلافت راشدہ کے دور میں شام و مصر
 اور عراق کے کچھ حصہ پر مسلط تھے مسیحیت اختیار کر چکے تھے۔ یہ مذہب
 مسیحی پولوس کی اختراع تھی اور سواریان مسیح کا دین نہ تھا جو غیر بنی
 اسرائیل میں اشاعت دین جائز نہیں کہتے تھے، پولوس جو نہ سواریا
 تھا اور نہ سواریوں کی صحبت کا یافتہ تھا وہی رسالت دین مسیحی تھا اس
 نے رومیوں اور یونانیوں میں اس مسیحیت کا نہ پرچارہ کیا جو بقول
 فرانسیسی مصلح ریمان اس کی اپنی اختراع تھی اور اصطلاح "مسیحیت"
 بھی اس کی اپنی ایجاد تھی۔ سواریا اپنے آپ کو "مومنین" اور اخوان
 ہی کہتے، مہر حال جب مسلمانوں کا تعارف ان سے ہوا تو ان کو اہل
 کتاب سمجھتے ہوئے حضرت مسیح علیہ السلام کا پیرو یقین کیا،
 توراہ و انجیل کا احترام تو واجب ہی تھا ان کے خود ساختہ عقاید کو
 بھی دین مسیحی کا جزو ہی سمجھا۔ حالانکہ کچھ تو پولوس اور کچھ فلسفہ یونان
 و روم سے اس کی صورت بہت کچھ مسخ ہو چکی تھی صرف ایک
 مسیح کا نام تھا جس کی آڑ میں اس کی اشاعت ہو رہی تھی۔ یہی وجہ
 ہے کہ مسلمانوں نے یونانیوں کو اہل کتاب اور نصاریٰ سمجھ کر ان
 کی طرف بالخصوص زیادہ توجہ مبذول کی، اور ان کے ذریعہ فلسفہ یونان
 سے بھی واقف ہوئے۔ ایک خیالی یہ ہوئی کہ جس طرح آج ہم
 یونانی فلسفیوں کی تصانیف سے واقف ہیں ان ایام میں عرب
 واقف نہ تھے اور نہ ہو سکتے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خود

یونانی اسے قراؤش کر چکے تھے۔ پہلی دفعہ ہسپانیہ میں وہیں زرد
 وغیرہ نے ارسطو کی کتب بعد تصحیح عربی میں شائع کیں اور یورپ
 بھی ان سے روشناس ہوا لیکن بعض علم منطق و ہندسہ وغیرہ
 شائع ہو چکے تھے لہذا مسلمان علماء حکما ان سے نہ صرف پوری طرح
 واقف تھے بلکہ اس پر کچھ اضافہ بھی کر رہے تھے۔

جہاں تک خالص فلسفہ کا تعلق ہے یہی سہروردت ہماری بحث
 کا موضوع ہے، جب مسلمان علماء نے ان کا مطالعہ کیا تو مذہب سے
 الگ ہو کر دیکھا لہذا بھی نہ سکتے تھے۔ کیونکہ ایک دین اسلام ہی ان
 کا لٹھنا اور بچھونا تھا لہذا ان کی زندگی کا تار پودا تھا۔ فلسفہ کی بنیاد
 عقائد پر تھی۔ لہذا اسلام خود منکر و تدبر و تفکر و دعوت دے رہا تھا۔
 اس لیے سب سے پہلے مسلمان علماء نے اپنے عقائد مروجہ کو اسی
 عقلی فلسفہ کے تراژو میں ڈالا۔ تو پورے نہ اترے، پہلی غلطی ان سے
 یہ ہوئی کہ اس فلسفہ کے تراژو کو انہوں نے صحیح تصور کیا۔ اہم محمد غزالی
 نے سب سے پہلے مسلمانوں کو اسی غلطی کی طرف توجہ دلائی لیکن
 اہم صاحب سے پیشتر مسلمانوں میں ایک فلسفی فرقہ معتزلہ کی بنیاد
 پڑ چکی تھی۔ بلکہ خلفاء عباسیہ میں سے ہاموں رشید لہذا آٹھواں خلیفہ
 مسم معتزل تھا۔ جب اس مذہب کو حکومت کی سرپرستی حاصل ہوئی
 تو اس کی اشاعت ممالک اسلامی میں خاطر خواہ ہوئی۔ لہذا یہ مسئلہ
 حدت و قدم و خلق قرآن اس حد تک دیر بحث رہا کہ اکثر ائمہ دین
 مصیبت میں مبتلا ہو گئے۔ لہذا طرح طرح کی عقوبت میں گرفتار ہوئے
 لیکن جب القادر باللہ عباسی دمشق سے خلافت کا دور آیا تو

انہوں نے اطمینان کا سانس پا لیا کیونکہ حلیفہ کا عقیدہ دوبارہ خلقِ قرآن
 معتزلہ کے خلاف تھا۔ اور اس لیے خود اس نے اس عقیدہ کے رد
 لہ بطلان میں ایک کتاب لکھی۔ اب رد عمل شروع ہوا تو معتزلہ
 عتاب میں آگئے۔ معتزلہ کے مقابلہ میں علماء حدیث تھے اور انہی
 کی ایک شاخ، اشعری تھے، یہ لوگ علی بن اسماعیل اشعری کے
 پیرو تھے، علی ابو موسیٰ اشعری صحابی کی اولاد سے تھا۔ معتزلہ اور
 اشعریہ بھی فرقہ حد فرقہ تقسیم ہو گئے۔ اور ہر ایک فرقہ ایک دوسرے
 سے مجادلہ میں الجھا ہوا تھا اور جذبہ مخالفت کے تحت ایک دوسرے
 کی تکفیر کرتا تھا۔

ہم صاحب ان تمام فرقوں اور ان عقاید اور ان کے مناظروں
 سے خوب واقف تھے۔ ابتدا میں خود بھی اشعریہ کی حمایت میں
 حصہ لیتے رہے۔ آخر ان پر ان مناظروں کی بہبود کی اور فرقہ بندی
 اور شرائیکہ فرقہ کے اسباب واضح ہوئے تو کنارہ کش ہو گئے
 یہ مذاہب جو لائح الوقت تھے تو ایک فقہاء کے تفرقہ کے اختلاف
 کی وجہ سے ظہور میں آئے لیکن اس میں کچھ قباحت نہ تھی۔
 کفر عقلی تھا اور اختلاف رائے ناگزیر امر تھا۔ یہ کچھ ایسی بات
 دینی کہ مسلمان فقہاء کے اجتہادات عقیدہ کے اختلاف پر دست و
 گریبان ہوں، نہ یہ مکی آسمانی تھی کہ جس کے قبول کرنے پر ملکوت
 ہوں ایک فقہ کا شخصی عقلی اجتہاد ہی تھا۔ اور ہر ایک دلیل رائے کا
 حق تھا کہ اس کی تائید یا تردید کرے یا اپنا اجتہاد پیش کرے۔
 چہ خوش است کہ نمک تجربہ آید میاں تاسیہ توئے بود ہر کہ مدغش باشد

امام صاحب خود مجتہد تھے اور آپ نے تحقیق کے بعد معلوم کر
 لیا کہ تفرقہ اور فرقہ بندی کے اسباب میں سے ایک تو یہی اجتہاد
 فقہاء کا اختلاف ہے۔ یہ دو قسم کا تھا ایک عقلی اور دوسرا نقلی۔
 جو لوگ عقلی اجتہاد کرتے وہ مسائل قرآن کی آیات اور اپنے تدریس
 فکر سے کرتے، یہ اہل الرائے کہلائے اور ان کے امام ابو حنیفہ
 نفاق بن ثابت کوئی تھے۔ (دستخط ۸۰-۱۵۰) دوسرے مہایات
 سے فقہی مسائل اخذ کرتے یہ اہل حدیث تھے یہ امام عبداللہ بن محمد
 بن ادریس شافعی (متوفی ۱۸۰ھ) اور مالک بن انس (متوفی ۱۷۹ھ)
 اور امام احمد بن حنبل (متوفی ۲۴۱ھ) کے پیرو تھے۔ ان حضرات کا
 اختلاف جو بھی تھا وہ فرقہ فقہی مسائل میں تھا۔ اصل پر سب کا اتفاق
 تھا۔ امام محمد غزالی نے ان کے اخلاقیات کو نظر انداز کر دیا مگر جیسا
 کہ ہم لکھ چکے ہیں خراساں میں ملک شافعی اور طریقہ اشرفی رائج
 تھا اور امام محمد غزالی کی تعلیم و تربیت امام الحرمین کے تحت اسی مذہب
 اور طریقہ پر ہوئی۔ اگرچہ یہ آپ کی زندگی کا اجمالی وعدہ تھا مگر اس
 کا نقش آنا گہرا ہو چکا تھا کہ آپ کی تصانیف میں میلان طبع
 نیاہے تو اسی طرف پایا جاتا ہے۔ لیکن اگر مذہب شافعی یا ابو حنیفہ میں
 کوئی بات صریحاً مخالف عقل معلوم ہوتی تو رد کرتے۔ اسد مدینہ
 نے ایک روز دریافت کیا کہ آپ کا مذہب ابو حنیفہ کا ہے یا
 شافعی کا جواب دیا کہ عقلیات میں میرا مذہب مدہان ہے اور
 شریعات میں قرآن، ابو حنیفہ کا اجتہاد میرے لیے ہے۔ امام
 اور مذہب شافعی کی فقہ غرض، بحیثیت محقق آپ کا ملک یہ تھا کہ خدا

مناظرہ کا کدو۔ اور پھر تو یہ ہے کہ اہم صاحب کو ان فقہاء کے اجتہاد کی طرف رجوع کی ضرورت نہ تھی۔

ان اہم میں جبکہ مناظرہ کا میدان گرم تھا اور علماء کو اگر کوئی اعزازی امتیاز حاصل تھا تو اسی نسبت سے کہ کون مخالف فریق کو بچھاؤں تا ہے۔ اہم صاحب نے مجاہدہ قطعاً ترک کر دیا تھا۔ بلکہ ایک شخص جو آپ کو مناظرہ میں الجھانا چاہتا اسے اہم صاحب نے یہ کہہ کر مایوس کر دیا کہ یہ فن میں نے عراق کے لائڈوں کی تفریح کے لیے چھوڑ رکھا ہے۔ یعنی مناظرہ کا شوق ہو تو علماء عراق سے کرو۔ آپ حضرت ابراہیم کے مزار پر دو دفعہ فاتحہ خوانی کے لیے گئے اور یہ عہد کیا کہ کسی امیر فزیر کے دروہت پر نہیں جاؤں گا۔ (۱۲) کسی امیر فزیر کا عطیہ وغیرہ قبول نہ کروں گا (۱۳) کسی سے مباحثہ نہ کروں گا۔ فزیر خواجہ فخر الملک دین خواجہ نظام الملک کے اصرار اور احباب کی درخواست کا آپ کا اثر نہ ہوا کہ پھر سے مدسہ نظامیہ نیشاپور میں سندہ تدلیس جانی رکھیں لیکن روپاد میں ہدایت ہوئی کہ خلق خدا کا فائدہ اسی میں ہے اس لیے مدسہ میں درس شروع کر دیا علاء عصر نے شوق مچایا کہ خزانہ طہرانہ عقاید طلباء کے دماغ میں ٹھونس رہا ہے۔ اور بار بار مناظرہ کی دعوت دی لیکن اہم صاحب اپنے عہدہ پر قائم رہے اور بالکل خاموش رہے۔ اب علاء نے حکم نیشاپور کو بھڑکایا اور درخواست کی کہ خزانہ کو ہمارے ساتھ مناظرہ پر مجبور کیا جائے۔ چنانچہ حکم نے آپ کو علاء کی موجودگی میں طلب کیا۔ اہم صاحب کو مجبوراً آنا پڑا۔ حکم نے کہا کہ آپ کو علاء کے

مطالبہ کا علم ہے کس لیے مناظرہ سے گریز کرتے ہیں۔ لودا اگر
 یہ سمجھتے ہیں کہ علاؤ سخی پر ہیں تو اپنی قلعی تسلیم کریں، لودا اگر یقین
 ہے کہ آپ ہی سخی پر ہیں تو علاؤ کو قائل کریں۔ آپ نے فرمایا
 کہ بات یہ ہے میں نے حضرت خلیل اللہ کے مزار پر عین عہد کیے
 تھے لودا ان پر آج تک قائم ہوں۔ ان میں سے ایک یہ تھا
 کہ کسی امیر و وزیر کے مدد و دولت پر نہ جاؤں گا۔ اقل الامر کی اطاعت
 واجب ہے آپ نے طلب فرمایا میں حاضر ہو گیا۔ میں خود اپنی
 مرضی سے نہیں آیا۔ دوسرا عہد یہ تھا کہ کسی سے مباحثہ نہیں
 کروں گا۔ آپ مجبور کر رہے ہیں، اس لیے میرے وہ عہد تو آپ کی وجہ
 سے لودا ان علاؤ کے شور و غضب سے ٹوٹے۔ اگر آپ مجبور کریں
 تو میرے لیے کیا عند بائی نہ جاتا ہے۔ سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ
 کے حضور اپنی لودا سب کی بخشش کی دعا مانگوں، پھر علاؤ کی طرف
 اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ سبحان اللہ، میرے ستر اس وقت تک
 تحصیل علم میں بسر ہوئی۔ ان علاؤ میں سے ایک بھی ایسا نہیں جس
 نے تحصیل علم میں میری طرح محنت کی ہو۔ غرض اہم صاحب نے
 جو تقریر اس وقت فرمائی اس کا اثر حاکم پر خاطر خواہ ہوا۔ مسندت
 کی لودا نہایت احترام سے رخصت کیا۔

رسیدہ بود بلائے دلی بخر گذشت

ام صاحب کے ہمعصر علاؤ تو بہت ہیں اور اگر صاحب تصنیف
 بھی ہیں، ان میں سے ایک علامہ زرخشری صاحب تفسیر کشف ہیں
 شیخ بھائی نے کتاب کفول میں یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ علامہ صاحب

کے پاس گیا اور تفسیر کے کچھ حصے پیش کیے۔ اہم صاحب نے کہا کہ آپ علماء
 تشریحی میں سے ہیں۔ علامہ مدت العمر اس بات پر نخر کرتے رہے
 کہ غزالی نے مجھے علماء میں شمار کیا ہے۔ علامہ کی وفات ۵۲۵ھ میں
 ہوئی اور اہم صاحب ۵۲۵ھ میں فوت ہوئے۔ ابوالفتح اسعد بن
 میمنی فن خلاف و مناظرہ مشہور تھا۔ اور اہم صاحب کا مخالف تھا۔
 اہم صاحب کو مناظرہ میں الجھانا چاہا اور پہلے یہ سوال کیا کہ آپ حنفی ہیں
 یا شافعی آپ نے کہا کہ میرا مذہب عقلیات میں برہان اور شرعیات میں
 قرآن ہے ابو حنیفہ اور شافعی میرے لیے کوئی سند نہیں۔ سند نہیں
 جھانکنے لگا کہ اب بحث کس مذہب کے نقطہ نظر سے کرے۔ جو
 شخص مذاہب سے بالاتر ہے اسے کیسے نیچا دکھائے۔ اسی
 طرح ابوبکر طوسی محمد بن اسد بن محمد اندلسی جو فقہائے مالکیہ میں
 ممتاز تھا اور ابن ابی رندقہ کی کتب سے مشہور ہے ۵۲۰-۵۲۱ھ
 اہم صاحب کا مخالف تھا۔ اہم صاحب کی شہرہ آفاق کتب احیاء العلم
 الدین کے جواب میں ایک کتاب بھی لکھی۔ ختم میں اہم صاحب سے ملا۔
 اور کوشش کی کہ بساط مناظرہ بچھائے۔ اہم صاحب نے فرمایا
 و ترکناہ بصیۃ فی العراق: ابن خاکان نے یہ واقعہ روایت کیا ہے
 مناظرہ میں عموماً دو پہلوں کاٹھہ میں اترتے ہیں اور کچھ زور بازو
 اور کچھ طاقت سے حریف کو بچھاڑنا چاہتے ہیں۔ آج تک کبھی
 کسی نے بغرض تحقیق مناظرہ نہیں کیا اور نہ فریق مخالف کے دلائل
 کی صداقت تسلیم کی، البتہ بحث کی گرمی میں نوبت تو تو میں میں سے
 بعض اوقات اہم و کاف تک پہنچ جاتی ہے اور نتیجہ سوائے عداوت

وغیرہ لوہ کچھ نہیں ہونا۔ عبدالقادر بدایونی اپنی منتخب التاریخ میں
 ابر کے حالات میں لکھتا ہے کہ ابر یہ چاہتا تھا کہ متضاد و فریق کے
 اختلافی مسائل عطا مکارہ علمی سے فیصلہ کریں اور کسی ایک بات پر
 اتفاق کریں اس لیے مملکت کے منتخب نامیدہ علماء دین کو
 دعوت عطا کہ مجلس مذاکرہ علمیہ میں بیٹھ کر مناظرہ کریں۔ ہر ایک
 علم اپنا تفوق اور فضیلت جتانا چاہتا تھا۔ اگر ایک کسی امر کو جائز
 کہتا تو دوسرا ناجائز قرار دیتا، ایک خلال کہتا تو دوسرا حرام دعایتوں
 سے ثابت کرتا یہاں تک تو خبر تھی، بحث کی گئی میں ایسے
 ناشائستہ کلمات ایک دوسرے کے حق میں کہتا کہ ابر کی موجودگی کا
 کا بھی پاس نہ رہا ابر کو کہتا پڑا کہ جو شخص آداب مناظرہ کو ملحوظ نہ
 رکھے گا اس مجلس سے نکلوا دیا جائے گا۔ بدایونی لکھتا ہے کہ
 میں ابر کے قریب ہی بیٹھا ہوا تھا میں نے دلی آواز سے کہا
 کہ پھر تو سب ہی اس لائق ہیں کہ نکلوا دیے جائیں، یہ ذہنیت
 ہمارے علماء دین کی ہر ایک نشانہ میں رہی ہے لوہ آج تک
 اس میں فرق نہیں آیا۔ اد خولیشن گم است کرا رہبری کند۔ ان
 حضرات نے علم محض جہل کا ایک آلہ تصور کر رکھا ہے۔
 لوہ جو عقیدہ تمدان کے پیرو ہیں وہ ایک دوسرے سے دست و
 گریبان ہوتے ہیں۔ لوہ ایک دوسرے کی تکفیر کرتے ہیں۔ ظاہر
 ہے کہ اگر ان کا فتویٰ ایک دوسرے کے حق میں صحیح ہے
 تو ان میں سے ایک بھی مسلمان نہیں۔

ان علماء کا ہم مملکوں میں اتا ہے مگر ان کو وہ قبولیت

کبھی مائل نہیں ہوئی جو اہم صاحب کے حصر میں آئی اگر آپ
 بھی انہی کی روش اختیار کرتے تو شاید مشاہیر میں آپ کا شمار
 نہ ہوتا۔ آپ مسلمانوں سے نہیں لہجے لیکن دشمنان دین کے مقابلہ
 میں مردانہ فار سینہ پھر ہوئے۔ لہذا انہی ہمتیادوں سے کام لیا
 جو مخالفت اسلام کے خلاف استعمال کر سکتے، یہ ہمتیاد علم
 کلام ہے۔

ابتداء میں ہمارے سلف صالحین فلسفہ لود علم کلام کی خدمت دل
 کھل کر کرتے رہے لہذا مسلمانوں کو اس سے باز رکھتے مگر جب
 دیکھا کہ اس کی طرف لوگ خود بخود کھینچے آتے ہیں تو کچھ نرم پڑ گئے
 ہم شافعی نے اتنا کہہ دیا کہ خاص خاص آدمیوں کو ممانعت کے لئے
 اگر فلسفہ سیکھنا پڑے تو قیامت نہیں لیکن عوام کو پھر یحییٰ نعمی سے
 باز رکھتے۔ جب رفتہ رفتہ علم کلام عام ہو گیا تو اس کی بنا پر مناظرہ
 پرفرن شریف بھجا گیا۔ اہم صاحب کے زمانہ میں تو اس کو خاص
 اہمیت حاصل ہو چکی تھی، اہم صاحب نے فلسفہ کا رد فلسفہ ہی سے
 کیا یہ پر لطف کہانی آپ خود اہم صاحب کی کہانی سنیں۔ لیکن چہ
 یہ حقیقت بھی طرح ذہن لہین کر لیں کہ فلسفہ ارسطو کو شائع کرنے
 والے خود مسلمان تھے۔ ۱۲۳۱ء میں ارسطو کی تصانیف نے سینا دمتونی
 ۱۲۳۱ء میں اہم صاحب کے زمانہ تک اس کا لود لود قوت
 اس حد تک تسلیم شدہ تھی کہ علاوہ اسلام اس سد سلسلہ میں رخنہ
 نہیں ڈال سکے۔ ہم صاحب نے اسے گرا کر خاک میں ملا دیا۔
 قرآن عظیم کا ارشاد ہے کہ دشمنان دین اللہ اور اپنے دشمنوں

کے مقابلہ میں ہر ممکن قوت فراہم کرو اور اس کا مظاہرہ بھی کرو۔
 آنحضرتؐ نے اس آیہ کریمہ سے اجتہاد فرمایا کہ قوت تیروں میں
 بیے۔ ان ایم میں تیرہی کام دے دیتے جو ہمارے
 زمانہ میں توہیں ابدیم دے رہی ہیں۔ تیر کچھ آنحضرتؐ کی اختراع
 تھے، اس لیے ہر ممکن قوت میں وہ تمام اسباب قوت شامل ہیں
 جو دشمن استعمال کر رہا ہو اور ان کے ذریعہ غلبہ بھی حاصل کرتا ہو۔
 اہم صاحب کے زمانہ میں فلسفہ ہی بہت بڑی قوت استدلالیہ تھی
 اور ہمارے علا اس کے مقابلہ میں ٹھہر نہیں سکتے تھے، ان کے
 پاس یہ کارگر حربہ نہ تھا جو دشمن بے تکلف استعمال کر رہا تھا۔
 اہم صاحب نے پہلے اس حربہ پر قبضہ کیا اور اس کو استعمال کرنا
 سیکھا، اور اس خوبی سے استعمال کیا کہ دشمن نے ہتھیار ڈال دئے
 آپ نے پہلے آثار اوسطہ و قاطبانی و ابن سینا و رسائل اخوان الصفا
 کا بہ نظریہ خارج مطالعہ کیا۔

پوچھی بھری کے وسط میں ایک نخیہ انجن بصرہ میں قائم
 کی گئی۔ اس انجن کے اداکین بلاشبہ بلند پایہ علماء تھے جو فلسفہ سے
 خوب واقف تھے۔ اس بحیثیت کا نام انہوں نے اخوان الصفا رکھا
 ان کا مقصد یہ تھا کہ دین اسلام میں خرافات اور اہم کی آمیزش
 بہت بڑی حد تک ہو چکی ہے اس کو غلطی سے پاک و
 صاف کیا جائے اور فلسفہ ہی ایک ایسی شے ہے جس کے ذریعہ
 یہ کثافت ہٹا ہو سکتی ہے اور یہ کہ شریعت اسلام اس وقت
 کمال کو پہنچی گی جب فلسفہ بھی اس کا یار و یاور ہو۔ مقصد اخوان الصفا

صرف اتنا ہی ہے کہ شریعت کی موافقت فلسفہ سے ہو اور اسی موافقت کے ساتھ وہ ہم کٹا فیتہ جو اس میں شامل ہو گئی ہیں دور کی جا میں اور اسلام اپنی صورت میں پیش کیا جائے کہ اہل عقل و حکمت اسے قبول کریں۔ اخوان الصفا نے اس بات کی بھی تصریح کر دی کہ خود فلسفہ چونکہ غیر اقسام کی ناموس زبان سے عربی میں ترجمہ ہوئی ہے اس کے حقائق عام فہم نہیں لہذا اس میں بہت کچھ تخریج کی گئی ہے۔ اس لیے اخوان الصفا کا مقصد یہ بھی ہے کہ اس کو اہل صورت میں پیش کریں اور اس کے مقاصد واضح کریں اور عام فہم زبان میں بیان کریں۔

ظاہر مقصد جو رسائل میں بار بار واضح کیا گیا ہے یہی کچھ تھا اور اگر اس کی تہ میں کچھ غرض پوشیدہ تھی۔ تو اس کا علم کسی کو نہ ہوا لہذا اب تک ظاہر ہوا۔ اس انجمن کا صد مقام بصرہ لہذا بغداد میں تھا۔ اس کے اراکین کا نام اور ان کے حالات بھی صیغہ ناز میں ہیں۔ اسے اور آج تک معلوم نہ ہو سکا کہ یہ رسائل جن کی تعداد اکاون ہے کس نے لکھے، لیکن ان میں مختلف علوم و فنون مرویہ پر محققانہ بحث کی گئی ہے۔ اور مہارت، مذہبی اور تاریخی مہاسب اور شریعت وغیرہ پر بھی بحث ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اخوان الصفا کا ہے گا ہے کسی موضوع کو انفرادی و اجتماعی حیثیت میں زیر بحث لانے اور کچھ اس تحقیق کا نتیجہ ہوتا اس کو ایک رسالہ کی صورت میں خارج کرنے۔ غالباً افکار تو سب اخوان کے تھے مگر قلم بند کرنے والا ایک ہی ہوتا۔ یہ کئی کئی بار نہ تھی علامہ یہود نے بھی "تلمود"

دقتوں کی تدوین مگر یہ محض مذہبی تھی اسی طرح کی تھی۔ مگر علا یہود کے نام و حالات تو ہمیں معلوم ہیں انخوان الصفا کی شخصیت گوشہ گشائی ہی میں رہی، کی توجہ بظاہر یہی ہے کہ

حلی نہ جنگ و جدہ پر تقرر می کنند۔ نہ ہاں خود بیادہ کہ تکفیری کنند

رسائل انخوان الصفا کا ترجمہ یورپ کی زبانوں اور کچھ حصہ اردو اور فارسی میں ہو چکا ہے۔ مگر الحمد للہ کے اداریں عمر میں پڑھے تھے۔

اردو مصر اور ہندوستان میں کئی دفعہ طبع ہوئے۔ پچاس مقالے فنون طبیعی و ریاضی و الہیات اور مسائل عقیدہ فلسفہ و اجتماعی مساشرت وغیرہ پر مشتمل ہیں اور ایک خود انخوان الصفا کے بارہ میں ہے کہ اس انجمن کا رکن کن شرائط پر کوئی شخص ہو سکتا ہے اور اراکین کا برتاؤ باہمی کیا ہوا چاہئے وغیرہ وغیرہ۔ انخوان الصفا کے مؤثر پروج ترقی یافتہ ممالک یورپ اور امریکہ میں بے شمار انجمنیں قائم ہیں جو علوم و فنون کی اشاعت میں سرگرم ہیں اور ان کے مقالات "الکلیہ پیڈیا" کی صورت میں شائع ہو رہے ہیں۔ رسائل انخوان الصفا کے مطالعہ سے ایک بات بالکل واضح ہے کہ ان ایم میں مسلمانوں کا ذہنی ارتقا اس مقام تک پہنچ چکا تھا کہ آج بھی انکی تحقیق پر اضافہ بہت کم ہوا ہے۔

اگرچہ مولفین رسائل نے اپنا نام ظاہر نہیں کیا مگر انسان راز جو واقع ہے اور قیاس کیا گیا ہے کہ اس عصر کے غلامی ہیں ایسے بلند پایہ اخصاص مولف ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ ان میں سے ہارچ اخصاص کے نام حسب ذیل ہیں۔

(۱) - ابوسلیمان محمد بن سہولستی معروف بہ "مقدسی" منطقی۔

(۲) ابوالحسن علی بن ہارون زنجانی سیابی۔

(۳) ابوالحمد مہر چانی۔

(۴) عرفی احبیدی۔

(۵) زید بن رفاعہ۔

خطیب بغدادی اور شہر اذری تاریخ حکماء میں اور دیگر مورخین ان مشاہیرین کا تذکرہ لکھتے ہیں۔ ایک سو سال بعد ابوالحکم عمرو بن عبدالرحمن کرمانی نے بلادِ اسپانیہ میں ان رسائل کو شائع کیا۔ یہاں پہلے ہی فلسفہ کا زور تھا۔ اس لئے علماء اسلام کی توجہ خاص کر ان کے مطالعہ اور ان کے موضوع کو زیر بحث لانے پر لگ گئی۔ لوگ غلط فہمی سے یہ سمجھتے رہے کہ ان کا مصنف یہی شخص ہے۔ ابوالحسن علی بن یوسف قسطنطینی تاریخ الحکماء میں روایت کرتا ہے کہ ابو جہاں توحیدی لکھتا ہے کہ وزیر مصمام الدولہ یعنی ابو عبد اللہ بن سعدانی (متوفی ۳۵۷ھ) نے زید بن رفاعہ (مجموعہ مولف رسائل کے بارہ میں ۳۴۳ھ میں بعید سے دریافت کیا۔ ہم نے انخوان الصفا اور ان کی انجمن اور رسائل جہاں تک مجھے علم تھا بتائے اور یہ بھی کہا کہ ہم نے اپنے استاد ابوسلیمان منطقی (مجموعہ مولف رسائل) سے بھی ان رسائل کے بارہ میں اس کی رائے دریافت کی تو اس نے کہا کہ ان مؤلفین کی کوشش یہ ہے کہ دین کو فلسفہ سے مطابقت کریں حالانکہ ان میں باہمی مطابقت نہیں ہو سکتی کیونکہ دونوں کا مقصد اور نظریہ مختلف ہے۔ ان واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یا تو مؤلفین ہمارے ان کے فری میں کی طرح اپنی شخصیت بحیثیت مولف پوشیدہ رکھنا چاہتے تھے یا یہ مولف دتے بعض

قیاس اٹائی پر لوگوں نے ان مسائل کی تالیف ان سے منسوب کر دی
لیکن اس میں کچھ کلام نہیں کہ فرقہ معتزلہ ان مسائل کی اشاعت
میں نہایت سرگرم رہا۔ لہذا قیاس غالب یہ ہے کہ اسی فرقہ کے
علماء ان مسائل کے مولف تھے۔

غرض ہم صاحب کے زمانہ میں فلسفہ اور ایسی کتب جیسی کہ رسائل ابن خلدون
ہیں ان کی اشاعت ہو چکی تھی اس میں تو کچھ کلام نہیں کہ عقائد
کالم و بیش ہر ایک قوم و ملت میں دخل جہاں تک دین کا تعلق ہے
ضرد رہا ہے۔ اور قرآن تو بار بار اسی کی طرف دعوت دیتا ہے اس
لیے مسلمانوں کے لیے یہ کوئی ناگوار بحث نہ ہونی چاہئے تھی کہ ان
کے عقائد کس حد تک ان کے دین سے لگا کھاتے ہیں۔ مگر جو کچھ
ان کا عمل و معاملات دینی میں لکھا ہے سمجھتے تھے کہ عین عقائد کے
مطابق ہے، حالانکہ عمل اور عقائد دو مختلف امور ہیں، عمل سے اصطلاح
میں کہتے ہیں مشرکین کا بھی وہی کچھ ہے جو موحدین کا ہے۔ وہی
دعائیں اور پراتھنا اور وہی قیام و رکوع و سجود دونوں میں عملاً ایک
ہی ہے مگر عقائد میں بہت فرق ہے۔ دہرہ یہ ہے کہ عقیدہ ایک
ذہنی امر ہے۔ لہذا عمل محسوس و دماغی شے ہے عقیدہ رفتہ
رفتہ بدل جاتا ہے مگر عمل میں بہت کم فرق آتا ہے لہذا لوگ ہمیشہ
اپنے عمل سے عقیدہ کی صورت پیدا کرتے ہیں حالانکہ عقیدہ اعمال
کو ابتدا میں تشکیل دیتا ہے۔ فلسفہ ذہنی شے ہے، اور یہ نظریے
حکام کے ہر ایک قوم و ملت میں مختلف رہے ہیں اس اختلاف کی
دہرہ اختلاف عقائد نہیں، عقل جیسا غلطی نہیں کرتی۔ اگر علماء بھی

اس غلط فہمی میں الجھے ہوئے ہیں کہ تعداد مدارج عقل کی درجہ سے
 غلطی ہوتی ہے اور غلطی کرنا عقل کا خاصہ ہے۔ یہ بحث اہم صاحب
 کے رسائل میں بھی ہے حقیقت یہ ہے کہ نامکن ہے کہ انسان کسی
 واحد شے کے محتاق و امکانات پر کما حقہ پوری طرح حادی ہو سکے۔
 یہ اختلاف زاویہ نگاہ اور حد نظر ہے اور بس اور اس میں
 بھی کچھ شک نہیں کہ اگر ہم توہمات سے خالی الذہن ہوں تو
 جو کچھ ہم مشاہدہ اپنے زاویہ نگاہ اور حد نظر تک کریں گے وہ بالکل
 صحیح ہو گا خواہ کسی دوسرے اہل نظر سے یہ مختلف ہی کیوں نہ ہو۔
 جسے ہم غلطی کہتے ہیں وہ کوثر بینی ہے جو یقینی امر ہے۔ یعنی یقیناً
 کسی کی نظر حد میں اور کسی کی کم و بیش ہوتی ہے۔ اگر وہ توہمات اور
 تبادوں سے خالی الذہن ہو کر کسی شے کا مشاہدہ جیسی کہ وہ کرے گا
 تو اس کی نظر ایک ہی پہلو پر ہوگی اس شے کے دوسرے حصے
 پر اس کے احساس کے سامنے نہیں ہیں۔ پوشیدہ رہیں گے۔ لیکن جو
 کچھ اس نے مشاہدہ کیا ہے اور وہ جزاً ہی ہوگا صحیح ہے علاوہ ازیں
 اگر عام غلط محاورہ میں ہم اسے عقلی غلطی ہی کہیں تو یہ بھی حقیقت
 ہے کہ عقل کی غلطی عقل ہی سے رفع ہوتی ہے اور رفع ہوتی رہی
 قرآن کی اس آیت میں تدبیر کرنا چاہئے کہ اعلیٰ الباب وہ ہیں جو
 حکم و تفکر سے صحیفہ کائنات کا مشاہدہ کرتے ہیں اور اس صحیح نتیجہ
 پر پہنچتے ہیں کہ "بنا خلقت ہذا باطلا" یہ کائنات ہل مخلوق نہیں
 ہے یہ عقلی استدلال کا نتیجہ ہے اسی طرح حضرت ابراہیمؑ کے
 حالات میں مذکور ہے کہ آپ کو مصکوت الموت والارض کا مشاہدہ کرایا

گیا۔ تاکہ وہ اہل یقین میں سے ہو یہ سب تذکرہ و تدبر و تفکر سے صحیح نتائج ہیں جو اہل منظر مشاہدات سے اخذ کرتے ہیں یہ بحث اہم صاحب کے حالات میں ہم آگے چل کر بیان کریں گے۔

یونانی فلسفہ جو یونان و روم اور بعد ازاں مسلمانوں میں رواج پایا گیا آج اس کی غلطیاں ہر ایک طالب علم پر واضح ہو چکی ہیں۔ مگر حقیقت وہی کوتاہ بینی ہے اور موجودہ زمانہ کے ذہنی ارتقا نے اس کے نقائص بجا نپ لیے جو ان فلسفیوں پر واضح نہ تھے اور یہی غلطیاں اہم صاحب نے بھی اپنی کتاب میں

لقد مقاصد الفلاسفہ میں نمایاں کیں، غلط فہمی سے بعض علمائے جو اہم صاحب کے بعد ہوئے اور ان میں ابن رشد، اہم صاحب کا سخت مخالف تھا یہ سمجھا کہ اہم صاحب خود فلسفہ کو فی نفسہ مذموم قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ اہم صاحب کی بحث کا موضوع صرف چند فلسفیوں کے نظریے ہیں۔ ابن رشد دمتونی ۵۰۵ھ نے اہم صاحب کی کتاب "تھا فہم الفلاسفہ" کا رد "تھا فہم البتلافت" لکھتے ہوئے یہ فقرہ بھی چست کیا کہ "یہ شخص ایسا احسان فراموش واقع ہوا ہے کہ فلسفہ ہی سے سب کچھ سیکھا اور فلسفہ ہی کی تردید کرتا ہے" کس نیا مبحث علم تیرا زمن کہ مرا حاقبت نشا نہ کردہ خواہم داد دمتونی ۵۹۳ھ میں سلطان محمد ثانی عثمانی تاریخ قسطنطنیہ کے اشارہ پر ایک حکمہ غزالی اور ابن رشد پر لکھا۔ ابن تیمیہ دمتونی ۷۲۸ھ اور ابن قیم دمتونی ۷۵۱ھ بھی اہم صاحب کے مخالفین میں سے تھے۔ لیکن ابن رشد کی مخالفت کو یہ نہیں پہنچے، یہ صرف

اپنے عقاید کا مظاہرہ ہی کرتے ہیں ذرا معقولیت کے ساتھ ابن
 شد امام صاحب کے بارہ میں یہ بھی لکھتا ہے کہ "اس شخص کا کولاً
 خاص مذہب نہیں، بظاہر اشوری ہے مگر صوفی بھی ہے اور
 فلسفی بھی ہے" امام ابن تیمیہ تو ہر ایسے شخص کو جو فلسفی یا فلسفہ
 کو پسند کرنا ہوں قابل نفرت قرار دیتے ہیں۔ امام ابن شہب
 فلسفہ اور تصوف کا ایک جیسا مخالف ہے۔ اور امام غزالی
 جس پر دونوں باتیں تھیں۔ اس لئے دھری شہنی بھی تھی۔ ابن شہب
 نے غزالی کی کتاب احیاء العلوم پر تنقید کی۔ مگر ابن رشد کی
 مخالفت صرف فلسفہ کی حمایت کی وجہ سے تھی۔ بظاہر امام
 ابن شہبہ وغیرہ کی مخالفت کی وجہ یہ تھی کہ علماء اسلام
 فلسفہ کو غیر اسلامی اس لئے سمجھتے تھے۔ کہ ایک تو یہ یونان
 و روم و ایران و ہندوستان کی پیداوار ذہنی تھی۔ اور دوسرے
 ان کے زمانہ میں غیر مسلم یہود نصاریٰ و ایرانی بھی بند پائے
 فلسفی موجود تھے۔ ان میں سے شاہ پور بن سہل (متوفی ۵۵۵ھ)
 اور یونان ابن ہاسویہ (متوفی ۳۱۷ھ) اور قسطنطنیہ بوتا اور مسیحی بن
 یونس اور ریشوع اور حنین بن اسحاق اور ماسرجوبہ وغیرہم کا
 شمار مشہور فلسفیوں میں ہوتا ہے۔ ہم کہہ چکے ہیں کہ جیسا کہ ہدایت قرآن
 یہ ہے کہ دشمنان دین کا مقابلہ ہر ایک ممکن قوت سے کر۔
 ہر ممکن قوت یہی ہے۔ جو دشمنان دین کے قبضہ میں ہو۔ یہ خیال
 خام ہے چونکہ تیر و تنگ غیر مسلم عوام کی اختراع ہے اس
 لئے غیر اسلامی اور بدعت ہے۔ اور بدعت منکرات اور سزاوار

جہنم ہے، اسی کوۃ بینی اور تنگ نظری کا نتیجہ تھا کہ مسلمان تہذیب میں
 مبتلا ہے۔ چونکہ فلسفہ بالکل غیر اسلامی شے سمجھا گیا تھا اس لیے بیچارے
 انہماک الصفا نے بھی خیر اسی میں دیکھی کہ پوشیدہ ہی رہیں۔ ابو جہاں
 اوجیبی کا شمار مشہور اسلام میں ہوتا ہے، یہ صوفی متکلم تھا۔ ابن
 ہونی کہا ہے کہ۔ دنا و قدرہ تین آدمی ہیں۔ ایک ابن رادعلی دوسرا
 ابو العلاء اور تیسرا ابو جہاں اور ابو جہاں بدتر دشمن اسلام ہے۔ یہ
 تینوں فلسفی تھے اور فلسفہ مخالف اسلام سمجھا گیا اس لیے جہنمیں ابن
 ہونی کے نزدیک دشمن اسلام ہیں۔

اہم صاحب کے مخالف حکماء

قاضی ابوالولید محمد بن احمد اندلسی (حسپانیہ) ابن رشد کے ہم سے
 مشہور ہے۔ پیدائش ۵۲۰ھ اور وفات ۵۹۵ھ میں واقع ہوئی
 جب بنو امیر نے ہسپانیہ کو منقر کیا اس وقت بقول ڈرہیرہ
 جہالت کی تیرہ دنار گھاٹی میں گھرا ہوا تھا۔ مسلمانوں نے مشی علم و
 حکمت دشمن کی، دارالعلوم، اندلس سے اور مکتب قائم کے۔ یورپ کے
 فہروں سے طالب علم یہاں آتے اور دولت علم سے مالا مال ہو کر
 جاتے۔ اس وقت علم و حکمت کو پوپ اور پادری اسلامی اور غیر
 مسیحی سمجھتے تھے اس لیے اسے کفر سے موسوم کیا۔

ابن رشد ہسپانیہ کے شہر کارڈنا میں پیدا ہوا تھا اور اجداد
 طبقہ امرا سے تھے اس لیے تعلیم و تربیت بھی امیرانہ ہوئی۔ ابن رشد
 کے مرام دستاویز ابوبکر سے تھے اس کی شہرہ آفاق کتاب طحاوی

کا ترجمہ پہلے جرانی میں پھر لاطینی میں ہوا۔ یورپ یونانی فلسفہ بالخصوص
 ارسطو کو فراموش کر چکا تھا۔ ابن رشد نے تلاش سے نئی فلسفہ
 فراہم کیے جو بہت بری حالت میں ملے، اس نے کئی موفدہ الفاظ
 کو سیاق و سباق عبارت کے لحاظ سے از سر نو لکھا، اور بہت کچھ
 تصحیح کی۔ اور شارح کیا۔ اہم صاحب کی کتاب تحافت الصلاسیہ کا اردو
 میں تحافت المتحافت یا تحافت ابی حامدہ لکھی۔ دیگر تالیفات مثلاً
 کتاب "الکشف عن مناجح الاولیاء" میں تاملیم الفاظ بھی اہم صاحب
 کے سنی میں کہا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ خزانہ کے دلائل مشککہ،
 اور فیہ مجرہ، میں اکثر لوگوں کو حکمت اور شریعت میں گمراہ کرنے
 والی ہیں۔ اہم صاحب کی تصانیف جواہر القرآن اور مشنواة الافراد اور
 المنقذ من الضلال۔ اور کیمیائی سعادت اور التفرقة بین الاسلام والزندقیق
 پر تنقید کرتا ہے اور لکھا ہے کہ اس نے شریعت اور حکمت دونوں
 کو خراب کیا۔ شاید اس کا اہل مقصد بھی یہی کچھ تھا۔ اور اگر نیت
 نیک تھی تو عملاً نتیجہ برابری پیدا ہوا۔ اس کا کوئی مذہب متاہب
 میں سے نہیں ہے، جو مع الامارۃ الفعری ومع الصوفیہ صوفی و
 مع الغلاسیہ فیوت وحتیٰ انہ کا قبل

یوہا بیان اذا لیت ذامین فان لیت معدیا فعدان
 بظاہر جاہل اور شریر تو نہیں لیکن اس کی باتیں جاہلانہ اور شرارت
 آمیز ہیں۔

اہم صاحب کے مخالفوں میں سے طلوعہ ابن رشد حسب ذیل
 علماء حکماء بھی ہیں جو مشاہیر اسلام میں شمار ہوتے ہیں۔

- (۱) ابوالولید طرطوشی دمتونی ۵۵۵ھ
 (۲) ابو عبد اللہ محمد مازری دمتونی ۵۳۶ھ
 (۳) عثمان بن عبد الرحمن شہر زوری معروف بہ ابن صلاح د ولادت ۵۷۷ھ
 وفات ۶۲۳ھ

(۴) ابن شمسہ لقی الدین احمد دمتونی ۵۵۵ھ

(۵) ابن تقیم ابو عبد اللہ محمد دمتونی ۵۵۵ھ

(۶) ابن منیر

(۷) ابن جوزی ابوالفرخ دمتونی ۵۹۷ھ

(۸) بردمان بقاعی

(۹) یوسف دمشقی

(۱۰) بدر زکشی

(۱۱) زہبی د ۵۴۸ھ و ۵۶۷ھ

(۱۲) قاضی عیاض دمتونی ۵۴۲ھ

(۱۳) ابن حرزم ریای ابن حرزم

امام صاحب کے موافق علماء و حکماء تو بہت ہیں مشاہیر حسب ذیل ہیں۔

(۱) امام عبدالقادر فارسی صاحب تاریخ یشاہد۔

(۲) عین القناتہ مہدانی۔

(۳) ابن عساکر دمشقی صاحب تاریخ دمشق د ۵۶۳-۶۹۹ھ

(۴) ابن بخار محب الدین محمد دمتونی ۶۲۳ھ

(۵) سمعانی ابوسعید عبدالکریم د ۵۶۶-۶۵۶ھ

(۶) سبکی۔

۶۱) یاقظی

۶۲) ابن خلیفان ابوالعباس احمد بن ابراہیم دمشقی ۱۲۸ھ

۶۳) شیخ اکبر محمد الدین ابن عربی

۶۴) صلاح الدین صفوی

۶۵) امیر خزانہ صفوی دمشقی ۱۲۸ھ

۶۶) محمد حرزی

۶۷) عبدالوہاب شعرانی

۶۸) قطب الدین محمد عطائی

۶۹) ابوالفضل عراقی

۷۰) قاضی لودی

۷۱) شیخ عبدالقادر مؤلف تعریف الاحیاء بفضائل الاحیاء

علماء متاخرین کی فہرست طویل ہے، ان میں سے شیخ بھائی

دمشقی ۱۲۳ھ لودھی زبیدی ۱۲۰۵-۱۲۲۵ھ صاحب تاج العروس و

شرح احیاء العلوم مشہور شخصیات ہیں۔

مستفید ہیں۔ بعض حضرات نے ام صاحب اللہ ابن رشد

پر محاکمہ بھی لکھا، ان میں سے محمد لطفی نے جس بے لطفی سے ابن

رشد کی حمایت کی ہے اس کے بعض فقرات سے واضح ہوتی ہے

ام صاحب کو متقاضی لودھی ابن رشد کو قاضی ابن قاضی لکھتا ہے عربی

زبان میں اسم پر صرف "مت" کا اضافہ ہو تو معنی جھوٹا ہو جیسے ابن

مثلاً "بنی" لودھی "قبیلی" یعنی جھوٹا بنی اسی طرح قاضی لودھی متقاضی یعنی

جھوٹا قاضی، ابن رشد کو بیشک قاضی ابن قاضی ہے لیکن ام صاحب

کبھی اس عہدہ جلیلہ پر فائز نہیں ہو سکے اور کبھی قضاۃ کا دعویٰ کیا۔
 صرف ایک قاضی کے عہدہ کی رعایت سے اہم صاحب کو متقاضی بنا
 دیا، محمد لطیفی نے تادمین فلاسفہ اسلام لکھی، اس میں ایک اور مقام
 پر لکھا ہے کہ یہ شخص جو حجتہ الاسلام کے لقب سے مشہور ہے اس سے
 کہیں بڑھ چڑھ کر ابن رشد نے اپنی تصنیفات میں شریعت کی مدافعت
 اور اس کے احکام کی نصرت کی ہے،

تادمین زادہ دعویٰ نے بھی ایک محاکمہ لکھا تھا، محمد لطیفی لگے ہاتھوں
 اس کی بھی مزاج پر ہی اس طرح کرنا ہے کہ اس بات پر تعجب نہ کرنا
 چاہئے کہ علم دعویٰ نے غزالی اور ابن رشد کے اختلاف پر محاکمہ لکھا
 اس کی عبارت ہی اس کے قلت قہم پر دلالت کرتی ہے، ایک اور
 شیخ نکی مبارک محمد لطیفی کی طرح غزالی کی مخالفت کرنا ہے مگر لطیفی
 کی طرح بے لطف نہیں،

ابوبکر محمد بن عبدالملک ابن طفیل (متوفی ۱۱۳۵ھ) اہلسی فلسفیوں میں
 معتدل ہے، اہم صاحب کی تعانیف کا یہ منظر غائر مطالعہ کیا۔ اپنی کتاب
 اہلال الملکۃ المشرقیہ لحد رسالہ کی بن میں اہم صاحب کا ذکر کرنا ہے
 ابن طفیل کہتا ہے کہ حقائق کا علم جدوجہد کے بغیر ممکن نہیں، جو بھی
 حقیقت کے انکشاف کے لیے کوشش کرتا ہے۔ خاص لذت محسوس
 کرتا ہے کہ زبان لہریاں اس کی شرح سے عاجز ہے، اور کبھی وجد
 و سرمد کے مرتبہ پر بھی پہنچ جاتا ہے کہ اس حالت میں حقیقت کو
 پوشیدہ نہیں دکھ سکتا۔ بعض حضرات جو اس حالت تک پہنچے ہیں
 عالم استغراق میں۔ بحالی ما اعظم ثانی "ولیس فی ذوب الالہہ کہتے ہیں۔

اے شرح ابو حامد غزالی پر مجیدہ حال وارد ہوا ہے ابن طفیل یہ بھی لکھتا ہے
 کہ فلسفہ جیسا کہ چاہئے اندلس میں وارد نہیں ہوا اور اہل اندلس پیشتر
 اس کے کہ منطق سے واقف ہوں ریاضیات میں مشغول رہے ، اے
 علم منطق سے کما حقہ بہرہ ورنہ ہوسے اور منطق کے بعد فلسفہ کی طرف
 توجہ کم ہی رہی اے ان میں ابو بکر محمد بن یحییٰ معروف بہ ابن صالح یا ابن
 باجر دمشق ۳۳۵ھ سے بڑھ کر استاد کوئی نہیں ہوا۔ لیکن ابن باجر
 دنیا دار آدمی تھا اور کمال انسانی اے دریافت حقیقت حاصل نہ کر سکا۔
 دیا رہے کہ جہاں کہیں فلاسفہ مغرب استعمال ہوتا ہے مراد
 ابن باجر و ابن طفیل و ابن رشد ہے اے فلاسفہ مشرق سے مراد

فابالی لہ ابن سینا اے غزالی ہیں ا

ابن طفیل کہتا ہے کہ میں نے ابن باجر کو تو نہیں دیکھا لیکن اس
 کے مقالات کا مطالعہ کیا ہے جو نہایت مختلف ہیں قدیم فلسفیوں کے فلسفہ
 کی شرح لکھتا ہے اے غزالی لہ ابو علی سینا اور فابالی کو ایک ہی
 مدیعت میں رکھتا ہے اے ان پر تنقید کرتا ہوا کہتا ہے کہ ان حضرات
 کا فلسفہ فہم حقائق کے لیے کافی نہیں، لیکن فابالی کی تالیفات جہاں تک
 مجھے میں زیادہ تر فن منطق میں ہیں اور اس کے فلسفہ میں مہبت
 شکوک موجود ہیں البتہ ابن سینا کی روش تحقیق صحیح ہے جو ارسطو میں
 بھی پائی نہیں جاتی لیکن وہ خود کتاب لفظ میں لکھتا ہے کہ میں نے مشائیوں
 کی روش پر کسی نے اے اگر کوئی چاہے کہ حقیقت لہ میرے عقاید
 پٹنی سے آگاہ ہو تو میری کتاب "فلسفہ شرقیہ" کی طرف رجوع کرے۔
 غزالی جو کچھ کہتا ہے اس کا فائدہ لوگوں کو اس وقت تک نہیں پہنچ

کنا جب تک ان کو بصیرت نفس پہلے ہی نہ ہو۔ لہذا غزالی کی طرح صاحب حال اور ہم عقیدہ نہ ہوں،

اہم صاحب کے مخالفوں میں سے ابوالفرج ابن جوزی اور قسّم الدین ابوالمظفر معدون بہ سبط ابن جوزی (۶۵۴-۵۸۲ھ) ابن تیمیہ اور اس کا شاگرد رشید ابن تیمیہ تمام علماء جلی مذہب تھے اور غزالی کا مذہب شافعی تھا اس لیے یہ حضرات اہم صاحب کے مخالف ہیں۔ سبط ابن جوزی کہتا ہے کہ غزالی نے کتاب احياء العلوم مذہب صوفیہ پر لکھی ہے اور قواعد فقہ اسلمی کی رعایت نہیں کی، ابن تیمیہ اس لیے اہم صاحب سے خفا ہے کہ یہ فلسفی ہے اور بددین اور دست عقیدہ رکھتا ہے، ابن تیمیہ ہر ایسے کو ملعون کہتا ہے کہ جو کتب فلسفہ کو غیر زبانوں سے عربی میں نقل کرتا ہے اور مسالوں میں راجح کرتا ہے۔ احياء العلوم کی نسبت کہتا ہے کہ غزالی کو فن درایت و حدیث سے بہت تھوڑی واقفیت تھی۔ ابن جوزی نے تو احياء العلم کے رد میں کتاب اعلام الاخبار فی اغلاط الاحیاء لکھی اور سخت اعتراض کیے۔ ابن تیمیہ بھی تعصب میں ان حضرات سے کم نہیں اور اس نے بھی احياء العلوم کا رد لکھا ہے۔

بات اصل میں یہ ہے کہ غزالی شافعی مذہب اور اشعری مسلک کا آدمی تھا اور جو یابی حقیقت تھا۔ اور دلیل عقلی کے بغیر کسی بات کو تسلیم نہیں کرتا تھا اور جو کچھ اس نے افکار و عقاید نازہ پیدا کیے اور دہرائے کے کلام سے وہی کچھ اخذ کیا جو دلیل اور محبت سے ثابت شدہ تھے وہ ان مخالف حضرات کے عقاید کے موافق

سنتے اس لیے ان کو غزالی کے دلائل اور برہان عقلی و نقلی سے
 کچھ سروکار نہیں وہ اپنے عقائد کے تراژد میں اسے تولتے ہیں اور
 ان ہم میں صاحب ایک دوسرے کے سخت مخالف تھے۔ اگر
 ہم صاحب کی مؤلفات اجماع العلوم بعد المنقذ من الضلال و مشکوٰۃ الاخوان
 اور جواہر القرآن اور المستصفیٰ وغیرہ کا مطالعہ کیا جائے تو واضح ہو
 جائے گا جو کچھ ہم صاحب نے لکھا ہے وہ آپ کی ذاتی تحقیق ہے۔
 مولانا جلال بھائی کہتے ہیں کہ غزالی تو ہر معقول بات کو لے لیتا
 ہے اور علماء اہل سنت بعض ہا معقول باتوں کو بھی اپنے عقاید
 میں داخل سمجھتے ہیں اور جس طرح سنی شیعہ کو شیعہ سنی کو بدین
 کہتے ہیں یہ بات غزالی میں نہیں اس لیے کہ اس کے عرفان اور
 تصوف اور ریاضت نے اس کے عقاید میں تعدیل پیدا کر
 رکھی تھی۔ اور احادیث صرف اہل سنت کے طریق پر ہی نہیں لیتا
 بلکہ ائمہ شیعہ سے بھی رعایت کرتا ہے۔ المنتصر یہ کہ گرفتار
 ابو بکر و علی نہ تھا۔

ہم صاحب کا ارشاد ہے کہ علم منطق شناخت حدود و برہان
 و شرائط قیاس لازم ہے، مخالف کہتے کہ غزالی نے اس لیے تحصیل منطق
 کو حرام مطلق نہیں سمجھا۔ ابن صلاح اور شرف تودی اور ابن تیمیہ اور
 ابن قیم کا عقیدہ تھا تحصیل منطق حرام ہے۔ ابن قیم کہتا ہے کہ
 علم منطق کو جہل کہا جائے۔ امام شافعی اور احمد اور دیگر ائمہ دین نے
 کب منطق پڑھا، ان حضرات کی تعانیف پڑھ کر دیکھ لو منطق کے بیان
 سے مطلق آلودہ نہیں، اہل سنت و جماعت کا عقیدہ جہلہ علم منطق

مختلف ہے بعض تو اسے واجب عینی اور بعض واجب کفائی اور بعض
 مباح اور بعض حرام کہتے ہیں۔ ابن تیمیہ وغیرہ آخر الذکر زمرہ میں ہیں
 ہم صاحب کے ایک فقرہ "لیس فی الاسکان ابدع مما کان" یعنی خلقت
 ہم اس سے بہتر نہیں ہو سکتی جیسا کہ مشاہدہ ہو رہی ہے۔ اس
 پر مخالفوں نے کہا ہے کہیں۔ اور اہم صاحب کے بعض شاگردوں نے
 کہا کہ یہ قول اہم صاحب کا نہیں مخالفوں نے ان سے منسوب کیا ہے۔
 اہم صاحب سے جو حضرات موافق ہیں ان کی مختصر فہرست
 ہم لکھ چکے ہیں، یہ اہم صاحب کے اقوال کی تائید کرتے ہیں اس
 کا تذکرہ موجب طمأنینہ ہے۔ آج ہم اہم صاحب کے مرتبہ سے
 خوب واقف ہیں۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ ہم عصر علماء کبار کی
 ایسے شخص کے رقبہ سے واقف نہیں ہو سکتے جو ان سے بالاتر ہو اور
 ابن رشد وغیرہ فلسفی اور اہم صاحب کو اس لیے پسند نہیں کرتے کہ ان
 کی طرح بعض فلسفی کیوں نہیں۔ اور علماء اسلام اس لیے کہ وہ فلسفی کیوں
 ہے۔ علماء ظاہر اس لیے کہ اس کا مسلک صوفیہ کیوں ہے، اور
 اہم صاحب کے بعض اقوال کو بدعت ملامت بنایا۔ اہم صاحب نے
 اپنی "تفسیریں یہ بھی کہ دیا کہ دوستی
 زندگی میں عبادت اہم میں داخل ہے۔ ابن قیم کہتا ہے کہ کسی
 مفسر نے آج تک یہ تفسیر نہیں کی اور دوستی زندگی پرستش اہم
 کیسے ہو سکتی ہے۔"

علی بن یوسف بن تاشغین ولادت ۳۹۹ھ وفات ۵۲۶ھ
 شاہ اندلس و مراکش مذہب بالی میں سخت متعصب واقع ہوا تھا۔

اور فلسفہ و منطق سے خدا واسطے بیر تھا۔ فقہاء مالکی اور دوسرے
مذہبوں خزانے نے اسے بھر کاپا اس نے فرمان شائع کیا کہ کتب
غزالی بالخصوص حیا العلوم جہاں بھی ملے اور جس کسی کے پاس ہو جلاوے
اس کی تعمیل ہوئی مگر اس کی بادشاہت نہ رہی اور امام صاحب
کے دوستوں نے اسے آپ کی کرامت پر محمول کیا۔

قاضی عیاض نے بھی مولفات غزالی کے جلاوے کا فتویٰ دیا۔ قاضی
صاحب مراکش میں تھلکھ میں فوت ہوئے۔ فقہائے بلاد مغرب کا
رئیس ابوالحسن علی بن حزم معروف بہ ابن حزم مغربی نے بھی
فتویٰ صادر فرمایا کہ احياء العلوم کا پڑھنا پڑھانا حرام اور جلاوے واجب ہے۔

امام صاحب کے شاگردوں رشید

امام صاحب مدرسہ نظامیہ بغداد میں چار سال اور نیشاپور میں
ایک سال درس دیتے رہے، امام صاحب کی عادت تھی ان اوقات
کے علاوہ جو عبادت اور ریاضت میں بسر ہوتے باقی اوقات میں
طالبان علم و حکمت و حق کو درس دیتے رہے بغداد میں تین
سو طلبا آپ کے حلقہ درس میں شامل ہوتے اور ان میں سے
ہر ایک فارغ التحصیل ہو کر یگانہ یگانہ گارہ ہوا۔ نیشاپور میں بھی طالبان
حق کا ہجوم رہتا، طوس آپ کا مولد ہے۔ یہاں ایک خالقاہ اور
مدرسہ تعمیر کیا۔ ایک سو طالب بیک وقت آپ کے فیوض روحانی
سے بہرہ یاب ہو کر ہدایت خلق خدا میں مصروف رہے۔ چھٹی صدی
ہجری کے اکثر علماء حکما بالخصوص اہل خراسان آپ ہی کے شاگرد اور

تہ بیت یافتے۔ ان میں سے ایک امام علی الدین محمد بن یحییٰ بن
ابی منصور نیشاپوری ہیں۔ ۳۳۸ھ میں قوم غزالی نے خراساں پر حملہ کیا
سلطان بنز سلجوقی اسیر ہوا، پانچ سال قید و بند میں رہا یہ فتنہ پانچ
سال مسلسل رہا اسی فتنہ میں امام صاحب کے اکر شاگرد جو فضل و حصر
تھے ماسے گئے۔ امام یحییٰ بھی شہید ہوئے۔ استاد خاقانی شردانی
نے عدد انگیز مرثیہ لکھا چند اشعار حسب ذیل ہیں۔

ہن مصرتک کہ تو دیدی خراب شد مل نیل بکرمست کہ شہیدی سرب شد
گھل سر محمدی کجا بسا واد محنت نصیب بنجر ملک بکاب شد
ای مشتری معایتہ ازیر کہ عد گھن محمدی کجا طاب شد

امام یحییٰ ایک عرصہ تک مدرسہ نیشاپور اور نظامیہ طہرات میں درس
دیتے رہے۔ علاوہ فضلالی ایک جماعت آپ کی شاگرد تھی۔ امام یحییٰ
عربی میں اشعار بھی خوب کہتے ایک فاضل آپ کے بارہ میں کہتا ہے کہ
فیات الدین والاسلام یحیا بھی الدین مولانا دین یحیا
خان اللہ رب العرش یلقی علیہ صین یلقی الدرس و حیا
جب آپ درس دیتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ روح القدس آپ کی
زبان پر نزلتا ہے۔ مولانا بہائی نے آپ کے حو بیت کا ترجمہ فارسی
میں کیا ہے۔

وقال العبد الشرفی السناء حنیئہ

ازلا شمس لاقتہ فما خلنہ صدقا

فما التری صد غاہ فی صا و وجہہ

وقد اسع اقلبی نیسقنتہ حقا

مولانا ہمدانی کا ترجمہ ہے

میں نے سنا ہے کہ مال پانی میں گرے تو
سورج کی کرنوں سے ناپ بن جائے
تیرے پہرہ پر زلف نے بل لکائے اور
مل کو ڈسا مجھے یقین ہو گیا کہ لوگ سچ کہتے ہیں

امام شہدائے حدیث کا صواب
امام یحییٰ کو سفاک قاتلوں نے نہایت اذیت کے ساتھ مارا۔ منہ
فاک سے بھرا اور گروں میں کپڑا ڈال کر پھانسی دی ملک الشعراء غسانی
کہا ہے کہ

ناور محنت است حیا میں تگنائے سفاک
صمت محمد مرسل بلاشت خلق
تاکوہ رعد تہکد و نعل قداے سنگ
دین مکروہ گاہ نعتہ وہاں راقداے سفاک

امام یحییٰ کی ولادت ۳۳۶ھ اور شہادت ۳۸۵ھ میں واقع ہوئی
اسی سال ابو الفتح محمد ابن عبد الکریم شہرستانی مولف کتاب "عل و نحل"
نے بھی وفات پائی۔

امام یحییٰ کے بہت شاگرد سند آمد روزگار ہوئے۔ ان میں سے
ایک ابو البرکات نعم الدین محمد بن موفق بن سعید فیوشانی نیشاپوری
وہ مشہور شخصیت ہے جس کی تحریک پر سلطان صلاح الدین ایوبی نے
قلمی خلفاء مصر کا ہم خطبہ سے حذف کر کے خلفاء عباسیہ کا ہم برسر
ممبر پڑھوایا۔ اس کے علاوہ امام شباب الدین محمد بن محمود طوسی اور شیخ
غزالدین محمد بن بلال علی فغانی (۵۲۹-۵۱۶ھ) تاحضی ابو طالب محمود بن علی
اصغباری مشہور و معروف مدرس دستوری (۵۸۵ھ) سب اپنے زمانہ

کے منتخب علماء فضلہ اہم یحییٰ کے شاگرد تھے۔
 اہم غزالی کا ایک اور شاگرد ابوالفتح محمد بن فضل مارشکی طوسی
 سنے یہ بھی فقہ غزالی میں ۵۴۹ھ میں شہید ہوا۔ ایک اور شاگرد
 ابو منصور محمد بن اسعد واعظ عطاری طوسی معروف بہ "حندہ" ہے
 مرد میں ۵۴۹ھ میں فوت ہو کر مدفون ہوا۔

ایک اور شاگرد ابن بربان نسیب ابوالفتح احمد بن علی نظامیہ بغداد
 میں مدرس رہا۔ ۵۴۹ھ میں پیدا ہوا اور ۵۷۲ھ میں فوت ہوا۔
 تاج الاسلام ابن گنیم ابو عبداللہ حسین بن نصر موصلی دمتونی ۵۲۲ھ
 اور ابو محمد انصاری حامر بن وحش شامی ۵۲۱-۵۲۰ھ اور مروان طنزی
 بن علی بن سلامہ ساکن دیار بکر وزیر زنگی آق منقر والی موصل دمتونی
 ۵۴۳ھ اور استاد ابوطالب لازی عبداکرم بن علی بن ابی طالب
 دمتونی ۵۲۹ھ اور ابوالفتح باقری عبدالواحد بن حسن مدرس نظامیہ
 بغداد دمتونی ۶۲۳ھ اور ابن عربی معافی ابو بکر محمد بن عبداللہ
 اندلسی دولادت ۴۶۸ھ وفات ۵۴۳ھ اور ابو نصر فتالی محمد بن
 اسعد بن محمد ملقب بہ "مہریدہ" شہادت حادثہ غزالی میں ۵۵۴ھ
 اور قاضی ابو نصر احمد بن عبداللہ بن خنقری دولادت ۴۶۶ھ وفات
 ۵۴۴ھ سب اہم غزالی کے شاگرد تھے۔

محمد بن توہرت ابو عبداللہ محمد بن عبداللہ بن توہرت معروف
 بہ مہدی ہرغنی، یہ بھی اہم صاحب کا شاگرد تھا اس نے دیار مغرب
 میں دعویٰ مہدویت کیا تھا۔ اقوام پرورد نے مراکش اور ہسپانیہ اور نارا مصر
 میں شورش اور انقلاب برپا کر لی تھیں اشر و غیرہ اس کے حالات

مفصل لکھا ہے، اگر لوگ اس کے گردیدہ ہو گئے دلدادت ۴۸۵ھ
 اور وفات ۵۲۴ھ

ابو حامد اسفراینی محمد بن عبدالملک جو سقانی اسفراینی اور ابوسعید
 محمد بن جادانی حرانی ۵۲۱-۴۸۶ھ بھی اہم صاحب کا شاگرد ہے اس نے
 مقامات حریری پر شرح لکھی ہے۔

ابراہیم بن عمر غنوی متی صوفی ۵۲۳-۴۵۹ھ اور ابو عبداللہ حسین

بن نصر جعفی کعبی ۵۵۲-۴۶۶ھ اور خلف بن احمد نیشاپوری اور ابوالحسن سعد
 الجیرین محمد بن سہل انصاری اندلسی ۵۲۱ھ اور ابو منصور سعید

بن محمد بن رزاق مدائسی نظامیہ ۵۳۹-۴۶۲ھ اور ابوالحسن علی بن

حمویر بن محمد بن حمویر جو نسی ابو عبداللہ شافع بن عبدالرشید جلی

دمتونی ۵۲۱ھ اور ابوالفتح نصر بن محمد ابراہیم آذربائیجانی مراغی اور ابوالحسن

علی محمد مطہز بن علی بن مطلق وینوسی ۵۳۱ھ اور ابو محمد صلاح

بن محمد اور جمال الاسلام ابوالحسن علی بن مسلم، یہ سب اہم صاحب کے شاگرد

ہیں۔ تمام شاگردوں کا تذکرہ ابن خلقان اور طبقات شافعیہ اور مرآة الجنان

وغیرہ کتب میں کیا گیا ہے۔

اہم صاحب کے ایک شاگرد محمد بن تومرت کے بارہ میں ہم سطر

بالا میں لکھ چکے ہیں کہ اس نے دعویٰ جہدیت کیا تھا، یاغی مرآة الجنان

میں واقعات سال ۹۹ھ کے ضمن میں لکھا ہے کہ اس سال ایک

شخص نے "تھاوندہ" میں دعویٰ نبوت کیا اور سحر اور شعبہ بانہ سے

بھی کام لیا۔ گرفتار ہو کر مارا گیا۔ ہم نے اپنی کتاب "مناہب اسلامیہ" میں

بدعیان جہدیت و نبوت کا تذکرہ مفصل لکھا ہے۔ اسے اس مقام پر اعادہ کی ضرورت نہیں۔

ہدایت و نبوت آنحضرتؐ کے بعد بہت پیدا ہوئے ہیں اور احادیث موضوع انہی تا یہ میں بہت ہیں جب تک لوگوں کو کسی جہدی وغیرہ کا انتظار ہے ایسے مدعیان پیدا ہوتے رہیں گے، تمہیں یہ سب کہ ایک جہدی کے بعد دوسرے کا انتظار بلتی رہتا ہے۔

المنتقد من الضلال

یہ کتاب ام صاحب نے اپنی وفات سے چار سال پیشتر لکھی اس کتاب کی تصنیف کی وجہ یہ ہوئی کہ لوگ اکثر ام صاحب سے سوال کرتے کہ آپ نے کس طرح ماہب مروجہ کی بھول بھلیوں سے نجات حاصل کی امد تقلید کا پھندا توڑ کر تحقیق کی منزل پر پہنچے اور اس تمام تحقیق کا نتیجہ کیا ہوا۔ امد فلسفہ کو چھوڑ کر تصوف سے رشتہ جوڑا ام صاحب اکثر حلقہ حدسن میں عموماً ان امد پر گفتگو کرتے مگر پھر خیال آیا کہ کیوں نہ ایک رسالہ کی صورت میں ان استفادات کا مفصل جواب لکھا جائے کہ آئندہ نسلوں کے بھی کام آئے۔ یہ تمام باتیں ام صاحب نے رسالہ المنتقد من الضلال میں لکھی ہیں، اس کا ترجمہ مختلف زبانوں میں ہو چکا ہے۔ سید احمد خاں غفرلہ نے بھی اردو میں ترجمہ کیا اور تنقید بھی کی، حافظ ادر علی دہلوی نے سلیس اردو میں ترجمہ کیا حدوں ترجمہ ہمانی نظر میں احوال عمر میں گذرے ہیں۔ مولانا ہمانی نے فارسی میں ترجمہ کیا جو ہمارے سامنے ہے، اس رسالہ کے مطالعہ سے ام صاحب کے فلسفہ کی نوعیت بھی واضح ہوتی ہے جو ڈیکارت وغیرہ فلسفیوں سے مختلف ہی ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ ڈیکارٹ نے اپنی تحقیق کو اپنی لفظوں میں بیان کیا ہے

جو امام صاحب نے رسالہ مذکورہ میں اسماں کیے ہیں۔ امام صاحب نے ہر ایک
شے کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھا لیکن جب تصوف کی طرف
دھوج کیا تو واضح ہو گیا کہ یقیناً نختہ مد ہر پر وہ ظن و اور یہی کچھ ڈیکارٹ
کا نظریہ ہے۔ مگر ڈیکارٹ تو باتوں کے لٹو بنانا ہے جس سے کسی کا
پیٹ نہیں بھر سکا اور امام صاحب تزکیہ نفس اور تصفیہ قلب پر
انکشاف حقیقت منہر یقین کرتے ہیں، امام صاحب فرماتے ہیں کہ
اختلاف اہم و اقسام عالم بہ تعلق مذہب اتنا ہے کہ ان کے اسباب
پر کلمہ اطلاق مشکل ہے۔ ہر ایک فرقہ کا یہ دعویٰ ہے کہ وہی ایک
ناہی اور دوسرے گمراہ ہیں۔ کل جذب ببالا پیغمبرؐ اور اپنے عقاید
کی تائید میں جب حلالی عقیدہ سے کام نہیں چلتا تو برہان قاطع یعنی تلواری
سے کام لیتے ہیں۔ آنحضرتؐ کا ارشاد بھی ہے کہ جلدی میری امت
بیشتر فرقوں میں بٹ جائے گی مگر ان میں سے ایک ہی تاہی ہوگا۔
مستشرق امتی علی بنیف و سعید زقہدان جید منہم واحد ہے، ہر ایک
فرقہ کا دعویٰ ہے کہ تاہی وہی ہے اور امام صاحب فرماتے ہیں
کہ میں آغاز بھائی سے اب تک میری عمر پچاس سے تجاوز کر چکی ہے
اس بحر بیکراں میں شتادری کرنا رہا ہوں اور ہر ایک فرقہ کے عقاید
اور ہر ایک مذہب کے اسرار و رموز کی جستجو میں مصروف رہا، غرض
یہ تھی کہ معلوم ہو کہ حق کیا ہے اور باطل کیا ہے اور سنت و بدعت
میں تمیز کس طرح ہو سکتی ہے۔ میں نے ظاہر پرست حلا کا بھی جائزہ
یا تو جو ظاہری رسوم و شعور سے ادھر ادھر ہونا لگایا سمجھتے ہیں اور کافر
اور زندیق کے دلوں کو بھی ٹٹولا کہ تمام ادیان و مذاہب کو ٹھکرا کر کسی

شریعت کے پابند نہیں ہیں غرض مسک ظاہریہ و باطنیہ و حکماء متکلمین
 و صوفیاء و زہاد و عباد و کفار و زنادقہ کے عقاید سے کما حقہ واقف ہوگی
 میں یہ چاہتا تھا کہ ان تمام مذاہب کے اختلاف کے اسباب و اہل
 معلوم ہوں اور کس لیے یہ لوگ اپنے اپنے مذاہب کے گرویدہ
 ہیں بات یہ ہے کہ میری سرشت و فطرت میں تحقیق کا مادہ
 تھا لہذا میں تشکیکی تحقیق پر ایک مرحلہ پر شدت سے محسوس کرتا رہا
 یہ بات کچھ میری اختیاری نہ تھی بلکہ میری فطرت کا یہ تقاضہ تھا۔ اس
 کے ساتھ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میری روح کو تقلید سے
 لفظ تھا۔ کیونکہ مجھ پر یہ بھی واضح ہو چکا تھا کہ اکثریت دلیل و برہان سے
 کسی مذہب سے وابستہ نہیں بلکہ محض تقلیداً غلو کر رہی ہے۔ جب
 تک مجھے کوئی بات کسی مذہب یا عقیدہ میں معقول نظر نہ آتی میں
 تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔

ابھی عہد جوانی باقی تھا کہ آخر تقلید کا پھندا جس میں لوگ جکڑے
 ہوئے تھے میں نے توڑ پھوڑ کر دکھ دیا اور وہ عقاید جو دانشت میں
 مجھے ملے تھے میں ان سے دست بردار ہو گیا۔ میں نے یہود و نصاریٰ
 کے لڑکوں کو دیکھا اور اسی طرح مسلمانوں کی اولاد کی حالت تھی مگر
 اپنے آباء مذہب میں نشوونما پاتے ہیں۔ ان کی عقاید موروثی ہیں
 پرورش ہوتی ہے مجھے یہ حدیث بھی ازبر تھی کہ ہر ایک مولود اپنی
 اصلی فطرت پر پیدا ہوتا ہے اس کے والدین اسے یہودی و نصرانی
 و مجوسی بنا لیتے ہیں اس لیے میرے امد ایک تحریک اٹھی کہ
 دریافت کیا جائے کہ فطرت کیا ہے اور یہ علم کے بغیر ممکن نہ تھی اس

لینے اب اس ٹوہ میں لگا کہ علم کیا ہے؟ تاکہ میں اسی کا اتباع کروں، یہ
 نقطہ مجھ پر منکشف ہوا کہ علم حقیقی وہی ہے جس میں شک و شبہ و غلط
 و پندار کی گنجائش نہ ہو جس میں شک و شبہ کی گنجائش ہو وہ علم نہیں
 محض توہمات ہیں۔ علم وہ ہے کہ معجزہ و کرامت بھی اس کی حقیقت کا
 بطلان نہ کر سکیں۔ مثلاً دس زیادہ میں تین سے اگر کوئی اس حقیقت کا
 منکر ہو اور کہے کہ میں زیادہ ہیں دس سے ہیں تو خواہ وہ عصا کی
 سانپ بنا کر دکھاوے میں ہرگز یقین نہ کروں گا گو مجھے اس کی
 قصیدہ بانٹا کے اسباب کا علم نہ ہو اور مجھے حیرت بھی ہو کہ اس نے
 عصا کا سانپ کیسے بنا دیا۔ لیکن میرے علم میں کہیں یہ شک و شبہ نہ ہوگا
 کہ دس زیادہ ہیں تین سے۔ جب علم کی تعریف میں نے اس حد تک
 اپنے ذہن میں پختہ کر لی تو اب دیکھنا یہ تھا کہ علم کی بنیاد کن امور پر
 ہے تو سب سے پہلے ان امور کا جائزہ لیا جس کو میں اپنا علم و
 فراست سمجھ رہا تھا۔ آیا یہ میرا علم ایسا ہے کہ اس میں شک و شبہ
 کی گنجائش نہیں؟ قطعی یعنی ہے یا محض لادہم و خیالات ہیں۔ جب
 میں نے جائزہ لیا تو واضح ہو گیا کہ یہ یقینی امر نہیں اور میں۔ علم سے
 بالکل خالی ہاتھ ہوں، ضروریات اور حیات کے سوا اور کچھ میرے
 پاس نہیں۔ ضروریات سے مراد بدیہات لولہ ہیں۔ جیسے دس
 زیادہ ہیں تین سے اور کل جزو سے بڑا ہے اور اجتماع ضدیں
 محال ہے، اس لیے میں نے سوچا کہ میری مشکلات کا حل انہی
 ضروریات و حیات سے ہی ہوگا۔ اور انہی کو اپنی تحقیق کی بنیاد قرار
 دینا چاہئے۔ اس لیے میں نے انہی کا جائزہ لیا کہ آیا یہ قابل اعتبار

بھی ہیں۔ شاید یہ بھی تفلید کا کرشمہ ہو کہ میں بدیہات کو سنگ بنیاد علم
حکمر کی طرح سمجھ رہا ہوں اور ان کی بھی وہی کیفیت ہو کہ اکثر لوگ اپنے
منظریات پر اعتماد کرتے ہیں اس لیے میں نے ضروریات اور محسوسات
میں فکر کی کہ حیلوں ان میں شک و شبہ کی گنجائش تو نہیں۔

جب میں نے محاسن اور محسوسات میں غور کیا تو معلوم ہوا کہ ان میں
شک و شبہ کی گنجائش بہت ہے، اور ان سے اطمینان قلب حاصل
نہیں ہو سکتا۔ سب سے قوی تر حس بصر ہے جو سایہ کو ساکن دکھائی ہے
حالانکہ تجربہ و مشاہدہ سے یہ امر ثابت شدہ ہے کہ سایہ کسی کا ساکن
نہیں ہوتا۔ اجرام سماوی کو چھوٹے چھوٹے فضا دکھائی ہے حالانکہ علم
ہندسہ کے دوسرے یہ ہمارے کہ ارض سے بھی بڑے ہیں۔
حکم عقل نے محسوسات کی تکذیب کی تو مجھے ان سے دست بردار
ہونا پڑا۔ اس لیے میں نے اولیات عقل کی طرف رجوع کیا۔ محسوسات
نے مجھے کیا کہ جناب عقل نے ہماری تکذیب تو کی ہے۔ مگر یہ خود کہاں
کی معتبر ہے، یہ ممکن ہے کہ جس طرح ہمیں نیچا دکھایا ہے اسی طرح
اس پر بھی کوئی اور حکم ہو، فرق کل ذی علم عظیم اتنا تو سوچیں کہ آپ کی
ادھی دھل خواب میں گنتی ہے اور جو کچھ خواب میں آپ مشاہدہ کرتے
ہیں عقل تصدیق کرتی ہے مگر بیداری میں جھٹلاتی ہے کہ یہ تمام ادھام
و خیالات کیا یہ ممکن نہیں کہ اور عقل سے زبردست تو حکم بھی ہو جو
اشتبہات عقل کو آشکارا کرے۔ اور اس کی ضمانت آپ کے پاس
کیسے کہ جسے آپ بیداری سے تعبیر کرتے ہیں وہ بھی ایک صورت
خواب ہی ہو۔ اور محققین صوفیہ بھی تو یہی کہتے ہیں، کہ سب کچھ جو اس

زہنگی میں مشاہدہ ہوتا ہے مجازی ہے۔ حقیقت بعد از مرگ خلق
جدید میں آشکارا ہوگی۔

فرا کہ پیشگاہ حقیقت شود پدید شرمندہ نہ ہر دے کہ نظر بر مجاز
میرا ذہن حدیث نبوی کی طرف منتقل ہوا والناس نیامرا ذامسا قوا
انتہول لوگ سوئے ہیں مرکر جاگیں گے۔ لہذا آیہ قرآن یہی ہے کہ
نكشفتناك عطاوك فہسك اليوم حدیث

ان خیالات کا وہ نہ کہ میرے دلخ پر ہجوم ہو رہا تھا، لیکن میرا
سرمایہ تو یہی حسن اور بدیہات اولیہ ہی تھے، لیکن جب ان سے اعتبار نہ
اٹھ گیا تو میں خالی ہاتھ رہ گیا۔ اب میری حالت سفسطہ ()
کی سی ہو گئی۔ لیکن یہ سب کچھ حال ہی حال تھا میں اسے زبان پر نہ لایا۔
قریب دو ماہ مجھے وحشیانہ سوسنطالی میں سرگردان ہونا پڑا۔
لہذا اس حد کا کوئی دوا نظر نہ آیا۔ آخر اللہ تعالیٰ ہی کے کرم و فضل
سے مجھے رہائی ملی اور میری حالت صحت و اعتدال پر آگئی یعنی ضروریات
عقلی حدود اطمینان ہوئی مگر یہ کسی نظم و ترتیب استدلال سے کیفیت
حاصل نہ ہوئی۔ بلکہ میری رہنمائی اس نورانی جس سے سموات و ارض
روشن ہیں۔ الغرض نور الہی کی ہدایت سے میں نے ظلمات سفسطہ
سے بھائی پائی خود بارہ سرمایہ عقل میرے ہاتھ لگا اور میں نے سرمایہ
ضروریات اولیہ کے ذریعہ تحقیق شروع کی۔
جو لوگ حق کی تلاش کرتے رہے اور رہے ہیں میں نے
ان کو چار جماعتوں میں منقسم دیکھا۔
۱۱۔ متکبران جو اپنے آپ کو اہل دانی و نظر کہتے ہیں۔

۲ - باطنیہ کہ اپنے آپ کو اہل تعلیم کہتے ہیں اور اہم معصوم سے
 وابستہ ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم علم براہ راست اہم معصوم سے حاصل
 کرتے ہیں۔

۳ - فلاسفہ جو اپنے آپ کو اہل منطق و برہان کہتے ہیں۔

۴ - صوفیہ جو مکی کشف و شہود و مقرب بحضرت حق ہیں۔

میں نے کہا کہ اگر حق کی تلاش ہے تو انہی چار فرقوں میں ملے
 گا۔ کیونکہ دوسرے فرقے تو محض اہل تقلید میں انہیں تحقیق سے
 کچھ سروکار نہیں۔ اور میرا شیعہ و تقلید خرد سے پور پور ہو چکا
 اس لیے مذاہب تقلیدی سے مجھے کوئی واسطہ نہ رہا۔ میں نے سمجھا یا
 کہ اگر حق ان چار فرقوں میں بھی نہ ملا۔ تو پھر خلا حافظ، اس لیے ان
 فرقوں کے ماستوں پر تمام تر کوشش ذہنی سے چلتا شروع کیا۔ تو
 طریق مشکلاں اختیار کیا اس مرحلہ سے بگتہ کہ فلاسفہ کے طریقہ میں
 داخل ہوا۔ یہ بھی طے کر کے وارد تعلیمات باطنیہ ہوا۔ اس سے بھی
 گندہ طریق صوفیہ اختیار کیا۔ غرض میں نے چاروں مسلک کی کاغذ
 پیمائش کی۔

نام ان چاروں مذاہب کے مسلک اور مطالب کو شرح و بطل کے
 ساتھ بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ "فن کلام" پر جو کچھ متقدمین نے
 لکھا بعد کہا میں اس سے پہلا واقف ہو گیا اور اس علم میں میں نے
 بھی کچھ تصنیف کیا۔ آخر مجھ پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ یہ علم سماعت
 عقاید دینی کے لیے وضع کیا گیا ہے۔ اگر اس سے یہ مقصد حاصل
 بھی ہو تو میرے مقصد کے لیے کافی نہیں کیونکہ اس فن میں طریق استدلال

یہ ہے کہ مخالف کے نقائص فارغ کیے جائیں۔ میں چونکہ ضروریات
عقلی کے سلسلہ کو تحقیق بھی کارآمد نہیں سمجھتا تھا اس لیے یہ علم میرے
مدد کی دعا نہ تھی۔

فلسفہ کے بارہ میں میں نے خیال کیا کہ میری تمام مشکلات کا حل شاید
اسی سے ہو۔ علم کلام سے فارغ ہو کر میں نے ادھر توجہ کی۔ بغداد میں
تین سو طالبان علم کو درس دے رہا تھا اور تصنیف کا سلسلہ بھی جاری
تھا فراغت کے وقت بغیر مدد استاد و معلم میں نے فلسفہ کی تحصیل پر صرت
کر دیا۔ دو سال کا عرصہ نہ گزرا تھا میں نے اس علم کے تمام رموز اور اسرار
معلوم کر لیے۔ ایک سال اور فلسفیوں کے افکار پر غور کرتا رہا۔ آخر معلم
ہوا کہ یہ بھی میرے مدد کی دعا نہیں۔ اس علم کے اکثر مسائل تخیلاتِ عاہلی
ہیں مگر فلسفی دھری اور طبیعی عاہلی ہیں۔ اہم صاحب ان کے عقاید و خیرو
پر مفصل بحث کے بعد لکھتے ہیں کہ فلسفہ کی چند اقسام ہیں منطق اور ریاضیات
اور طبیعیات اور الہیات و سیایات، ریاضیات اور منطق دونوں برطان
ہیں اور ان کو کوئی ربط حقائق دینی سے نہیں۔ طبیعیات جہاں تک کہ
ان کا تعلق مسائل دینی سے نہیں احکام نظری کے جز ہیں اور سیایات
کچھ تو امور دنیوی اور کچھ امور اخلاقی سے ربط رکھتی ہیں۔ لہذا ان میں
صوفیہ کے کلمات کی آمیزش بھی ہے

فلاسفہ کی اکثر غلط کاری اور اشتباہات الہیات میں ہے اور
عناز فلسفی یونانی افلاطون و ارسطو اور اسلامی فلسفی قابلی اور ابی سینا مطالب
الہی کے بارہ میں اشتباہ میں ہیں۔ ان کے اشتباہ بالخصوص ہیں مسائل
میں ہے جس کو نے اپنی کتاب کا فائدہ الفلاسفہ میں شرح و بسط

سے بیان کیا ہے۔ اور یہ بھی لکھا کہ خلافت کا کفر تین مسائل میں ہے۔ ایک افکار مساویہ جہانی دوسرے یہ کہ خلائعائے کو کلیات کا علم ہے عزایات کا نہیں۔ اور تیسرے قدم وازلیت عالم۔ مسئلہ نفسی منافات میں معتزلہ کے نزدیک تو ہیں۔ اور اسی طرح دوسرے مسائل میں بھی ہیں۔ لیکن محض اس عقیدہ پر معتزلہ کی تکفیر جائز نہیں۔ اور یہ کہ ہر ایک فرقہ دوسرے فرقہ کی تکفیر کرتا ہے محض تعصب باطل ہے۔ اس موضوع پر میں نے اپنی کتاب فیصل المتفرقہ بین الاسلام والزندقہ میں مفصل بحث کی ہے۔

مذہب تطہیر کی طرف توجہ میں نے فلسفہ سے فارغ ہو کر کی۔ فلسفہ کے بارہ میں مجھے یقین ہو گیا کہ عقل نفسی معالی ہستی کی گھٹی کو بلجا نہیں سکتی۔ جب میں باطنیہ کی طرف متوجہ ہوا تو نالیفہ تطہیر کا اشارہ حسن بن صباح کی طرف ہے، ظہور ہوا۔ اور باطنیہ کی باتیں لوگوں میں عادت ہونے لگیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ حقائق اور ہوا سلسلہ اہم معصوم سے معلوم کرتے ہیں اور عبادت الہی اہم قائم ہوتی کی جانب سے انہیں پہنچتے ہیں۔ اب مجھے جہت اس کی ہوئی کہ دیکھوں یہ کیا کہتے ہیں اور فرقہ کے جہاں خانہ کی تلاش میں نکلا۔

انفاقا انہی دنوں میں حضرت خلافت نے مجھے اس خدمت پر مہد کیا کہ دوبارہ حقیقت مذہب باطنیہ کتاب لکھوں، ایک تو میری اپنی خواہش تھی ابی تھی اب خلافت امر نے مجھے ان کی تحقیق پر بالکل متوجہ کر دیا۔ ان کی کتابیں ہر ایک گوشہ سے فراہم کیں اس کے علاوہ میرا ایک دوست بھی تھا جس کی آمد خدمت میرے ہاں تھی، میل دوست

ایک عرصہ سے فرقہ باطنیہ سے وابستہ تھا اور ان کے مدوح عقاید سے خوب واقف تھا۔ میں اس سے پوچھتا اور وہ بھی اس فرقہ کے عقاید و حکمت جہید سے شرح و بسط کے ساتھ بیان کرتا۔ یہ بھی کہتا کہ اس وقت تک ہوکتا ہیں اس مذہب کے مد میں لکھی گئی ہیں ان کا مضحکہ ہمارے ہم عقیدہ احباب اٹاتے ہیں کہ ہمارے مدوح عقاید اور دلائل سے تو واقف نہیں کچھ اپنے خود ساختہ عقاید اور دلائل پیش کرتے ہیں اور منسوب ہم سے کرتے ہیں۔ میں نے فرمایا کہ میں بھی کچھ ایسی بات لکھوں کہ اسی طرح میل بھی مضحکہ اٹتائیں اور کہیں کہ نا بھی کے باعث یہ کچھ لکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میری رقم ترکوشش یہی رہی کہ ان کی مدوح عقاید اور دلائل سے پوری آگاہی ہو نتیجہ یہ ہوا کہ میں نے کتاب لکھی اور اس گروہ کے مخالفوں کا ہدف طعن بن گیا۔ ان لوگوں نے کہا کہ تو نے کتاب اس منہج سے لکھی ہے کہ اس کا نفع تو تمام تر فرقہ باطنیہ ہی کو پہنچتا ہے۔ یہ وہی بات ہوئی کہ حادث مجاہدی نے معتزلہ کے مد میں کتاب لکھی اور احمد بن حنبل نے اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ اگر کوئی تیرا جواب نہ دیکھے تو حتمی طعن پر شبہ اعتزال میں باقی رہے گا۔

امام صاحب باطنیہ کے بارہ میں "القطاس المستقیم" میں لکھتے ہیں کہ میرا مقصد مردوست میاں ابطال و فساد طریقہ باطنیہ نہیں کیونکہ میں نے یہ مطالب دوسری چند کتابوں میں لکھے ہیں ان میں سے ایک کتاب "مستظہری" اور دوسری "منجۃ الحق" ہے جو ان

سوالوں کا جواب ہے جو مجھ سے بغداد میں کیے گئے تھے میری کتاب مفصل الخلافہ ہے اور یہ ان مسائل کا جواب ہے جو ہمدان میں مجھ سے کئے گئے۔ پونجی کتاب "الدراج" ہے جو تعلیم کی بعض بے بنیاد اور سست باتوں کے بارہ میں ہیں جو طوس میں مجھ پر واضح ہوئیں۔ پانچویں کتاب "القطا من المنتقم" ہے کہ یہ جدا گز تالیف ہے۔

باطنیہ مسلم کی رٹ لگاتے ہیں اور اگر ان سے پوچھو کہ معلم سے کیا سیکھا ہے تو بے تعلیم بھانکیں گے۔ اور جب جواب بد سے عاجز آتے ہیں تو سوالہ ام غائب دیتے ہیں اور اظہار فضیلت کے مقام میں فیثا غورث کے افکار کی اڑھلیتے ہیں جو رسائی اخوان الصفا میں نقل کئے گئے ہیں۔

میں مذہب باطنیہ اور طریقہ باطنیہ سے خوب واقف اور ان کے مسلک کے رموز و دقایق سے اچھی طرح آگاہ تھا۔ وہ بات جس سے قلب کو اطمینان و آرام و خورسندی ہو اس میں نہ پاسے۔ طریقہ صوفیہ۔ جب ان نینوں مرحلوں سے گذر چکا تو طریقہ صوفیہ کی حقیقت معلوم کرنے پر متوجہ ہوا۔ مجھے معلوم ہوا کہ اس کا اثبات ممکن نہیں جب تک وہ باتیں پہلے حاصل نہ ہوں۔ ایک علم اور عمل، علم تصوف کی تحصیل تو مجھ پر آسان تر تھی۔ لیکن عمل خدا شیطانی کھرتھی۔ مگر میں نے پہلے علم تصوف کے مولفانہ مشائخ ابوطالب کی "قوت القلوب" اور تالیفات عارف مجاہدی اور ماؤزات شیلی وغیبہ پاریزید سے حاصل کیا۔ مجھے معلوم ہوا کہ تصوف ازراہ

نظر علم تمام علوم شرعی سے تفاوت نہیں رکھتا۔ اگر کچھ ہے تو وہ عمل میں ہے۔ محض شراب کے نام سے نشہ کی لذت محسوس نہیں ہو سکتی۔ ذوقِ این سے نہ شنائی، محض علم سے تو کام نہیں چلتا جب تک عمل نہ لایا جائے اور یہ تو مجھ پر بھی اچھی طرح واضح ہو گیا کہ اس وقت تک جو کچھ میں نے پڑھا لکھا محض قیل و قال ہی تھا۔ تصوف حال ہے، لہٰذا حال ہی سے سچیت کا انکشاف ہوتا ہے۔ تمام عقاید دینی میں سے میرا ایمان ان تین بنیادی باتوں پر تھا خدا اور پیغمبر اور روزِ جزا لیکن ان کے عوامل جو میری ذہن میں نقش تھے بیشمار تھے۔ ان کی کیفیت خواہ کچھ تھی۔ میرا ایمان ان تین باتوں پر پختہ تھا۔

جب مجھے یہ معلوم ہو گیا کہ سچیت تصوف بغیر حال و تقویٰ و قطعِ علاقہ شہوانی منکشف نہیں ہو سکتی تو رفتہ رفتہ دینی امور میری نظر میں سرور پڑنے لگے کہ یہ سب تعلیمات شیطانی ہیں۔ ان علاقہ میں شریف ترین علاقہ دینی مدرسے و تعلیم ہے۔ مجھے معلوم ہوا کہ یہ بھی بے جا ہے۔ اس نوع کی مدرسے و تعلیم و افادہ و استفادہ جو ہر ایک شخص کا معمول ہے اس جہاں کے امور میں سے یہ بھی فریب ہی ہے۔ لہٰذا اگر بیچ پوچھو تو مدرسے میں بھی خلوص نیت نہ تھا۔ بلکہ طلبِ جاہ، مال و وسعتِ شہرت کا فرمائشی۔ اب مجھے افسوس اس بات کا تھا کہ تعلیمی علم و فن میں عمر عزیز نہت کی آخر میں نے عزمِ مابوم کیا کہ ہم بند تعلقات کوڑ پھوڑ کر یک سوا حاصل کروں اور بعد سے ماہر نکلی جاؤں، لیکن میں علاقہ و دینی ریاست و جاہ و شہرت و منصب مدرسے و تعلیم میں جکڑا ہوا تھا۔ ایک طرف تو ایمان کو اس

رحلت بجا رہا تھا اور دوسری طرف تختہ بند ہوا دہوس تھا۔
 پچھ ماہ اسی کشکس میں گذر گئے۔ آخر ماہ رجب ۱۱۸۵ھ میں
 میری زبان خود بخود بند ہو گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرے ذہن پر
 قفل لگا دیا گیا۔ بہت چاہا کہ اصحاب کی نو مہنوی کے لیے ہی یہی سلسلہ
 نملیس جاری رکھوں میرے ہوا۔ رفتہ رفتہ غذا بھی کم سے کم تر ہوتی گئی
 دوست تو میری بیماری کے علاج کی فکر میں تھے مگر میرے حوالے
 درماں چینی کا کسی کو علم نہ تھا۔

آخر جذبہ غیبی نے دستگیری کی اور چراغ ہدایت میرے راہ میں
 رکھا گیا۔ اور اس درطہ ہولناک سے رہائی بخشی، کہ تمام غلامی دینیوی چاہ و مال
 و شہرت و زن و فرزند سب میری نظر میں سرور پڑ گئے، اب میں نے
 ارادہ کر لیا کہ بغداد سے شام کی طرف سفر کرنا چاہئے۔ بظاہر میں نے
 سفر کی عزیمت ظاہر کی، مجھے ڈر تھا نلیفہ اور دوست اجاب مانع
 سفر ہوں گے، ہر ایک شخص اپنے اپنے خطن کے مطابق میری
 نسبت پر ہی گولی کر رہا تھا۔ میں نے جو کچھ میرے پاس تھا سوائے
 کفایت دن و مرد دور کیا۔ اس کفایت کو ان کے لیے چھوٹا بغداد سے
 باہر نکلا اور شام کا راستہ پایا۔ یہاں دو سال عزیمت و خلوت و ریاضت
 کے سوا اور کچھ کام نہ تھا۔ جیسا کہ طریقہ صوفیہ سے معلوم تھا اس
 پر عمل کرتا رہا۔ ایک مدت تک مسجد دمشق میں متکلف رہا منادہ مسجد
 پر چڑھ کر دعائے بند کر لیا اور تمام روز ذکر و فکر میں مشغول رہتا۔
 دمشق سے میں بیت المقدس میں آیا۔ یہاں بھی ریاضت میں مشغول
 رہا روز " میں جا کہ دعوائے بند کر لیا اور اسی طرح ذکر و فکر میں مشغول

رہا۔ اس کے بعد میرے دل میں سفر حج اور زیارت تربت رسول کا
 شوق موجزن ہوا۔ خلیل اللہ کی زیارت کے بعد میں حجاز کے سفر
 پر روانہ ہو گیا۔ سفر حجاز کے بعد ناگوار دن و فرزند کی فکر لاحق ہوئی۔
 اس لیے وطن کی طرف مراجعت کی، اور یہاں بھی خلوت اور عزلت میں
 دن بسر ہوئے۔ کبھی تنگی معیشت اور عداوت دنیا اور بھاری زندگی
 دن و فرزند میرے صفائی خلوت کو ٹھنڈے کرتے لیکن میں اپنے کام
 میں مشغول ہی رہا۔ الغرض میری خلوت و ریاضت کا زمانہ دس سال
 گنا لہذا اس عرصہ میں مجھ پر وہ کچھ منکشف ہوا کہ شمار میں نہیں آسکتا
 اور لفظوں میں ادا نہیں ہو سکتا۔

آخر مجھ پر اچھی طرح منکشف ہو گیا کہ حق اور حقیقت خوب تصوف
 میں ہے۔ چنانچہ تصوف مشکوٰۃ نبوت سے نور حاصل کرتا ہے اور اس
 نور کے بغیر دل منور نہیں ہو سکتا۔ مجھ پر وہ حقائق منکشف ہوئے
 کہ ذوق و حال ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ میں اسی راہ پر گامزن ہوا کہ اس
 کا آثار ظہارت قلب اور انجم منافی اللہ ہے۔ اہم صاحب راہ سیر
 سلوک کے نشان ہیں۔ سناٹے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ سالک اس لیے
 مرحلہ سے بھی گزرتا ہے کہ حلال و اتقاد کا خیال اس کے دل میں
 پیدا ہوتا ہے لیکن یہ اندیشہ محض خطا ہے۔ اس کے بعد تصوف
 اور اسرار نبوت اور طریق سیر و سلوک کو شرح و بسط سے بیان
 کرتے ہیں۔ ان کا نکتہ آپ کی کتاب "المقصد الاقصیٰ" اور بالخصوص
 اعیان العلوم میں مفصل ہے۔

آخر اہم صاحب پر جب یہ منکشف ہوا کہ ایک فرقہ تو علوم ظاہر

بعد میں فلسفہ کلام اور تیسرا علوم باطنی و تعلیمی میں گمراہ ہے تو دل میں
 ولولہ اٹھا کہ ان کو حد طر ہلاکت سے باہر نکالنا چاہیے۔ لیکن اس کے لیے
 بھی اسباب مناسب کی ضرورت تھی۔ آخر ذہبی ہوا جو منظور خدا تھا اور اسی
 طرف شیخ سعیدی نے اشارہ کیا ہے کہ

بادشاہ وقت نے کہا اللہ حد ستوں نے بھی ترغیب دی اللہ آپ نے
 پھر سے حدس و تدلیس کا سلسلہ شروع کر دیا۔ لیکن کتنا فرق موجودہ
 اور گذشتہ حالات حدس میں تھا۔ پہلے مجھے ہو سکتا شہرت اور محبت
 جاہ و مال اور محض ہوا و ہوس تھی اب میں یہ بائیں ترک کر چکا تھا۔ لیکن
 مجھے معلوم نہیں کہ میں منزل مقصود پر پہنچوں گا یا اجل پیش از وقت
 مجھے اُٹے گی۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ پہلے اپنا اللہ اس کے بعد دوسروں
 کی اصلاح کا ذریعہ بنوں، پہلے آپ ہدایت یافتہ ہو کر پھر دوسروں کی رہنمائی
 کروں۔

اہم صاحب کو تو غالباً اپنے ہی معارف کے لوگوں کی اصلاح اور ہدایت
 کا خیال تھا۔ ہزار سال کے قریب عرصہ گذرنا ہے اس عرصہ میں اللہ ہی
 جانتا ہے کہ کتنے طالبان حق تھے جو آپ کے فیض سے مالا مال ہوئے۔
 اگرچہ ہمارا منہ نہیں کہ اہم صاحب آپ کے متقدمین مثلاً ہیر صوفیہ
 کی نسبت ان کے تصوف کے بارہ میں رائے نلی کریں مگر مطلقاً ہماری
 لکھتے ہیں کہ اگرچہ غزالی کے پیران طریقت ابوعلی فارمدی اور ابو بکر نساج
 ہیں اللہ اہم صاحب کے مطالعہ میں کتابیں ہیں مثلاً ابوطالب کی دستوری
 مشکوٰۃ کی کتاب قوت القلوب اور رسالہ مشیرہ امام ابو قاسم کشیری جنوں
 مشکوٰۃ اور مقالات حارث مجاہدی متنی مشکوٰۃ متنی مشکوٰۃ

بن یحییٰ متوفی ۲۳۳ھ و امام شافعی متوفی ۲۴۰ھ و ماثورات جنید متوفی
 ۲۹۸ھ و تعلیمات شبلی و بایزید سظامی لیکن امام صاحب خود محقق و نقاد
 ہیں امام صاحب کے تصوف کا پایہ ان سے بلند تر ہے۔ لیکن مولانا
 جلال الدین دہلی کے تصوف کو امام صاحب کا تصوف بھی نہیں پہنچتا۔
 اہل الذکر مشاہیر کے تصوف میں ارکان اسلام صوم و صلوٰۃ کو خاص امتیاز
 حاصل ہے۔ امام صاحب کے تصوف میں زہد و ریاضت نمایاں ہے عارف
 دومی کے تصوف میں عشق کارفرما ہے، امام صاحب کے تصوف کی
 تعریف ان کے اپنے الفاظ میں اہل حلال عدا افتلا برسول اللہ فی
 اخلاقہ و احالہ فادامرہ و ننتہء بے لہ فہم قرآن و حدیث میں دیگر
 علما فقہاء و مفسران سے بے اندازہ تفاوت رکھتا ہے۔ البتہ امام احمد
 غزالی بڑا امام صاحب شروع سے تصوف سے وابستہ رہے اور ان کے
 محققین کے نزدیک ان کا مرتبہ امام صاحب سے بڑھا ہوا ہے۔ بات
 یہ ہے کہ ہرگز لادنگ تو ایسے دیگر اہل سنت، بعض حضرات پر شریعت
 کا رنگ گہرا تھا اور بعض پر سرور و مسنی کا۔
 و مستدومست ہر دو چوا از قبیلہ اند من دل بعشورہ کہ وہیم اختیار چہیت
 (حافظ)

مولفات غزالی

امام صاحب کی تصانیف کی تعداد تذکرہ نویسوں نے مختلف لکھی
 ہے۔ لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ علوم دین پر آپ کی تصانیف
 ستر سے زیادہ ہیں۔ دیگر علوم فلسفہ وغیرہ پر بھی آپ کے مولفات ہیں۔

یوں اگر سب کتابوں کو شمار کیا جائے تو تعداد دو سو کے قریب ہے ان میں سے
 بعض آپس کی اپنی تصانیف کی تفسیر بھی ہیں اور بعض احیاء وغیرہ کتب کی
 بعض فصل کی شرح بھی ہے لکن علماء بعض کتب الہی میں بہ اہم صاحب سے نسبت ہیں لیکن
 ممکنہ نہیں اکثر متنق ہیں کہ امام صاحب کی تصانیف نہیں مشہور
 "السلامکتوم فی اسرار النجوم" اور "تحسین النور" اور "الشفیخ والتوبہ" اور
 "النور" بہ علی غیر الیہ "اور "سرا العالمین" وکشف مانی الادار ہیں۔

اکثر کتابیں تو شارح ہو چکی ہیں اور بعض کے تراجم اور اور
 فارسی اور لاطینی و عبرانی میں ہو چکے ہیں۔ امام صاحب کی تصانیف
 عموماً عربی میں ہیں۔ فارسی میں کیمیائی سعادت بہت مقبول ہیں۔
 لیکن ابو حفص عمر بن عبدالعزیز بن یوسف طرابلسی امام صاحب کی
 چار کتابوں کے وصف میں لکھتا ہے کہ

هذنب المذهب حبر احسن الله خلاصته

یسیطر وسیط " وتوجیز ومخلاصته

الوجیز امام صاحب کی حرکت الادار تالیف علم فقہ میں ہے۔ اور
 "یسیطر" اور "وسیط" دو اور تالیفات کے مطالب اس میں بیان کئے
 گئے ہیں۔ اور ان ہی کی شرح "الوجیز" ہے۔ اسی کتاب کی
 نسبت بعض کی یہ رائے ہے کہ اگر خزالی و عری نبوت کرتا تو
 "الوجیز" ہی ایک معجزہ کافی تائیدی شہادت تھی۔ احیاء العلوم
 اور وجیز اکثر علماء و فضلاء و آئمہ دین کے حلقہ درس میں رہی ہے۔
 اور اس پر ان حضرات نے شرح اور حواشی اور توضیح اور استفاد
 کی شارح حضرات میں سے یہ ہیں۔ امام فخر الدین رازی اور

پوالشاعر محمود بن ابی بکر اموی اجد ابو حامد محمد بن یونس اربلی اجد ابو الفتح
 علی اجد ابو القاسم حمید الکریم بن قزوی مرقی اور امام نووی نے جنین کی
 تکلیف کی سبب ابو جنیر مصر میں ۳۱۵ھ میں چھپ کر شائع ہوئی۔
 اصل فقہ میں امام صاحب کی کتاب "المستصفیٰ" عند مجلدات
 میں طبع ہوئی ہے۔ امام صاحب نے "محرم سنہ ۳۱۵ھ" میں تالیف
 کی۔ اس کتاب کی شرح اور تفسیر ہی اگر علماء و فضلاء نے کی ہے
 امام صاحب کی کتاب "مقاصد الفلاسفہ" آپ کی دوسری کتاب
 "مقاصد الفلاسفہ" کا مقدمہ ہے، عرض یہ ہے کہ فارین عقاید
 فلاسفہ سے واقف ہوں اس کے بعد اچھی مانتے سے اور
 امام صاحب کی تنقید سے آگاہ ہوں، معیار العلم و منطق میں میزان العلم
 علم النفس آپ کے لئے لکھی۔ فرقہ باطنیہ کے رد میں "مستظہر بانام
 المستظہر باللہ خلیفہ عباسی لغد مواعظ الیاطنیہ" تصنیف کی۔
 امام صاحب کی ولادت ۳۱۵ھ میں وفات ۳۸۵ھ میں واقع
 ہوئی آپ کی زندگی کے بارہ میں یہ شعر مشہور ہے۔

نصیب حجتہ السلام زمین ہمارے بیچ حیات پنجہ و بیچ وفات پانصد بیچ
 طوس کے لیے یہ نعر کہ ہے

برفقہ و شاعر و فقیہ کہ او طوسی بود جمل نظام الملک و غزالی و فردوسی بود

سماو زونلی (مذکرہ الشعر عدالت شاہ) کہتا ہے کہ

خود دوش می گفتند کہ این کہنہ جہاں تاکہ شہار و غنائے شیطان و زسودای صوی خالی

خود گفتا بحیب و اوم کہ میدانی و می پرسی بعبد علم غزالی بعبد علم غزالی

شیخ عطار فرماتے ہیں کہ

صغیر کے لئے علم از حد علی بود علم زلیقین اور شک خلی بود
 اذ قہ ہزار علوم بے سرو پا امرار پیدا کرو غزالی بود
 نیز ارشاد فرماتے ہیں کہ

صغیر کے لئے علم علم علام است در کی جہاں یگانہ ایام است
 کان گھر علم بیان غزالی در پاسے علوم حجۃ السلام است

اہم صاحب کا طرز استلال اور روش تحقیق یہ ہے کہ مجادلہ اور
 بحث و مباحثہ کی اصل غرض دریافت حق ہوتی ہے۔ لیکن اہل
 علم حضرات عموماً جذبہ مخالفت کے تحت مخالف فریق کی ایسی باتوں
 کی تردید بھی کرتے ہیں جو سچی ہوتی ہیں۔ یہ طریقہ مجادلہ انتہائی مذموم
 ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بحث ہمیشہ بے نتیجہ رہتی ہے
 بلکہ زلیقین میں جذبہ نفرت بھی ابھرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امام
 صاحب نے جب قیل و قال مدسہ کو چھوڑا تو یہ عہد بھی کیا کہ میں
 آئندہ کسی سے مباحثہ نہیں کروں گا۔ شام میں ایک عالم نے بناط
 مباحثہ بچائی تو امام صاحب نے یہ کہہ کر پچھا پھڑپھا کیا کہ میں نے یہ کام
 عراق کے لوٹوں کے سپرد کر دیا آپ نے اس کے بعد مدت العمر
 کبھی کسی علم سے باوجود دعوت مجادلہ مباحثہ نہیں کیا۔ البتہ میں
 نے افکار اپنی تصانیف میں شرح و بسط سے واضح کیے۔
 بعض علماء نے امن کی تردید بھی کی، تنقید بھی کی اور بعض نے
 کفر کا فتویٰ بھی صادر کیا۔ یہ دماغ گذر گیا۔ اس کے بعد امام صاحب
 کی تصانیف ہمیشہ علماء فضلہ کے حلقہ درس میں رہیں،
 امام صاحب نے بعض فاضلین اسلامیت معترضہ و باطنیہ کا بالخصوص

بھی اپنی کتابوں میں کیا ہے مگر آپ کسی فرقہ کی تکفیر نہیں کرتے۔ آپ کی تحقیق یہ ہے کہ اختلاف عقاید فروع میں ہے اصل پرست متفق ہیں۔ فروع میں اختلاف صاحب ہے۔ فقہ فی الدین فروع میں عقلاً ہوتا ہے اور رائے عقلی میں اختلاف ہوتا ہے۔

اہم صاحب کا نظریہ یہ ہے کہ جس امر میں فقہ کا اختلاف ہے اسے تسلیم کرنے کے لیے کوئی شخص مکلف شرعاً نہیں، اسی نظریہ کے تحت آپ فلسفہ کا رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ منطوق اللہ ہند نہ رہی پر رب جلاء کا اتفاق ہے اللہ یہ حقائق ثابت شدہ ہیں اس لیے فلسفہ کی اس شاخ کو تسلیم کرنا چاہئے۔ جو لوگ جذبہ مخالف کے تحت ان کا بھی رد کرتے ہیں خود غلطی خوردہ ہیں اللہ اور ان کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔ لیکن فلسفیوں کے تخیلات اللہ انکار ایسے ہیں کہ ان پر ان کا بھی اتفاق نہیں ان میں چون و چرا کی گنجائش ہے۔ ان میں سے بعض ایسے ہیں کہ اسلام کے لیے نہ مضر ہیں اللہ نہ مفید ان کو بھی نظر اماند کرنا چاہئے۔ البتہ بعض ایسے مقصدات ہیں جو ان تخیلات کی بنا پر فلسفی پختہ کیے ہوئے ہیں اللہ اسلام کے مخالف ہیں ان کا رد کرنا چاہئے۔ میں تردید کرتے وقت محض اپنے عقیدہ کو خواہ وہ صحیح ہی کیوں نہ ہو بطور دلیل پیش کرنا چاہئے۔ فلسفہ کا رد برہان عقیدہ ہی سے مناسب ہے۔ اہم صاحب نے یہی مدعا اختیار کیا ہے۔

اہم صاحب اسی نظریہ کے تحت کہتے ہیں کہ انبیاء و رسل بھی حکماء ہیں اللہ تو جدید ہر ایک زمانہ میں ان کا اتفاق رہا ہے اگر فلسفی

بھی کسی بات پر تحقیقاً متفق ہوتے۔ تو میں اُسے حق سمجھ کر تسلیم
 کرتا۔ لیکن ان کا باہمی اختلاف شاید ہے۔ کہ حقیقت کا امتزاج
 ان پر نہیں ہوا۔ وہ بعض قیاسات سے کام لے رہے ہیں۔
 امام صاحب نے بڑی فراخدلی سے کام لیا ہے۔ جہاں
 زمانہ کا ایک عقول بگھتا ہے۔ کہ کبھی کبھی زمانہ میں حکماء کا
 کسی ایک امر پر اتفاق نہیں ہوا۔ اور اگر یہ ممکن بھی ہوتا تو
 صاحب ہے۔ کہ خلف سلف سے اختلاف کرے۔ ذہنی ارتقاء
 کا باز اسی میں مضمر ہے۔ تمام علوم و حکمت اور فنون پر تغیرات
 مانع ہو رہے ہیں۔ اور کوئی شخص یہ دعوے نہیں کر سکتا۔ کہ
 اُسے ایک ذہ کا علم کا حقیقہ کامل حاصل ہے۔ ذہ ذہ میں امکانات
 بے شمار ہیں اور ہر ایسے امکان کے بے شمار پہلو ہیں حکماء ہر ایک
 شے کو جیسی کہ وہ ہے مشابہہ مزدہ کرتے ہیں مگر اپنے ذہنی
 نگاہ سے اور ایسے ذہنی غیر محدود ہیں جسے ہم سائنس یا
 حکمت سے موسوم کرتے ہیں۔ اس کا علم کم و بیش انسانی،
 مادی اور ذہنی ارتقاء میں مدد دے رہا ہے۔ اور اس علم
 کی تردید کوئی حکیم نہیں کرتا۔ امکانات اشیاء حکماء پر منکشف
 ہوتے ہیں۔ ان کی اپنی ایجاد نہیں۔ مثلاً مسد کشش ثقل۔ نیوٹن
 پر منکشف ہوا۔

نیوٹن ابھی پیدا ہی نہ ہوا تھا کہ یہ قانون فطرت آفرینش
 سے سرگرم عمل تھے۔ نیوٹن مر گیا اور یہ قانون دلیا ہی کا برزنا
 ہے۔ نیوٹن کی شخصیت سے اور کسی شخص کے ایمان و کفر سے ماہل

بے نیاد ہے۔ کوئی ماننے یا نہ ماننے۔ تائون فطرت کا کچھ نہ بگاڑ
 سکتا ہے۔ اور نہ سزاوار سکتا ہے۔ البتہ مگر اس کے علم و حاصل
 کے فائدہ سے محروم ہے۔ اور جو تسلیم کرتا ہے اس کا اتباع
 کرتا ہے فائدہ میں رہتا ہے۔ اسی طرح وہ انکشافات میں جو
 انسانی مذہب میں وحیاً انبیاءِ رسل پر واضح ہوئے ان میں کوئی
 اختلاف نہیں البتہ اس میں انسانی ذہنی ارتقاء کے مناسب ارتقاء
 قائم ہے۔

عرض "حقائق" میں کوئی اختلاف نہیں لیکن کوئی شخص یہ
 دعوے نہیں کر سکتا کہ اسے ان کا علم کا حقد حاصل ہے۔ امام
 صاحب نے اسی تحقیق کی بناء پر عصمت انبیاء کا انکار کر دیا۔
 احیاء السلام ابن دحلہ چارم باب اول دوبارہ توبہ بن لکھتے ہیں کہ
 کوئی شخص اعضاء کے گناہ سے خالی نہیں کیونکہ
 اعضاء کے گناہ سے تو انبیاء تک نہ بچ سکے قرآن
 و حدیث میں انبیاء کی خلائق اور ان کی توبہ اور
 خطاؤں پر گریہ و زاری مذکور ہے۔ اور اگر بعض اذکار
 گناہ سے محفوظ بھی رہے تو دل سے قصد گناہ سے
 بچے گا۔ اور اگر دل میں بھی قصد نہ ہوگا تو دوسرے شیطان
 سے نہ بچے گا۔ کہ وہ خیالات پریشان دل میں پیدا
 کرتا ہے۔ اور اس سے یاد الہی سے غفلت پیدا
 ہوتی ہے اور اگر احساس سے بھی خالی رہے تو
 اس بات سے نہیں بچ سکتا۔ کہ اللہ تعالیٰ کی صفات

لہذا افعال کی واقعیت میں خلقت اور تصور جو اور یہ سب باتیں
 نقصان کی ہیں، لہذا ہر نقصان کا کوئی سبب ہے لہذا اس
 نقصان کو چھوڑنا لہذا اس کی ضد نفع کو اختیار کرنا تو یہ کی غرض
 ہے۔ اور کسی انسان کے متعلق یہ تصور نہیں ہو سکتا
 کہ وہ اس نقصان سے خالی ہے۔ البتہ مقلد نقصان کے
 بات میں لوگ مختلف الہائے ہیں، اصل نقصان کچھ نہ کچھ ہر
 ایک میں موجود ہے، اس سے زیادہ لہذا کیا ہوگا کہ آنحضرتؐ
 فرماتے ہیں کہ

بے شک میرے دل پر زنگ کا پردہ آجاتا ہے یہاں تک
 کہ میں دن رات میں شراب استغفار پڑھتا ہوں، اماں مسلم
 لہذا اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو بڑی عطا فرمایا
 اور ارشاد فرمایا کہ

واللہ نے میری اگلی پچھلی خطا میں معاف فرمائی، جب ایسے علی
 شان نبی کا یہ حال ہو تو دوسروں کا کیا ہوگا۔
 ہمیں ملکہ عصمت اپنا اسکے دقائق میں الجھنے کی ضرورت نہیں،
 بات بالکل صاف اور سیدھی سادہ ہی ہے کہ واجب ہے کہ انسان غلطی کرے
 لہذا گاہ کرے مگر انادہ ذکر ہے، یہاں غلطی خاصہ بشری ہے لہذا اسی میں
 اس کے ارتقا کا مادہ مضمر ہے، ہر رٹ سپر، نے بالکل صحیح لکھا ہے
 کہ واجب ہے کہ خلف سلف سے اختلاف کرے۔ اور سلف کے نقائص
 رفع کرے۔ جن قوموں پر ذہنی جمود چھایا ہوا ہوتا ہے۔ وہ رجعت پسند
 بنتی ہے۔ اور اپنے زمانہ کی ترقی یافتہ اقوام سے بہت پیچھے رہ جاتی

ہیں اور آخر مٹ جاتی ہیں۔ ذہنی ارتقا اسی انسانی غلطی میں مضمر ہے
انسان غلطی بھی کرتا ہے اور ترقی بھی کرتا ہے، لطیفہ حیوانات میں کوئی
بانڈار غلطی نہیں کرتا اور نہ ترقی کرتا ہے، اگر انسان غلطی نہ کرے تو
حیوان مطلق ہوگا۔ لہذا اگر ارادۂ کرتا ہے تو یہاں سے بھی بدتر ہے، اگر
انسان معصوم ہو تو یا تو خلا ہوگا جیسا کہ بعض مذاہب کا عقیدہ ہے
یا حیوان مطلق ہوگا۔ اس لیے جو حضرات خوش عقیدت کی وجہ سے
انبیاء اور ائمہ دین کو معصوم عن الخطا کہتے ہیں وہ نادان دست ان کو
یا تو انسانیت کے درجہ سے گراتے ہیں یا خدا بنا کر پوجتے ہیں۔

جو اہل مذہب انبیاء و رسل اور اپنے لوٹاروں اور ریشیوں اور فیوں
کو معصوم بے عیب، نہ کلتک، یعنی کرتے ہیں وہ اس غلطی میں
الجھے ہوئے ہیں کہ اگر یہ حضرات خطا کار تھے تو جو کچھ وہ بذریعہ «وہی»
کہنے پایہ اعتبار سے ساقط ہو جائے گا یہ ایک مغالطہ ہے۔

تمام کائنات ماسویٰ انسان «وہی» کے تحت عمل کرتی ہے اور
غلطی نہیں کرتی۔ ایک ننھی سی جان شہد کی مکھی حیرت انگیز چھتہ بتاتی ہے
کہ آج تک اہل علم و حکمت باہم نفس امارا بنانے سے قاصر رہے
ہیں۔ وہ پھولوں اور پھلوں سے شہد حاصل کرتے ہیں اس کے مختلف
رنگ ہوتے ہیں اور لوگوں کے لیے داروئے شفا بھی ہے۔ انسان
یکمیاں طرہ سے شہد مصنوعی بنا سکتا ہے۔ لیکن آفرینش سے شہد
کی مکھی ایک ہی حالت میں ہے۔ «وہی» میں نہ غلطی ہے اور نہ اس
کے جسم اور شعور میں غلطی کا احتمال ہے۔ وہی کی صداقت پر مکھی جاسکتی ہے
کیونکہ وہ خالص نہیں۔ جو کچھ انبیاء و رسل بذریعہ وہی کہیں گے وہ من دین

حق ہوگا اور پورا ہو کر رہے گا۔ اس کے خلاف القاع شیطان جو وعدہ
ازکار تو قعات اور تمناؤں میں ہوتا ہے اس کا بھوٹ بھی پرکھا جاتا ہے
کہ باطل ہے اور باطل ہو کر رہتا ہے۔

یہ حقیقت اچھی طرح ذہن نشین کرنی چاہئے کہ "وہی" معصوم ہے
نہ کہ مہبط وہی بشر، بشری شخصیت کا تقاضہ کچھ اور ہے اور وہی "کی نوعیت
اور شے ہے۔ مناقط کی وجہ یہ ہے کہ ہم ان دونوں کو بلا امتیاز مخلوط
کر دیتے ہیں۔ اور اگر کچھ تمیز بھی کرتے ہیں تو بشر کو "منظہر الہ ہیت"
قرار دیتے ہوئے معصوم یقین کرتے ہیں۔ "شکل انسان میں خلا
تقاضیہ معلوم نہ تھا۔ اس کا نتیجہ خارج ہے کہ ہم اپنے جیسے بندوں
کو حق حکومت دیتے ہیں جو صرف اللہ تعالیٰ خالق کائنات رب العالمین
کے لیے خاص ہے۔ اور ان کو "فوق البشر" سمجھتے ہیں آسمانی حق حکومت
جو ایام جاہلیت میں بادشاہ دینی اور

دینی اخذ کرتے اور اپنے آپ کو سراج اور چند مینی اور دیوتاؤں کی لڑائی
کہتے ہیں شرک عظیم تھا جس کے خلاف حضرت ابراہیمؑ نے اعلان جہاد کیا۔
لیکن عقیدہ عصمت انبیاء بالکل بے بنیاد نہیں اگرچہ مناقط سے
خالی نہیں۔ حکومت ایک امانت ہے اور مقدس امانت ہے۔
جو اللہ تعالیٰ نے آدم اور بنی آدم کو عطا فرمائی ہے۔ "سخرکم ما
فی السموات وما فی الارض جمیعاً من ان فی ذلک لآیات لقوم یتفکرون"

انسان کہ فلک ہاست سرفگندہ او ودحیرت ادکم است
وہ خاصیت کہ در خارج و ذہن ہر چیز کہ آف ہے۔ وہ رحمت ہے
حکومت کا اہل باوجود ظلم و جہل انسان ہی سے بہت پیچھے، انسان

ان میں۔ خلافت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس عطیہ ایزدی کے ہوتے
 ہ کائنات میں تصرف کرتا ہے۔ اگر یہ تصرف سنت اللہ یعنی قوانین
 طرت کے مطابق ہے تو نتیجہ بھی خاطر خواہ برآمد ہوتا ہے اور انسان
 میں اور مادی ترقی زیادہ سے زیادہ کرتا رہتا ہے اور اگر ظلم و جہل
 کے ساتھ تصرف کرتا ہے۔ تو عذاب کے منہ آتا ہے، انسان
 انفرادی اور اجتماعی دونوں میں یہ سب کچھ مشاہدہ کر چکا ہے۔ اور کہتا
 ہے۔ ظلم کی تعریف ہے۔ وضع شی علی غیر محلہ یعنی جو فشار فطرت
 ہے اس کے خلاف اشیاء بے محل استعمال کرتا ہے۔ ظلم دیدہ و دانستہ
 اور تکاب غلطی یا گناہ ہے۔ گناہ ہر عمل ہے جو فشار فطرت کے خلاف
 ہو۔ جہل کوئی غلطی یا گناہ ناواقفیت کے سبب ہے۔ جسے سہواً
 کہتے ہیں۔ یہ عذاب جو ظلم و جہل کی وجہ سے مازل ہوتا ہے فطرت
 کی طرف سے انتباہ ہے اور غرض یہ ہے کہ انسان سیدھے راستہ
 سے بھٹک گیا ہے تو پرہیزگاری یا بازگشت سے صراط مستقیم اختیار
 کرے۔ جب افراد یا قومیں اس فطری انتباہ کی پروا نہیں کرتی تو
 ویر سویر مٹ جاتی ہیں۔ تاریخی واقعات قوموں کی ہلاکت پر کافی شہادت
 ہیں۔ آثار قدیمہ زبان حال سے ان کی تباہی کی عبرت انگیز داستان سنا
 سکتے ہیں۔

کہاں ہے دانا کہاں سکندر کہاں ہے کسریٰ کہاں قیصر
 خط شکستہ میں ان کے در پر زمانہ عبرت نگار دیکھا

مشامیر اسلام

آنرا

عباد اللہ اختر

ادارہ ثقافت اسلامیہ، گلبرگ روڈ، لاہور